کتاب و سنّت کی روشنی میں
www.KitaboSunnat.com
آپ کے
مسائل
اور اُن کا حل
ابو الحسن مُبشّر احمد ربّانی
مکتبہ قدوسیہ

کتاب وسنّت کی روشنی میں

ابوالحسن مبشّر احمد ربّانی

مکتبہ قدّوسیہ اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کِتَابُ الْعَقَائِدِ وَالتَّارِیْخِ

كِتَابُ الطَّهَارَةِ

كِتَابُ الْأَذَانِ

کِتَابُ الصَّلٰوۃِ

كِتَابُ الْمَسَاجِدِ

كِتَابُ الْجَنَائِزِ

كِتَابُ الزَّكٰوةِ

كِتَابُ الصَّوْمِ

كِتَابُ الْحَجِّ

كِتَابُ الْجِهَادِ

كِتَابُ النِّكَاحِ

كِتَابُ الطَّلَاقِ

كِتَابُ الْبُيُوعِ

كِتَابُ الْمِيْرَاثِ

كِتَابُ الطِّبِّ

كِتَابُ الصَّيْدِ وَالذَّبَائِحِ

كِتَابُ الْأُضْحِيَةِ

كِتَابُ الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ

كِتَابُ الْأَطْعِمَةِ

كِتَابُ الْأَدَبِ

كِتَابُ الْحُدُوْدِ

كِتَابُ الْأَيْمَانِ وَالنُّذُوْرِ

كِتَابُ الْحَظْرِ وَالْإِبَاحَةِ

کِتَابُ الْجَامِع

اظہارِ تشکر

اللہ وحدہ لا شریک کا احسانِ عظیم اور امتنانِ جزیل ہے کہ اس نے اپنا خصوصی لطف وکرم کیا کہ "مرکز الدعوۃ والارشاد" کے عالمی سالانہ اجتماع ۱۹۹۷ء کے موقع پر "مجلۃ الدعوۃ" میں چھپنے والے دینی سوالات کو یکجا کر کے کتابی صورت میں طبع کرنے کی توفیق عنایت فرمائی۔

یہ کالم ۱۹۹۲ء سے لے کر تا حنوز جاری و ساری ہے۔ جس میں ملک کے طول و عرض سے بھیجے جانے والے سوالات کے جوابات قرآن و سنت کی رُو سے دیئے جاتے ہیں۔ اس بارِ عظیم کو میرے برادرِ حقیقی ابوالحسن مُبشر احمد ربّانی حفظہ اللہ نے اٹھایا ہوا ہے۔ پہلی طبع بھائی ظہیرالدین بابر کی انتھک کوشش و کاوش کا نتیجہ تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے' انھوں نے اس کتاب کو تین دفعہ طبع کروایا۔

بحمد اللہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے اتنی پذیرائی بخشی کہ عوام الناس تو کجا اہلِ علم نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے سابقہ ایڈیشن تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ امسال سالانہ اجتماع ۱۹۹۸ء کے موقع پر اس کتاب کو دوبارہ زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ایڈیشن کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں۔

1. اِس کتاب کی نظر ثانی محقق العصر' عِلمِ رجال کے ماہر فضیلۃ الشیخ' حافظ ابو طاہر زبیر علی زئی حفظہ اللہ نے کی۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کتاب میں کوئی روایت ایسی نہیں جو بالاتفاق ضعیف ہو۔ پوری کتاب میں آٹھ روایات ایسی ہیں جن سے انھیں تحقیقی اختلاف ہے اور ان روایات کا اگر ضعیف ہونا تسلیم کر بھی لیا جائے تو نفس مسئلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں کیونکہ اس کی مؤید صحیح احادیث موجود ہیں۔ بہرکیف ان کا تبصرہ مختصر طور پر روایات کے ذیل

میں درج کر کے آگے ابوطاہر لکھ دیا گیا ہے۔

۲ اس دفعہ اس کتاب کی کمپوزنگ عربی' اُردو کے جدید (SOFT WARE) میں کی گئی ہے جو کہ پہلے ایڈیشن سے کئی لحاظ سے بہتر ہے۔

۳ ہر سوال کے جواب کے آخر میں مجلّہ الدعوۃ کا شمارہ اور سال ذکر کر دیا ہے تاکہ قارئین اگر مجلّہ الدعوۃ کی طرف رجوع کرنا چاہیں تو کوئی دقت پیش نہ آئے۔

۴ جن سوالات کے جوابات حافظ عبدالسلام بن محمد بھٹوی صاحب نے دیئے ان کے آخر میں (ع ۔ م) اور عبدالرحمٰن عابد صاحب کے جوابات کے آخر میں (ع ۔ ع) لکھ کر وضاحت کر دی ہے۔ علاوہ ازیں دیگر علماء کی طرف سے جو چند جوابات دیئے گئے ان کی بھی ساتھ تصریح کر دی گئی ہے۔

۵ چند مقامات پر کچھ مفید اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی بشری تقاضوں کے مطابق خامیاں رہ جاتی ہیں۔ جو بھائی کسی قسم کی خامی پر مطلع ہو وہ ضرور راہنمائی کرے تاکہ آئندہ اس کا بھی ازالہ کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اس عظیم کام کو ہمارے لیے' ہمارے والدین اور دیگر تمام مسلمانوں کے لیے راہِ نجات بنا دے اور ہماری لغزشوں سے درگزر کر کے حسنات کو قبول کرے۔ آمین

آپ کی دعاؤں کا متمنی
عابد بشیر ۱۸/ اکتوبر ۱۹۹۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

محقق العصر، فضیلۃ الشیخ، حافظ ابو طاہر زبیر علی زئی حفظہ اللہ

اسلام قرآن و حدیث کا نام ہے۔ یہ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں اور بلا انقطاع قیامت تک لازم و ملزوم رہیں گے اور اسی پر اُمت کا اجماع ہے۔ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ اجماعِ اُمت شرعی حجت اور دلیل ہے اور یہ قطعاً غیر ممکن اور محال ہے کہ اُمت کبھی گمراہی پر جمع ہو جائے۔

ہر دور میں علماءِ اسلام قرآن و حدیث اور اجماع سے تمام پیش آمدہ مسائل کو حل کرتے رہے ہیں۔ قرآن و حدیث کا صرف وہی مفہوم معتبر اور قابل حجت ہے جو ائمہ اسلام سے ثابت ہے۔ اُن کی تشریح و تفہیم کے مقابلے میں ہر شخص کی بات مردود ہے چاہے وہ کتنا ہی فقیہ اعظم، مزاج شناسِ رسول اور شیخ القرآن وغیرہ ہونے کا دعویدار ہو۔

نصوص صریحہ کی عدم موجودگی میں نصوص عامہ و آثارِ صحابہ وغیرھا پر اجتہاد کا دروازہ اُن علماء کے لیے کھلا ہے جو ہمہ تن اپنے رب کو راضی کرنے کی تحقیق و جستجو میں مصروف ہیں۔

مولانا مبشر احمد ربانی، جماعت اہلحدیث کے مایہ ناز عالم، محقق، مناظر اور مجاہد ہیں۔ یہ کتاب "آپ کے مسائل اور ان کا حل، قرآن و سنت کی روشنی میں" اُن کی پانچ سالہ تحقیقات کا خزانہ ہے جسے مؤقر جریدہ "مجلۃ الدعوۃ" سے جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں

متعدد اختلافی و غیر اختلافی' قدیم و جدید مسائل پر انتہائی عمدہ' مختصر و جامع اور سیر حاصل تحقیق موجود ہے۔ جزاہ اللہ خیراً۔

یہ کتاب عام مسلمانوں بلکہ علماءِ کرام کے لیے بھی ازحد مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کتاب مولانا مُبشر احمد ربّانی کو جزائے خیر سے نوازے اور کتابِ مذکور کو اُن کا توشہ آخرت بنا دے۔ آمین

حافظ زبیر علی زئی
۲/ اکتوبر ۱۹۹۷ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

((اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.))

اَمَّا بَعْدُ!

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے مختلف علاقوں اور قوموں میں انبیاء و رسل (علیہم السلام) کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ اُنہیں کفرو شرک' بدعت و ضلالت اور ہر قسم کی نافرمانی سے نکال کر توحید و سنت جیسی شاہراہ پر چلائے رکھیں۔ اِسی سلسلہ کی آخری کڑی ہمارے امامِ اعظم' رسولِ مکرم' خاتم النبیین' محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے خطہ عرب میں اپنا رسول و نبی بنا کر مبعوث کیا۔ آپ ایسے معلم و مربی تھے کہ آپ جیسا کوئی معلم نہ آپ سے پہلے آیا اور نہ ہی قیامت تک آسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اطاعت و اتباع کا ہمیں امر فرمایا۔ آپ اللہ تعالیٰ کی وحی کو جہاں لوگوں پر تلاوت فرماتے تھے ساتھ ساتھ اِس کی تشریح و تفسیر' مفہوم و مطلب بھی بیان کرتے تھے تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کو عملی صورت میں دیکھ کر صحیح طور پر اِس شاہراہِ عظیم پر گامزن ہو سکیں کیونکہ قرآنِ مجید کی تشریح و تفسیر' مفہوم و مطلب' اِس کے اجمال کی تفصیل رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری تھی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (النحل : ۴۴)

"اور ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ لوگوں کی جانب جو نازل کیا گیا ہے آپ اُسے کھول کھول کر بیان کردیں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔"

اِسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے اِس بات کا ذکر کیا کہ آپ کو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ آیَاتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ ﴾ (الجمعه : ۲)

"وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے یقیناً اِس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔"

یہی بات اللہ وحدہ لا شریک نے سورۃ البقرہ : ۱۲۹، ۱۵۱ اور آل عمران : ۱۶۴ میں بیان کی ہے۔ اِن آیاتِ بینات سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے کہ آپ صرف قرآنِ مجید پڑھ کر سنانے والے نہ تھے بلکہ اِس قرآن کی تشریح و تفسیر اور اُس کے مفاہیم و مطالب کو کھول کھول کر بیان کرنے والے بھی تھے اِسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے لیے اصل الاصول دو چیزوں کو تسلیم کرتے تھے ایک اللہ کی کتاب اور دوسرا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ کیونکہ قرآن و سنت آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

قرآنِ مجید کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴾ (الحشر : ۷)

"اور تمہیں جو کچھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دیں اُسے لے لو اور جس سے روکیں رُک

جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔"

اِس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے عام حکم دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو بھی اَمر دیں اُس کی اطاعت و فرمانبرداری بجالاؤ اور جس کام سے روک دیں اُس کے قریب مت جاؤ۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرعی احکامات جو بھی ہمارے لیے صادر فرمائے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہی ہمیں دیئے ہیں۔ اِس لیے اطاعت رسول کے بغیر شریعت پر عمل کرنا ناممکن ہے۔

صحابیٔ رسول عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ صحیح احادیث میں موجود ہے کہ اُنہوں نے ایک دفعہ فرمایا : اللہ تعالیٰ اُن عورتوں پر لعنت کرے جو اپنے جسم کو گودتی اور گدواتی ہیں اور اپنے چہرے کے بال نوچتی ہیں اور خوبصورتی کے لیے اپنے سامنے کے دانتوں میں کشادگی کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدلتی ہیں۔ اُمِ یعقوب نامی ایک عورت کو یہ بات پہنچی تو وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آکر کہنے لگی :

((اِنَّهُ بَلَغَنِيْ اَنَّكَ لَعَنْتَ كَيْتَ وَ كَيْتَ فَقَالَ وَمَالِيَ لَا اَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ هُوَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ؟ فَقَالَتْ : لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ اللَّوْحَيْنِ فَمَا وَجَدْتُّ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ، فَقَالَ : لَئِنْ كُنْتِ قَرَأْتِيْهِ لَقَدْ وَجَدْتِيْهِ، اَمَا قَرَأْتِ ﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ قَالَتْ بَلٰى، قَالَ فَاِنَّهُ قَدْ نَهٰى عَنْهُ قَالَتْ : فَاِنِّيْ اَرٰى اَهْلَكَ يَفْعَلُوْنَهُ قَالَ : فَاذْهَبِيْ فَانْظُرِيْ فَذَهَبَتْ فَنَظَرَتْ فَلَمْ تَرَ مِنْ حَاجَتِهَا شَيْئًا فَقَالَ : لَوْ كَانَتْ كَذٰلِكَ مَا جَامَعْتُهَا.))

(صحیح بخاری کتاب التفسیر (۴۸۸۶) سورة الحشر ایضاً ۴۸۸۷، ۵۹۳۱، ۹۳۹، ۵۹۴۳، ۵۹۴۸، صحیح مسلم ۳/ ۱۶۷۸ کتاب

اللباس باب تحریم فعل الواصلہ ۲۱۲۵)

"مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے اس' اس طرح لعنت کی ہے؟ تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا : جن پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہو میں ان پر لعنت کیوں نہ بھیجوں؟ اور جو اللہ کی کتاب میں بھی ہے۔ تو اس نے کہا : میں نے پورا قرآن پڑھا ہے میں نے تو یہ لعنت کہیں نہیں پائی تو انہوں نے کہا : اگر تو اسے (سمجھ کر) پڑھتی تو یقیناً یہ بات اس میں پالیتی کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی ﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ﴾ "اور جو کچھ تمہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں رُک جاؤ" اس عورت نے کہا ہاں یہ آیت تو ہے تو آپ نے فرمایا : بس اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے منع کیا ہے تو وہ کہنے لگی کہ میری معلومات کے مطابق تو یہ کام آپ کی اہلیہ بھی کرتی ہیں۔ آپ نے کہا جاؤ اور دیکھ آؤ۔ تو وہ چلی گئی اور اس نے اپنی مطلوبہ بات میں سے کچھ بھی نہ پایا تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمانے لگے : اگر وہ اس طرح کی ہوتی تو میں اس کے ساتھ مجامعت نہ کرتا۔

اس سچے واقعہ سے معلوم ہوا کہ صحابئ رسول عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو عین اللہ کا حکم قرار دیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی کی پیروی ہم پر لازم ہے اور آپ کے بتائے ہوئے احکامات اللہ تعالیٰ کے ہی احکام ہیں۔ آپ کے امر کی مخالفت کرنے سے اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور عذابِ الیم کی وعید سنائی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ (النور : ٦٣)

"جو لوگ حکم رسول اللہ کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ان پر کوئی زبردست آفت نہ آپڑے یا انہیں دردناک عذاب پہنچے۔"

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات سے سرتابی اور مخالفت کا نتیجہ ایمان سے محرومی' کفر پہ خاتمہ جہنم کے دائمی عذاب کا باعث ہے۔ سو ہم پر لازم

ہے کہ ہم اپنے امامِ اعظم ' ہادی و مرشد اور مکرم و معظم ' اکمل و اعلیٰ رسول ﷺ کے منہاج اور سنت کو ہمہ وقت سامنے رکھیں اور اُس سے مکمل راہنمائی اور درس لیں کیونکہ نجات اِسی میں ہے۔ آپ کی اطاعت واتباع کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں بہت زور دیا ہے۔ چند ایک آیات ملاحظہ ہوں :

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ﴾ (آلِ عمران : ۳۱'۳۲)

"کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کیجئے اگر یہ منہ پھیر لیں تو بے شک اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔"

﴿ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾

(الاعراف : ۱۵۸)

"کہہ دیجئے اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اُس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ' وہی زندگی اور موت دیتا ہے سو تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اُس کے نبی اُمّی پر جو کہ اللہ تعالیٰ پر اور اِس کے احکام پر ایمان رکھتا ہے اور اِس (نبی) کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔"

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴾

(النساء : ۵۹)

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ (ﷺ) کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اختیار والوں کی۔ پھر اگر تم کسی بات میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ اگر تمہارا اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان ہے یہ بہت بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔"

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنَافِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴾ (النساء : ٦١)

"اور جب انہیں کہا جائے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کلام اور رسول اللہ ﷺ کی طرف آجاؤ تو آپ دیکھ لیں گے کہ یہ منافق آپ سے منہ پھیر کر رُکے جاتے ہیں۔"

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾

(النساء : ٦٥)

"قسم ہے تیرے پروردگار کی یہ ایماندار نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپس کے تمام اختلاف میں آپ کو حاکم نہ مان لیں پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں۔ ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں۔"

﴿ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾

(النور ۵۱ : ۵۲)

"ایمان والوں کا قول تو یہ ہے کہ جب انہیں اس لیے بلایا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان میں فیصلہ کر دے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں اور جو بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت

کرے اور خوفِ الٰہی رکھے اور اس کے عذابوں سے ڈرتا رہے وہی نجات پانے والے ہیں۔"

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾ (الاحزاب : ٣٦)

"اور کسی مومن مرد و عورت کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے بعد اپنے کسی امر کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور اللہ اور اُس کے رسول کی جو بھی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔"

قرآنِ مجید' فرقانِ حمید میں ان معانی کی کئی ایک آیاتِ مقدسات ہیں جن سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ انسانیت کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے بیان کردہ احکامات کافی ہیں' ان کے مقابلے میں کسی اور کی بات حجت نہیں ہو سکتی۔ لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ امت مسلمہ نے اس واضح منہاج کو ترک کر کے اپنی من مانی کرنی شروع کر دی ہے۔ قرآن کی تفسیر و تفہیم کے لیے رسولِ کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور اپنی مرضی کی تفسیر و تفہیم کو اللہ تعالیٰ کی تفسیر و تفہیم قرار دیا جاتا ہے جیسا کہ منکرینِ احادیث رسول اللہ ﷺ کی کتب سے ظاہر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ قرآنِ مجید کے ساتھ میرے بتائے ہوئے احکامات کو ترک نہ کر بیٹھنا جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے:

((عَنْ اَبِیْ رَافِعٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَاْتِيْهِ الْاَمْرُ مِنْ اَمْرِیْ مِمَّا اَمَرْتُ بِهٖ اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُوْلُ لَا اَدْرِیْ مَا وَجَدْنَا فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَاهُ.)) (مسند احمد (٨/٦) ابوداؤد (١٢/٥) كتاب السنة باب في لزوم السنة (٤٦٠٥) ترمذی' كتاب العلم باب ما نهى عنه ان

يقال عند حديث النبي صلى الله عليه وسلم (٢٦٦٣) ابن ماجه (٦/١-٧) باب تعظيم حديث رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم (١٣) دلائل النبوة بيهقي (٥٤٩/٦) مسند حميدي (٥٥١) الرسالة للشافعي (٢٩٥) طبع قديم ١٥ مستدرك حاكم (١٠٨/١، ١٠٩) مسند شافعي (١٥١، ٢٣٣، ٢٣٤) ابن حبان (١٣) شرح السنة (٢٠١/١، ٢٠٠)۔

"ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم سے کسی آدمی کو اس کی چارپائی پر ٹیک لگائے ہوئے اس طرح نہ پاؤں کہ اُس کے پاس میرے احکام سے کوئی حکم آئے جس کا میں نے حکم دیا ہو یا اُس سے روکا ہو اور وہ کہہ دے میں نہیں جانتا ہم جو قرآن میں پائیں گے اُس کی پیروی کریں گے۔"

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَفِي الْحَدِيْثِ دَلِيْلٌ عَلٰى أَنَّهُ لَا حَاجَةَ بِالْحَدِيْثِ إِلٰى أَنْ يُّعْرَضَ عَلَى الْكِتَابِ وَأَنَّهُ مَهْمَا ثَبَتَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ حُجَّةً بِنَفْسِهِ وَقَدْ ((قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا إِنِّي أُوْتِيْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ.))

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو کتاب اللہ پر پیش کرنے کی حاجت نہیں جب حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوگئی تو وہ بذاتِ خود حجت ہے یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خبردار میں قرآنِ مجید اور اُس کی مثل اِس کے ساتھ دیا گیا ہوں۔"

یہ حدیث جس کی طرف امام بغوی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے، صحابئ رسول مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے سنن ابوداؤد ۵/ ۱۰-۱۲، کتاب السنة (۴۶۰۴) ابن ماجہ ۶/۱-۷ (۱۳) دلائل النبوۃ بیھقی ۵۴۹/۶ تمھید شرح موطا امام مالك ۱۴۹/۱، مسند احمد ۱۳۱/۴ وغیرہ میں مروی ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ سے معلوم ہوا کہ ہمارے شرعی مسائل کا

حل کتاب و سنت میں بدرجہ اتم موجود ہے دین کتاب و سنت کا نام ہے جو آدمی کتاب و سنت پر عمل پیرا ہو جاتا ہے اِس کی نجات یقینی ہے اور جو اِس شاہراہ سے ہٹ جاتا ہے وہ گمراہ ہو جاتا ہے اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن بنالیتا ہے۔

اہلحدیث کا منہج کتاب و سنت ہی ہے جو بات کتاب و سنت سے واضح ہو جاتی ہے وہی ہمارا ایمان و عقیدہ' منہج و راستہ ہے اور جو اُس سے ٹکرا جاتی ہے وہ ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں۔ خواہ وہ بات کسی امام' مجتہد' مفسر' مفتی' محدث وغیرہ کی ہی کیوں نہ ہو حتیٰ کہ اگر کسی صحابیٔ رسول کی بات اللہ اور اُس کے رسول کے خلاف آجائے تو وہ ہمارے نزدیک مسلم نہیں کیونکہ تمام اختلافات و نزاعات کا حل' اللہ وحدہ لاشریک نے اطاعت باری تعالیٰ اور اطاعت رسول میں رکھا ہے۔

اور یہ بات احناف اور ہمارے درمیان مشترک ہے کہ قولِ صحابی اگر صحیح مرفوع حدیث کے خلاف ہو تو قابل قبول نہیں جیسا کہ ابن ہمام حنفی فتح القدیر شرح ہدایہ پر رقمطراز ہیں:

إِنَّ قَوْلَ الصَّحَابِي حُجَّةٌ مَالَمْ يَنْفِهِ شَيْئٌ مِّنَ السُّنَّةِ.

"یقیناً قولِ صحابی حجت ہے جب تک اِسکی سنت میں سے کوئی چیز نفی نہ کرے۔"

یہی بات مولوی عبدالحیٔ لکھنوی حنفی نے امام الکلام ص ۲۲۲ طبع قدیم اور طبع جدید ص ۲۳۵ پر ظفر الامانی ص ۱۸۰' مولوی اشرف علی تھانوی صاحب نے احیاء السنن ص ۳۹' مولوی ظفر احمد تھانوی صاحب نے اعلاء السنن ص ۱/۱۱۶' ۱۳۴' ۵۰۹' ابو یوسف محمد شریف بریلوی نے اپنی کتاب دلائل المسائل ص ۲۱۰' مولوی سرفراز صفدر دیوبندی نے حکم الذکر بالجھر ص ۱۰۵' ملا علی قاری حنفی نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۲/۲۳۴ طبع قدیم حاشیہ دُرِ مختار ص ۱۱۳ وغیرہ میں ذکر کی ہے۔

لہٰذا حنفی علماء اور اہلحدیث علماء کا متفقہ موقف ہے کہ حدیثِ رسول کے مقابلہ میں قولِ صحابی بھی حجت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے تمام مسائل کا حل کتاب و سنت میں تلاش کرتے ہیں اور اِسی اصول کے مطابق ہم نے اپنی زیر ترتیب کتاب میں مسائل کو

اخذ کیا ہے۔

فروری ۱۹۹۲ء میں جب میرے والد گرامی رحمہ اللہ نے مجھے مرکز الدعوۃ والارشاد میں امیر مرکز الدعوۃ والارشاد حافظ محمد سعید حفظہ اللہ العلیم کے تحت رہ کر دعوت و جہاد کا کام کرنے کے لیے بھیجا تو مرکز میں مجھے شعبہ دعوت و اصلاح میں ذمہ داری دی گئی اور اس کے ساتھ میرے انتہائی قابل قدر بھائی قاضی کاشف نیاز نائب مدیر مجلہ الدعوۃ نے میری توجہ اس بات کی طرف مبذول کروائی کہ مجلہ میں ایک کالم دینی سوال و جواب کا ہونا چاہیے اور لوگوں کے بہت سے خطوط ایسے مسائل کے متعلق آتے رہتے ہیں جن کا حل ہمارے اوپر ضروری ہے۔ میں نے ان کی اس بات پر لبیک کہا اور وعدہ کر لیا کہ اپنی ہمت و بساط کے مطابق کام کروں گا۔ اس کے بعد میں نے اپنے استاذ مکرم استاذ الاساتذہ شیخ الحدیث مفتی عبیداللہ عفیف حفظہ اللہ سے بات کی' انہوں نے میری کافی حوصلہ افزائی کی بلکہ مجلہ الدعوۃ میں سب سے پہلے اس حوالے سے چھپنے والے کالم میں ان کا ایک جواب بھی درج ہے۔ جیسا کہ مجلہ الدعوۃ مارچ ۱۹۹۲ء سے یہ بات عیاں ہے اس کے بعد مسلسل یہ سلسلہ جاری رہا' درمیان میں میری سستی و کاہلی کے باعث کچھ انقطاع بھی ہوا۔ میرے انتہائی مشفق و مربی استاذ الاساتذہ حافظ عبدالسلام حفظہ اللہ نے اس دوران یہ سلسلہ جاری رکھا بلکہ حافظ عبدالسلام صاحب موصوف نے سوالوں کے جوابات لکھنے میں میری کافی حد تک راہنمائی بھی کی۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے اور ان سے کماحقہ فائدہ اٹھانے کی توفیق بخشے۔

بہرصورت یہ سلسلہ تاہنوز جاری و ساری ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے دیگر بھائیوں کو یہ کام کرنے کی توفیق عطا کیے رکھے۔

مجلہ الدعوۃ کا کالم "آپ کے دینی مسائل سنت کی روشنی میں" مسلسل جاری ہے جس پر بعض دینی بھائیوں نے مجھے خطوط لکھ کر اور بعض نے بالمشافہ اس بات کی طرف توجہ دلائی کی ان جوابات کو کتابی صورت میں اکٹھا کر دیا جائے تاکہ قارئین کو مسائل کے حل تلاش کرنے میں سہولت ہو اور مجھے بھی یہ سوچ و فکر دامن گیر تھی کہ یہ کام اللہ

تعالیٰ کے فضل سے ضرور کرنا چاہیے۔ حتیٰ کہ اللہ وحدہ لا شریک کا فضل خاص ہوا کہ میرے ایک انتہائی قابل قدر بھائی حافظ ظہیر الدین بابر منصور پوری نے میری توجہ اِس طرف مبذول کرائی بلکہ اوّلاً اِس کی اشاعت و طباعت کا ذمہ بھی لے لیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں' ان کے والدین اور بہن بھائیوں کو کتاب و سنت کی اِس شاہراہ پر مزید کام کرنے کی ہمت بخشے اور ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

زیر ترتیب اِس کتاب میں چھپنے والے اکثر سوالوں کے جوابات تو میری جانب سے ہیں اور کئی ایک مقامات پر استاذ الاساتذہ حافظ عبدالسلام بھٹوی اور فاضل مدینہ یونیورسٹی بھائی عبدالرحمٰن عابد صاحب اور چند ایک مقامات پر مولانا رحمت اللہ ربّانی صاحب کے جوابات بھی درج ہیں۔ جواب کے آخر میں عبدالرحمٰن عابد صاحب کے جواب کے ساتھ ع۔ز اور حافظ صاحب کے جواب کے ساتھ ع۔م لکھ کر توضیح کر دی ہے۔

اللہ تعالیٰ میرے ان تمام بزرگوں کو اِس کا اجر عظیم عطا فرمائے اور ان کا سایہ عاطفت ہمارے اُوپر تادیر قائم رکھے اور مستقبل میں بھی ان عظیم ہستیوں سے فائدہ اُٹھانے کی پوری پوری توفیق بخشے۔

اور اللہ تعالیٰ اِس کتاب کو میرے لیے' میرے والدین کے لیے' ناشر اور اِس کے والدین کے لیے اَجر و ثواب کا ذخیرہ بنائے اور قیامت کے دن کی ہولناکیوں سے ہمیں محفوظ فرمائے۔

یوں تو بازار میں کئی ایک کتب آپ کو مسائل شرعیہ کے حل کے لیے ملیں گی لیکن اِس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ حتی الوسع اِس میں کسی کمزور روایت کو جگہ نہیں دی گئی۔ اگر کسی بھائی کو کسی مقام پر کوئی کمزور روایت معلوم ہو جو کہ ناقابل حجت ہو تو وہ خیر خواہی کے جذبہ سے ہمیں ضرور مطلع کرے کیونکہ غلطیوں سے پاک و مبرا تو اللہ وحدہ لا شریک کی ذات ہے اور انسان سے خطائیں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ اِس لیے کہیں کوئی غلطی دیکھیں تو اُس کو ہماری بشری کمزوری سمجھیں۔

علاوہ ازیں کئی مقامات پر اختلافی مسائل میں مختلف مکاتب فکر کے ساتھ دلائل کے ذریعے محاکمہ بھی کیا گیا اور صحیح و راجح موقف کو واضح کیا گیا ہے۔ دلائل کی نفاست و عمدگی کے ساتھ کتاب کی کمپوزنگ و پرنٹنگ میں بھی اعلیٰ معیار کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔
اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے تمام بھائیوں کو کتاب و سنت پر عمل کی توفیق بخشے۔

((اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَ عَمَلاً مُتَقَبَّلاً وَّ رِزْقًا طَیِّبًا وَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ).))

طالب دعا

ابو الحسن مُبشر احمد ربانی

مدرس المعهد العالی للدعوۃ الاسلامیۃ' مرکز طیبہ' مرید کے۔

۱۳/ ۲/ ۱۴۱۸ھ

بمطابق ۲۰/ ۶/ ۱۹۹۷ م
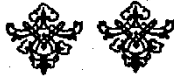
کتاب

اَلْعَقَائِدِ وَالتَّارِیْخِ

اللہ تعالیٰ کہاں پر مستوی ہے؟

س: کیا اللہ ہر جگہ موجود ہے یا عرش پر؟ وضاحت فرمائیں۔

ج: اللہ تعالیٰ کے بارے میں محدثین و سلف صالحین رحمہم اللہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستویٰ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ (طٰہ : ۵)

"رحمٰن عرش پر مستوی ہوا۔"

مستویٰ ہونے کا مفہوم بلند ہونا اور مرتفع ہونا ہے جیسا کہ بخاری شریف میں آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ كِتَابًا ــــــــ فَهُوَ عِنْدَهٗ فَوْقَ الْعَرْشِ))

(متفق علیہ)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب لکھی جو اُس کے پاس عرش کے اُوپر ہے۔"

لیکن اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے اسی طرح وہ عرش پر مستوی ہے ہماری عقلیں اُس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ ہر جگہ میں موجود ہے کیونکہ وہ مکان سے پاک اور مبرا ہے البتہ اُس کا عِلم اور اس کی قدرت ہر چیز کو محیط ہے' اس کی معیت ہر کسی کو حاصل ہے جیسا کہ کتب عقائد میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ (مجلّۃ الدعوۃ' جون / ۱۹۹۲ء)

اللہ کے سوا کسی دُوسرے سے مدد مانگنا

س: کسی بزرگ کے مزار پر جا کر یہ کہنا کہ اے فلاں بزرگ ہماری یہ حاجت پوری کر دو۔

یا بزرگ کی قبر پر جا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے یہ دُعا فرمائیں؟ قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔ (منظور احمد)

ج اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی نقصان۔ ایسی اشیاء کے حصول کے لیے جو مخلوق کے اختیار میں نہیں ہیں' مخلوق کے کسی فرد کو پکارنا شرک ہے اور پھر مُردے کو جو نہ سُن سکتا ہے اور نہ جواب دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ وَلاَ تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالاَ يَنْفَعُكَ وَلاَ يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (يونس : ١٠٦)

"اور اللہ کے سوا کسی کو مت پکارو جو نہ تجھے نفع دے سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر تُو نے یہ کام کیا تو ظالموں میں شمار ہو گا۔"

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا ہے کہ کوئی غیر اللہ کو اپنی حاجت روائی یا مشکل کشائی کے لیے پکارے اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ کے سوا نہ کوئی کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اللہ فرماتے ہیں :

﴿ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلاَ كَاشِفَ لَهٗ إِلاَّ هُوَ ﴾ (يونس : ١٠٧)

"اگر اللہ تعالیٰ تجھ کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دے تو اُس مصیبت کو دور کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔"

صحیح حدیث ہے' نبی کریم ﷺ نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کو کہا :

((وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى أَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ إِلاَّ بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ)) الخ (متفق عليه)

"جان لو کہ اگر ساری اُمت تجھے نفع پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے اور اگر اللہ نہ چاہے تو نفع نہیں پہنچا سکتی۔"

قرآن میں ایک جگہ ہے :

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لاَ يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ

اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ ﴾ (العنکبوت : ١٧)

"بے شک جن لوگوں کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو' وہ تمہارے لیے رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ پس تم اللہ کے ہاں سے رزق مانگو اور اُس کی عبادت کرو۔"

ایک اور جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِھِمْ غَافِلُوْنَ ○ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَھُمْ اَعْدَاءً وَّ کَانُوْا بِعِبَادَتِھِمْ کَافِرِیْنَ ﴾ (الاحقاف ۵ : ۶)

"اور ایسے لوگوں سے کون زیادہ گمراہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا ایسے لوگوں کو پکارتے ہیں جو قیامت تک اُن کی دُعا قبول نہ کر سکیں بلکہ اُن کی آواز سے بھی بے خبر ہوں اور جب سب لوگ جمع کیے جائیں گے تو وہ اُن کے دشمن ہو جائیں گے اور اُن کی عبادت سے انکار کر دیں گے۔"

اِس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ غیر اللہ کو حاجت روائی کے لیے پکارنا اُن کی عبادت ہے حالانکہ انسان صرف اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن میں ایک اور جگہ ارشاد ہے :

﴿ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْءَ ﴾ (النمل : ٦٢)

"کہ مضطر (بے بس) شخص کی دُعا کو قبول کرنے والا اور مشکل کو حل کرنے والا اللہ کے سوا کون ہے۔"

یہ چند دلیلیں ہیں ورنہ اِس کے بیان کے لیے قرآن و سنت میں کئی ایک نصوص موجود ہیں جن کو پڑھ کر کوئی بھی ذی شعور اور صاحب عقل اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا نہیں سمجھ سکتا۔ یہ تو ایسی کھلی حقیقت ہے کہ مشرکین مکہ بھی اِس کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِس اعتراف کا ذکر کیا ہے۔ اگر کسی بزرگ کی قبر پر جا کر حاجت روائی

کے لیے پکارنا درست ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ سے بڑا بزرگ دُنیا میں کون ہو سکتا تھا؟ حال یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی امام الانبیاء (ﷺ) کی قبر پر جاکر کسی حاجت کے لیے کبھی نہیں پکارا اگر یہ کام جائز ہوتا تو صحابہ خصوصاً خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کو اپنے دور میں بڑی بڑی ضرورتوں اور مصائب کا سامنا تھا وہ ضرور اللہ کے رسول ﷺ کی قبر پر آتے۔ بالکل اسی طرح دُعا کا مسئلہ ہے۔ ان جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی اللہ کے رسول ﷺ کی قبر پر آکر یہ نہیں کہا کہ آپؐ ہمارے لیے دُعا کر دیں۔ ہاں! زندگی میں جو واقعتاً بزرگ ہو اُس سے دُعا کروانی درست ہے اور اِس میں بھی بزرگ سے نہیں مانگا جاتا بلکہ اُس سے عرض کی جاتی ہے کہ وہ اللہ سے ہماری بہتری کے لیے دُعا کرے۔ ع۔ع مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۵ء

مسئلہ تقدیر

س اللہ تعالیٰ نے جب سب کچھ لکھ دیا ہے کہ انسان دُنیا میں جاکر یہ کام کرے گا۔ نیک بخت ہوگا یا بدبخت' جنتی ہوگا یا جہنمی۔ تو اِس میں ہمارا کیا قصور ہے جب کوئی بُرا کام کسی کے مقدر میں لکھا ہے تو اُسے پھر سزا کیوں دی جائے گی؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں۔ (ایک سائل' گوجرانوالہ)

ج مسئلہ تقدیر اِن مسائل میں سے ہے جن کے متعلق بحث و تمحیص کرنا شرعاً منع ہے کیونکہ اِس کے متعلق بحث و تکرار سے اَجر کی محرومی' بدعملی اور ضلالت کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی صحیح حدیث ہے:

((عَنْ عَمْرِو بِنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَصْحَابِهٖ وَهُمْ يَخْتَصِمُونَ فِي الْقَدْرِ فَكَاَنَّمَا يُفْقَاءُ فِيْ وَجْهِهٖ حَبُّ الرُّمَّانِ عَنِ الْغَضَبِ فَقَالَ بِهٰذَا اُمِرْتُمْ اَوْ لِهٰذَا خُلِقْتُمْ؟ تَضْرِبُوْنَ الْقُرْآنَ بَعْضَهٗ بِبَعْضٍ بِهٰذَا

هَلَكَتِ الْأُمَمُ قَبْلَكُمْ)) (ابن ماجہ (۸۵)۱/ ۲۳ مصنف عبدالرزاق (۲۰۳۶۷)
۱۱/ ۲۱۶ مسند احمد ۲/ ۱۷۸، ۱۸۵، ۱۹۵)

"آپ اپنے اصحاب پر اِس حالت میں نکلے کہ وہ مسئلۂ تقدیر پر بحث کر رہے تھے، آپ یہ دیکھ کر اِس قدر غُصّے میں آگئے معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے چہرے پہ انار کے دانے نچوڑ دیئے گئے ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم اِس کا حکم دیئے گئے ہو یا تم اِس کام کے لیے پیدا کیے گئے ہو؟ اللہ کے قرآن کی بعض آیات کو بعض کے ساتھ ٹکراتے ہو؟ اِسی وجہ سے تم سے پہلی اُمتیں ہلاک ہوگئیں۔"

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کے اندر کئی مقامات پر بیان کیا ہے کہ ہم نے خیر و شر دونوں کا راستہ دکھا دیا ہے اور اسے اختیار دیا ہے کہ جس راستے کو چاہے اختیار کر لے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴾ (الدھر : ۳)

"ہم نے اِس کو راستہ دکھا دیا ہے خواہ وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا۔"

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ (البلد : ۱۰)

"ہم نے اُسے دونوں راستے دکھا دیئے۔"

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر کے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں اور اُسے عقل و شعور دیا ہے کہ اپنے لیے اِن دونوں راستوں میں سے جو صحیح راستہ ہے اختیار کر لے۔ اگر انسان سیدھے یعنی خیر و برکت والے راستے کو اختیار کرے گا تو جنت میں داخل ہو جائے گا اور جہنم کے دردناک عذاب سے اپنے آپ کو بچالے گا اور اگر راہِ راست کو ترک کر کے ضلالت و گمراہی اور شیطانی راہ پر گامزن ہوگا تو جہنم کی آگ میں داخل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے جو تقدیر لکھی ہے اُس نے اپنے عِلم کی بنیاد پر لکھی کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں وہ ہر شخص کے متعلق تمام معلومات رکھتا ہے۔ اُس کو معلوم ہے کہ انسان دنیا میں کیسے

رہے گا؟ کیا کرے گا؟ اُس کا انجام کیا ہوگا؟ اِس لیے اُس نے اپنے عِلم کے ذریعے سب کچھ پہلے ہی لکھ دیا ہے کیونکہ اُس کا عِلم و اندازہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا اور تقدیر میں لکھی ہوئی اُس کی تمام باتیں ویسے ہی وقوع پذیر ہوں گی جس طرح اُس نے قلمبند کی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ کے کمالِ عِلم و احاطۂ کلی کا ذکر ہے۔ اِس میں یہ بات نہیں کہ انسان کو اُس نے اِن لکھی ہوئی باتوں پر مجبور کیا ہے۔

اِس لیے یہ بات کہنا صحیح نہیں ہوگی کہ زانی و شرابی' چور و ڈاکو وغیرہ جہنم میں کیوں جائیں گے؟ کیونکہ اُن کے مقدر میں ہی زنا کرنا' شراب پینا' چوری کرنا اور ڈاکے وغیرہ ڈالنا لکھا ہوا تھا۔ اِس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک اُستاد جو اپنے شاگردوں کی ذہنی و علمی صلاحیتوں اور اُن کے لکھنے پڑھنے سے دلچسپی و عدم دلچسپی سے اچھی طرح واقف ہے اپنے عِلم کی بنا پر کسی ذہین و محنتی طالب عِلم کے بارے میں اپنی ڈائری میں لکھ دے کہ یہ طالب عِلم اپنی کلاس میں اوّل پوزیشن حاصل کرے گا اور کسی شریر اور غبی و کند ذہن طالب عِلم کے بارے میں لکھ دے کہ وہ امتحان میں ناکام ہوگا اور کند ذہن و لائق طالب عِلم دونوں کو کلاس میں برابر محنت کرائے اور اکٹھا اُنہیں سمجھائے لیکن جب امتحان ہو اور ذہین و لائق طالب عِلم اچھے نمبر حاصل کر کے اوّل پوزیشن حاصل کر لے اور کند ذہن طالب عِلم ناکام ہو جائے تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ لائق طالب عِلم اِس لیے کامیاب ہوا کہ استاد نے پہلے ہی اپنی ڈائری میں اُس کے متعلق لکھ دیا تھا کہ وہ اوّل پوزیشن حاصل کر لے گا اور کند ذہن اِس لیے فیل ہوا کہ اُس کے متعلق اُستاد نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ وہ فیل و ناکام ہوگا۔ لہٰذا اِس بے چارے کا کیا قصور اور گناہ ہے؟ یقیناً سمجھدار انسان یہ نہیں کہے گا کہ اِس میں اُستاد کا قصور ہے۔ اِس لیے کہ اِس میں اُستاد کی غلطی نہیں کیونکہ وہ دونوں کو برابر سمجھاتا رہا کہ امتحان قریب ہیں' محنت کر لو ورنہ فیل ہو جاؤ گے۔ اُستاد کی ہدایت کے مطابق لائق و ذہین طالب عِلم نے محنت کی اور نالائق و شریر طالب عِلم

اپنی بُری عادات میں مشغول رہا اور اپنا وقت کھیل کود اور شرارتوں میں صرف کر دیا۔

اِسی طرح اللہ تعالیٰ جس کا علم بلاشبہ پوری کائنات سے زیادہ اکمل و اتم ہے' اُس سے کوئی چیز مخفی و پوشیدہ نہیں' اُس نے اپنے کامل علم کی بناء پر ہر انسان کے دنیا میں آنے سے قبل ہی لکھ دیا ہے کہ یہ بدبخت ہوگا یا نیک بخت؟ جنتی ہوگا یا جہنمی؟ مگر اِن سے اختیارات اور عقل و شعور سلب نہیں کرتا بلکہ اُن کی راہنمائی کرتے ہوئے اچھے اور بُرے راستوں میں فرق اپنے انبیاء و رُسل علیہم السلام بھیج کر کرتا رہا ہے اور سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے کے بعد ورثۃ الانبیاء صالح علماء کے ذریعے کائنات میں اُنہیں ایمان و اعتقاد اور اعمالِ صالحہ کی دعوت دیتا ہے۔ کفر و شرک' معصیت اور گناہ سے منع کرتا ہے۔ جہنم کے عذاب اور حساب و کتاب اور قیامت کی ہولناکیوں سے ڈراتا ہے۔ اِن تمام احکامات کے باوجود جب کافر اپنے کفر اور طغیان پر اڑا رہتا ہے' فاسق اپنے فسق و فجور سے توبہ نہیں کرتا تو اُس کے اِن بُرے اعمال پر اگر اللہ تعالیٰ اُس کو سزا دے تو اِس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ یہ تو عین عدل و انصاف ہے اور اِس کے برخلاف نیک و بد اور کافر و مومن سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا عین ظلم و ناانصافی ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' فروری / ۱۹۹۳ء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ

س تفصیل سے واضح کریں کہ سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ مبارک تھا یا نہیں؟ (محمد امین' بہاولپور)

ج سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برگزیدہ نبی اور انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلسلہ انسانیت سے ہی پیدا کیا تھا اور انسان ہونے کے اعتبار سے یہ بات عیاں ہے کہ انسان کا سایہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر فرمایا ہے کہ :

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ (رعد : ۱۵)

"اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی اور ناخوشی سے اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ کرتی ہیں اور اُن کے سائے بھی صبح و شام سجدہ کرتے ہیں۔"

ایک اور مقام پر فرمایا :

﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴾ (النحل : ۴۸)

"کیا انہوں نے اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ اُس کے سائے دائیں اور بائیں سے لوٹتے ہیں۔ یعنی اللہ کے آگے عاجز ہو کر سربسجود ہوتے ہیں۔"

اِن ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان و زمین میں اللہ نے جتنی مخلوق پیدا کی ہے اُن کا سایہ بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی تو اللہ کی مخلوق ہیں لہٰذا آپ کا بھی سایہ تھا۔ آپ کے سائے کے متعلق کئی احادیث موجود ہیں جیسا کہ :

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک رات نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور بالکل نماز کی حالت میں اپنا ہاتھ اچانک آگے بڑھایا مگر پھر جلد ہی پیچھے ہٹا لیا ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ آج آپ نے خلافِ معمول نماز میں نئے عمل کا اضافہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ میرے سامنے ابھی ابھی جنت پیش کی گئی میں نے اِس میں بہترین پھل دیکھے تو جی میں آیا کہ اِس میں سے کچھ اُچک لوں مگر فوراً حکم ملا کہ پیچھے ہٹ جاؤ میں پیچھے ہٹ گیا پھر مجھ پر جہنم پیش کی گئی۔

((حَتّٰى رَأَيْتُ ظِلِّي وَظِلَّكُمْ)) اِس کی روشنی میں میں نے اپنا اور تمہارا سایہ دیکھا۔ دیکھتے ہی میں نے تمہاری طرف اشارہ کیا کہ پیچھے ہٹ جاؤ۔

(مستدرک حاکم ۴/ ۴۵٦)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے تلخیص مستدرک میں فرمایا: ھذا حدیث صحیح یہ حدیث صحیح ہے۔ اسی طرح مسند احمد ٦/ ١٣٢، ٦/ ٣٣٨ طبقات الکبریٰ ٨/ ١٢٧، مجمع الزوائد ٤/ ٣٢٣ پر ایک حدیث میں مروی ہے کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا اور سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں، صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک اُونٹ تھا اور وہ بیمار ہوگیا جب کہ زینب رضی اللہ عنہا کے پاس دو اونٹ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ایک زائد اونٹ صفیہ رضی اللہ عنہا کو دے دو تو اُنھوں نے کہا میں اُس یہودیہ کو کیوں دوں؟ اِس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوگئے۔ تقریباً تین ماہ تک زینب رضی اللہ عنہا کے پاس نہ گئے حتیٰ کہ زینب رضی اللہ عنہا نے مایوس ہو کر اپنا سامان باندھ لیا۔

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

فَبَيْنَمَا اَنَا يَوْمًا بِنِصْفِ النَّهَارِ اِذَا اَنَا بِظِلِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُقْبِلٍ۔

"اچانک دیکھتی ہوں کہ دوپہر کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ مبارک آ رہا ہے۔"

عقلی طور پر بھی معلوم ہوتا ہے کہ سایہ مرئیہ فقط اُس جسم کا ہوتا ہے جو ٹھوس اور نگر ہو نیز سورج کی شعاعوں کو آگے گزرنے نہ دے۔ لیکن اگر وہ جسم اتنا صاف اور شفاف ہو کہ وہ سورج کی شعاعوں کو روک ہی نہیں سکتا تو اِس کا سایہ بلاشبہ نظر نہیں آتا۔ مثلاً صاف اور شفاف شیشہ اگر دھوپ میں لایا جائے تو اُس کا سایہ دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اِس میں شعاعوں کو روکنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ بخلاف اِس کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر نہایت ٹھوس اور نگر تھا اُس کی ساخت شیشے کی طرح نہیں تھی کہ جس سے سب کچھ ہی گزر جائے۔

لامحالہ آپؐ کا سایہ تھا۔ اگر جسم اطہر کا سایہ مبارک نہ تھا تو کیا جب آپؐ لباس پہنتے تو آپؐ کے ملبوسات کا بھی سایہ نہ تھا اگر وہ کپڑے اتنے لطیف تھے کہ اُن کا سایہ نہ تھا تو پھر ان کے پہننے سے ستر وغیرہ کی حفاظت کیسے ممکن ہوگی؟

منکرینِ سایہ یہ کہتے ہیں کہ آپؐ نور تھے اور نور کا سایہ نہیں ہوتا اور یہ بھی

کہتے ہیں کہ آپ کا سایہ اِس لیے نہیں تھا کہ اگر کسی کا آپ کے سایہ پر قدم آجاتا تو آپ کی توہین ہوتی اِس لیے اللہ نے آپ کا سایہ پیدا ہی نہیں کیا۔ جہاں تک پہلی بات کا ذکر ہے کہ آپ نور تھے اور نور کا سایہ نہیں' سراسر غلط ہے۔ نوریوں کا سایہ صحیح حدیث سے ثابت ہے جب سیّدنا جابر رضی اللہ عنہ کے والد عبداللہ رضی اللہ عنہ غزوۂ اُحد میں شہید ہوگئے تو اُن کے اہل و عیال اُن کے گرد جمع ہو کر رونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا زَالَتِ الْمَلَائِكَةُ تُظِلُّهُ بِاَجْنِحَتِهَا حَتّٰى رَفَعْتُمُوْهُ))

(بخاری کتاب الجنائز ۲/ ۱۵)

"کہ جب تک تم انہیں یہاں سے اُٹھا نہیں لیتے اُس وقت سے فرشتے اِس پر اپنے پَروں کا سایہ کیے رکھیں گے۔"

اور دوسری بات بھی خلافِ واقع ہے کیونکہ سایہ پاؤں کے نیچے آہی نہیں سکتا جب بھی کوئی شخص سائے پر پاؤں رکھے گا تو سایہ اُس کے پاؤں کے اُوپر ہو جائے گا نہ کہ نیچے۔ لہٰذا ان عقلی اور نقلی دلائل کے خلاف یہ بے عقلی کی اور بے سند باتیں حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ (مجلّۃ الدعوۃ' مئی/ ۱۹۹۲ء)

قبر میں نبی ﷺ کی زیارت

س: میت سے قبر میں جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ((مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ)) (تو اِس مَرد کے متعلق کیا کہتا ہے؟) تو کیا رسول اللہ ﷺ کی صورت وہاں میت کو دکھلائی جاتی ہے یا آپ خود تشریف لاتے ہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اِس حدیث میں هٰذَا اِسم اشارہ قریب کے لیے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ وہاں موجود ہوتے ہیں اور فرشتے آپ کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ ((مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ)) قرآن و سنت کی روشنی میں صحیح جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

ج: جب انسان اِس دارِ فانی سے اپنا وقت مقررہ ختم کر کے قبر کی آغوش

میں پہنچتا ہے تو اِس سے منکر نکیر جو سوالات کرتے ہیں اُن میں سے ایک سوال نبی کریم ﷺ کے متعلق بھی ہوتا ہے' کہا جاتا ہے کہ ((مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ)) تو اِس مَرد کے متعلق کیا کہتا ہے؟ اگر آدمی ایمان دار ہو تو وہ اِس کا صحیح جواب دیتا ہے اور اگر کافر ہو تو کہتا ہے لا ادری میں نہیں جانتا لیکن کسی صحیح حدیث میں یہ مذکور نہیں کہ آپ خود تشریف لاتے ہیں یا آپ کی صورت وہاں پر پیش کی جاتی ہے جسے دیکھ کر اور اشارہ کر کے فرشتے کہتے ہوں کہ ((مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ.))

ملا علی قاری نے مشکوٰۃ کی شرح مرقاۃ میں لکھا ہے کہ:

قِيْلَ يُكْشَفُ لِلْمَيِّتِ حَتّٰى يَرَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهِيَ بُشْرٰى عَظِيْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِ اِنْ صَحَّ ذٰلِكَ وَلَا نَعْلَمُ حَدِيْثًا صَحِيْحًا مَّرْوِيًّا فِيْ ذٰلِكَ۔ (مرقاۃ علی ہامش مشکوٰۃ ۱/ ۴۴)

کہا گیا ہے کہ میت کے لیے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ نبی کریم ﷺ کو دیکھتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو مومن کے لیے بڑی عظیم خوشخبری ہے (کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کر لیتا ہے) لیکن اِس کے متعلق ہمارے علم کے مطابق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں۔

امام جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

وَسُئِلَ (الْحَافِظُ بْنُ حَجَرٍ) هَلْ يُكْشَفُ لَهُ (اَيْ لِلْمَيِّتِ) حَتّٰى يَرَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَجَابَ: اَنَّهُ لَمْ يَرِدْ هٰذَا فِيْ حَدِيْثٍ وَّاِنَّمَا ادَّعَاهُ بَعْضُ مَنْ لَّا يُحْتَجُّ بِهٖ بِغَيْرِ مُسْتَنَدٍ سِوٰى قَوْلِهٖ هٰذَا الرَّجُلِ وَلَا حُجَّةَ فِيْهِ لِاَنَّ الْاِشَارَةَ اِلَى الْحَاضِرِ فِي الذِّهْنِ اِنْتَهٰى (شرح صدور/ ۶۰ مصر۔ اسی طرح ملاحظہ ہو مرقاۃ ۱/ ۳۴۰)

حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا: کیا میت کے لیے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ نبی کریم ﷺ کو دیکھتا ہے تو اُنھوں نے جواب دیا یہ بات کہ میت کے لیے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا ہے کسی حدیث میں مروی نہیں

ہے بعض لوگوں نے غیر مستند باتوں سے استدلال کیا ہے جو کہ قابل حجت نہیں۔
سوائے اِس قول ھذا الرجل کے اور اِس میں اِس کے متعلق کوئی دلیل نہیں۔
اِس لیے کہ ھذا اسم اشارہ یہاں ذہن کے لیے ہے۔
ھذا اِسم اشارہ سے استدلال درست نہیں کیونکہ حضور دو قسم کا ہوتا ہے ایک حضورِ ذہنی (تصوراتی) دوسرا حضورِ شخصی یہاں حضورِ ذہنی مُراد ہے شخصی نہیں۔
ملاحظہ ہو مرقاۃ ۱/ ۳۴۰۔
اِس کے علاوہ قرآنِ مجید اور کتب احادیث میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ ھذا اِسم اشارہ کو بعید کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جس کی طرف ھذا کا اشارہ ہو وہ پاس ہی موجود ہو قرآنِ مجید میں مذکور ہے کہ ملائکہ جب لوط علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کرنے کے لیے تشریف لائے تو پہلے ابراہیم علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے انہوں نے آمد کا سبب پوچھا تو وہاں فرشتوں نے کہا ﴿ اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلَ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴾ (۳۱ - ۲۹) ہم اِس بستی کے باشندوں کو ہلاک کرنے والے ہیں کیونکہ یہ ظالم ہیں۔ لوط علیہ السلام سدوم اور ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں تھے بستی سدوم پاس موجود نہیں تھی لیکن فرشتے ﴿ ھذہ ﴾ کا اشارہ کر کے کہتے ہیں کیونکہ سدوم ابراہیم علیہ السلام اور ملائکہ کے ذہن میں تھا۔
اسی طرح صحیح بخاری ۱/ ۴ مسلم ۲/ ۹۷ پر مروی ہے کہ ہرقل روم نے بیت المقدس میں جب سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا تو کہا کہ : ((اَيُّكُمْ اَقْرَبُ نَسَبًا بِهٰذَا الرَّجُلِ.))
تم میں سے اِس آدمی کے نسبی لحاظ سے کون زیادہ قریب ہے؟
اسی طرح اِس روایت میں آتا ہے کہ اِس نے کہا ((اِنِّي سَائِلٌ عَنْ هٰذَا الرَّجُلِ)) یعنی بیت المقدس میں جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق گفتگو ہوئی تو آپ کے لیے ((ھذا)) کا لفظ استعمال کیا گیا۔
اور بیت المقدس مدینہ سے تقریباً ۸۱۰ میل کے سفر پر موجود ہے تو لامحالہ یہ

تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں پر ((هٰذَا)) اسم اشارہ حضورِ شخصی کے لیے نہیں بلکہ حضورِ ذہنی کے لیے بولا گیا ہے کیونکہ آپ گفتگو کے وقت وہاں موجود نہ تھے۔

اسی طرح صلح حدیبیہ میں بدیل بن ورقاء مشرکین مکہ کی طرف سے شرائط صلح نامہ طے کرنے کے لیے سفیر بن کر آیا اور گفتگو کر کے واپس مکہ پہنچا تو اس نے کہا کہ:

((اِنَّا قَدْ جِئْنَا کُمْ مِنْ عِنْدِ هٰذَا الرَّجُلِ)) (بخاری ۱/ ۳۷۸)

"ہم تمہارے پاس اس آدمی سے ہو کر آئے ہیں۔"

سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جب آپ کی نبوت کا چرچا سنا تو تحقیق حال کے لیے اپنے بھائی کو بھیجا اور کہا:

((اِرْکَبْ اِلٰی هٰذَا الْوَادِیْ فَاعْلَمْ لِیْ عِلْمَ هٰذَا الرَّجُلِ.))

(بخاری ۱/ ۵۴۴، مسلم ۱/ ۲۹۷)

"تو اس وادی کی طرف سوار ہو مجھے اس آدمی کے بارے میں معلومات فراہم کر۔"

اِس قسم کی کئی اَمثلہ کتب احادیث میں موجود ہیں کہ هٰذَا اسم اشارہ کو بعید اور حضورِ ذہنی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طرح جو قبر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کیا جاتا ہے اور اِس میں لفظ هٰذَا مستعمل ہے وہ بھی حضورِ ذہنی کے لیے ہے جیسا کہ اُوپر حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔ (مجلّہ الدعوۃ' جون/ ۱۹۹۲ء)

خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا مسئلہ اور جمعرات کو رُوحوں کا گھروں میں آنا

س (۱): اکثر لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں ملتے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ نمازِ جمعہ کے بعد عصر تک عبادت کریں تو بشارت نصیب ہوتی۔

(۲) : کچھ کہتے ہیں کہ سارا دن یا رات عبادت کریں۔ پھر ایک تھال یا بڑے برتن میں دودھ والے چاول ڈال کر کسی پاک صاف کمرے میں رات بھر رکھ دیں۔ آنحضور ﷺ کا دست مبارک اگلی صبح چاولوں پر لگا ہوتا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا واقعی آنحضور ﷺ کی بشارت ہوتی ہے اور کیا دیگر انبیاء علیہم السلام کی بشارت بھی ہو سکتی ہے؟

(۳) : کہا جاتا ہے ہر جمعرات کی شب اپنے ورثاء کے گھروں میں مُردوں کی روحیں واپس آجاتی ہیں۔ اِن روحوں کے واپس آنے کی کیا حقیقت ہے؟

(عائشہ صدیقہ تنویر' شاہدرہ لاہور)

ج: خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہو سکتی ہے۔ صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس نے مجھے نیند میں دیکھا' اس نے یقیناً مجھ کو دیکھا کیونکہ شیطان میری شکل نہیں بن سکتا۔

اور صحیح بخاری میں ہی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا : جس نے مجھے خواب میں دیکھا' وہ مجھے بیداری میں دیکھے گا اور شیطان میری صورت نہیں بن سکتا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اِس حدیث کے ساتھ تعبیر کے مشہور تابعی امام محمد بن سیرین کی وضاحت نقل فرمائی ہے کہ یہ اِس وقت ہے جب وہ آپؐ کو آپؐ کی صورت میں دیکھے۔ فتح الباری میں ہے کہ جب کوئی شخص محمد بن سیرین سے بیان کرتا ہے کہ اِس نے نبی ﷺ کو دیکھا ہے تو وہ فرماتے کہ تم نے جسے دیکھا ہے' اُس کی شکل بیان کرو۔ اگر وہ ایسی صورت بیان کرتا جسے وہ نہ پہچانتے تو فرماتے' تم نے نبی ﷺ کو نہیں دیکھا۔

اِس لیے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو ہو تو اِس نے یقیناً رسول اللہ ﷺ کو ہی دیکھا کیونکہ شیطان آپؐ کی صورت اختیار نہیں کر سکتا اور چونکہ صحابی آپؐ کو پہچانتا بھی ہے' وہ یقین سے کہہ سکتا ہے

کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے۔ جس شخص نے آپ کو دیکھا ہی نہیں، وہ یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے؟ خود آپؐ کی زندگی میں اجنبی لوگوں کو آپؐ کی پہچان کے لیے بعض اوقات پوچھنا پڑتا تھا کہ آپؐ ہی رسول اللہ ﷺ ہیں؟

صحیح بخاری کتاب العلم میں اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ مَسجِد میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی اونٹ پر آیا۔ اُسے مَسجِد میں بٹھایا، اُس کا گھٹنا باندھا۔ پھر کہنے لگا تم میں محمدؐ (ﷺ) کون ہیں؟ نبی ﷺ صحابہ کے درمیان ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ ہم نے کہا یہ سفید تکیہ لگانے والے (محمد ﷺ) ہیں۔ پھر اُس نے آپؐ سے مخاطب ہو کر کئی سوالات کیے۔

سنن ابوداؤد کتاب السنہ باب فی القدر میں ابوذر رضی اللہ عنہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے درمیان بیٹھتے۔ کوئی اجنبی آتا تو پوچھنے کے بغیر معلوم نہ کر سکتا کہ آپؐ ان میں سے کون ہیں؟ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ہم آپؐ کے لیے بیٹھنے کی جگہ بنا دیتے ہیں تاکہ کوئی اجنبی آئے تو آپؐ کو پہچان لے تو ہم نے آپؐ کے لیے مٹی کا ایک چبوترہ سا بنا دیا تو آپؐ اِس پر بیٹھتے تھے اور ہم آپؐ کے اِردگرد بیٹھتے تھے۔

یہی حدیث سنن نسائی میں بھی صحیح سند کے ساتھ موجود ہے۔ (دیکھیے کتاب الایمان باب صفة الایمان والاسلام)

سیرت ابنِ ہشام میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ کے لیے ہجرت کر کے قبا پہنچے تو بنو عمرو بن عوف کے ہاں ٹھہرے۔ اِس موقعہ پر انصار کے جن لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نہیں دیکھا تھا، وہ اُن کو رسول اللہ ﷺ سمجھ کر سلام کرتے تھے۔ جب سایہ ہٹ گیا اور رسول اللہ ﷺ پر دھوپ پڑنے لگی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر کا آپؐ پر سایہ کیا۔ اِس وقت لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا۔ اِن احادیث سے معلوم ہوا کہ آپؐ کی زندگی میں جب آپؐ کو نہ پہچاننے والے کسی دوسرے کے

متعلق خیال کر سکتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہیں تو خواب میں بھی اِس کا امکان ہے۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ کوئی شخص اگر آپؐ کو اِس حلیہ میں دیکھے جو صحیح احادیث میں آیا ہے تو اُس نے آپؐ کو دیکھا ہے۔

لیکن اگر وہ کوئی اور صورت دیکھے یا کوئی ایسا شخص دیکھے جو اسے شریعت کے خلاف حکم دے رہا ہو یا ایسا کام کر رہا ہو جو نبی ﷺ کے شایانِ شان نہیں تو اسے رسول اللہ ﷺ کی زیارت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شیطان آپؐ کی شکل نہیں بن سکتا مگر یہ بات نہیں کی کہ وہ کسی اور شکل میں آ کر جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔ اِس دور کے شیطان مرزا دجال نے دعویٰ کیا تھا۔

منم مسیح و محمد کہ مجتبیٰ باشد

میں مسیح ہوں اور محمد مجتبیٰ ہوں

خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت حاصل کرنے کے لیے لوگوں نے بہت سے وظائف اور طریقے گھڑے ہیں جن کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ اِس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ خلوص دل سے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی جائے۔ اگر قبولیت کے خاص اوقات میں دُعا کی جائے تو اُمید اور زیادہ ہے۔ دوسرے انبیاء کی زیارت بھی اللہ تعالیٰ جسے کرانا چاہے، کرا سکتا ہے۔

- کسی بڑے برتن میں دودھ یا چاول وغیرہ ڈال کر صاف کمرے میں رکھنے سے اِس پر نبی ﷺ کے دست مبارک لگے ہونے کی بات بالکل فضول ہے اور بے دلیل ہے۔ قرآن و حدیث میں ایسی کوئی بات کہیں موجود نہیں۔
- جمعرات کو فوت شدہ لوگوں کی رُوحیں اپنے ورثاء کے گھروں میں واپس آنے کی بھی کوئی روایت ثابت نہیں۔ نہ ہی رُوحیں شب برأت کو واپس آتی ہیں۔ مُردے قیامت کے دن ہی قبروں سے نکلیں گے۔ (ع۔ م مجلّۃ الدعوۃ، جون / ۱۹۹۵ء)

کیا وہابی نبیؐ کی بڑے بھائی جتنی عزت کرتے ہیں؟

س (۱) : کیا وہابی گالی ہے؟ اگر نہیں تو بعض لوگ کیوں کہتے ہیں؟
(۲) : لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ توبہ نعوذ باللہ وہابی لوگ حضور ﷺ کی اتنی عزت کرتے ہیں بس جتنی بڑے بھائی کی۔ اِس بات کی کیا حقیقت ہے؟
(۳) : قرآنِ مجید میں کہاں آیا ہے کہ تراویح پڑھنی چاہئیں؟ (مصعب ایاز' لاھور)

ج ❶ سرزمین نجد و حجاز میں امام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے جب توحید خالص اور اتباع سنت کی دعوت دی اور اِس کے لیے عملی جہاد کیا تو اُس کی تکلیف سب سے زیادہ شرک و بدعت میں گرفتار لوگوں کو ہوئی۔ ہندوستان میں جب شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ اور ان کے ساتھیوں نے دعوت و جہاد کا علَم بلند کیا اور سکھوں اور انگریزوں کے خلاف لڑائی شروع کی تو انگریز نے انہیں وہابی کے نام سے بدنام کیا تاکہ لوگ جہاد میں اِن کا ساتھ نہ دیں ورنہ فی الحقیقت وہابی نہ کوئی مذہب ہے نہ فرقہ۔ دراصل جہاد کو بدنام کرنے کے لیے غیر مسلموں نے ہر دور میں کوئی نہ کوئی ہتھکنڈہ استعمال کیا۔ پہلے وہابی کہہ کر جہاد کو بدنام کیا جاتا تھا۔ آج انہی مجاہدین کو بنیاد پرست اور دہشت گرد کہہ کر لوگوں کو جہاد سے متنفر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

❷ یہ کہنا کہ وہابی لوگ حضور ﷺ کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی بڑے بھائی کی' سراسر غلط ہے اور اِس کی دلیل یہ ہے کہ ہم آپؐ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں اور آپؐ کی اطاعت اور اتباع کو فرض سمجھتے ہیں۔ بھلا کوئی اپنے بڑے بھائی کو بھی اللہ کا رسول مانتا ہے۔ سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔

❸ دین کے احکام جس طرح قرآن سے ثابت ہوتے ہیں' اسی طرح حدیث سے بھی ثابت ہوتے ہیں۔ اِس لیے تراویح کا ذکر احادیث میں آنا ہی اِس کے ثبوت کے لیے کافی ہے کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی اطاعت و اتباع کا حکم دیا ہے۔ ویسے قرآن مجید میں جہاں رات کے قیام کا ذکر آیا ہے' تراویح اِس میں

خود بخود شامل ہیں۔ (ع۔م مجلّۃ الدعوۃ' جون/ ۱۹۹۵ء)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اعزاء پر اعمال کا پیش ہونا

س کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے رشتہ داروں پر ہمارے اعمال پیش کیے جاتے ہیں؟ آپ کو روزنامہ جنگ کراچی ۱۷/ مئی بروز جمعہ ۱۹۹۶ء کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ اِس پر اِس کے متعلق درج کردہ روایات کے بارے میں وَاضح کریں۔ کیا یہ صحیح ہیں یا ضعیف۔ (محمد اسحٰق لیاری' کراچی)

ج عزیز مکرم نے روزنامہ جنگ ۱۷/ مئی بروز جمعہ ۱۹۹۶ء کی جو فوٹو اسٹیٹ ہمیں روانہ کی ہے اِس میں موٹی سرخی بعنوان "اعمال پیش ہونا" کے تحت مفتی صاحب نے ڈاڑھی منڈانے والوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "ڈاڑھی منڈانے والو تمہارے اعمال روزانہ فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حرکات دیکھ کر کتنا دکھ ہوگا۔" اِس پر مفتی صاحب نے کنز العمال ۵/ ۳۱۸ اور حلیہ الاولیاء ۶/ ۱۷۹ کا حوالہ دیا پھر مزید عزیز و اقارب کے سامنے اعمال پیش کرنے کی دلیل کے طور پر مسند احمد ۳/ ۱۶۵ اور مجمع الزوائد ۲/ ۲۲۸ کا حوالہ ذکر کیا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ ڈاڑھی منڈانا دین اسلام میں حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور عذابِ الیم کو دعوت ہے لیکن اِس ضمن میں اعمال پیش ہونے کے متعلق جو روایات پیش کی ہیں' وہ درست نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾

(الحج ۷۶ : ۲۲)

"اللہ تعالیٰ جو کچھ اِن کے سامنے ہے اُسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اِن سے اوجھل ہے اِس سے بھی واقف ہے اور سارے معاملات اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔"

یعنی کائنات میں کسی چھوٹے یا بڑے معاملے کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ کوئی دوسرا نہیں۔ اِس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ ۲۱۰' آل عمران ۱۰۹' سورہ حدید ۵ وغیرہ میں بیان کیا ہے اور صحیح مسلم کتاب البر والصلة باب النهي عن الشحناء والتهاجر کے تحت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((تُعْرَضُ الْاَعْمَالُ فِيْ كُلِّ يَوْمِ خَمِيْسٍ واثْنَيْنِ فَيَغْفِرُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِيْ ذَالِكَ الْيَوْمِ لِكُلِّ امْرِءٍ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا امْرَءً كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ : اُتْرُكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا اتْرُكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا)) (صحیح مسلم ۲/۳۱۷)

"ہر جمعرات اور سوموار کو تمام اعمال پیش کیے جاتے ہیں تو اِس دن اللہ تعالیٰ ہر اِس آدمی کو بخش دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتا سوائے اِس آدمی کہ جس کے درمیان اور اِس کے بھائی کے درمیان عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے اِن دونوں کو چھوڑ دیجیے۔ یہاں تک کہ صلح کر لیں۔"

سنن نسائی' ابوداؤد اور صحیح ابنِ خزیمہ میں حدیث ہے کہ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا : یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے مہینے میں جس قدر آپ روزے رکھتے ہیں' میں نے آپ کو اِس قدر کسی دوسرے مہینے میں روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا :

((ذَلِكَ شَهْرٌ يَغْفُلُ النَّاسُ عَنْهُ بَيْنَ رَجَبٍ وَّرَمَضَانَ وَهُوَ شَهْرٌ تُرْفَعُ الْاَعْمَالُ فِيْهِ اِلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فَاُحِبُّ اَنْ يُّرْفَعَ عَمَلِيْ وَاَنَا صَائِمٌ))

"یہ رجب اور رمضان کے درمیان ایسا مہینہ ہے جس سے لوگ غافل ہیں۔ یہ ایسا مہینہ ہے جس میں رب العالمین کی طرف اعمال کو اُٹھایا جاتا ہے میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل اِس حالت میں اُٹھایا جائے کہ میں روزہ دار ہوں۔"

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ سوموار اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "اِس دن اللہ کے ہاں اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ میں پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل پیش ہو تو میں روزے کی حالت میں ہوں۔"

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

((يُرْفَعُ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ.))

"رات کا عمل دن کے عمل سے پہلے اُٹھایا جاتا ہے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے۔"

اِن تمام احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے محدث شہیر مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری تحفۃ الاحوذی ۲/ ۵۵ پر رقمطراز ہیں:

هٰذَا لَا يُنَافِي قَوْلَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔ يُرْفَعُ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ۔ اَلْفَرْقُ بَيْنَ الرَّفْعِ وَالْعَرْضِ لِاَنَّ الْاَعْمَالَ تُجْمَعُ فِي الْاِسْبُوْعِ وَتُعْرَضُ فِيْ هٰذَيْنِ الْيَوْمَيْنِ فِيْ حَدِيْثِ مُسْلِمٍ تُعْرَضُ اَعْمَالُ النَّاسِ فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ مُؤْمِنٍ اِلَّا عَبْدٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اَنْظِرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا قَالَ اِبْنُ حَجَرٍ وَلَا يُنَافِي هٰذَا رَفْعَهَا فِيْ شَعْبَانَ فَقَالَ اِنَّهُ شَهْرٌ تُرْفَعُ فِيْهِ الْاَعْمَالُ وَاُحِبُّ اَنْ يُرْفَعُ عَمَلِي وَاَنَا صَائِمٌ لِجَوَازِ رَفْعِ اَعْمَالِ الْاُسْبُوْعِ مُفَصَّلَةً وَّاَعْمَالِ الْعَامِ مُجْمَلَةً۔

(سوموار اور جمعرات کو اعمال کا پیش کیا جانا) نبی ﷺ کے اِس حکم کے منافی نہیں جس میں ہے کہ رات کا عمل دن سے قبل اور دن کا عمل رات سے قبل اُٹھایا جاتا ہے۔ اِس لیے کہ رفع (یعنی اُٹھانے) اور عرض (یعنی پیش کیے جانے) میں فرق ہے۔ اِس لیے کہ پورے ہفتے میں اعمال جمع کیے جاتے ہیں اور اِن دونوں (سوموار اور جمعرات) میں پیش کیے جاتے ہیں۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ ہر جمعہ میں دو

مرتبہ سوموار اور جمعرات کو اعمال اللہ کے ہاں پیش کیے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ہر مومن کو بخش دیتا ہے سوائے اِن دو آدمیوں کے جن کی آپس میں عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اِن دونوں کو مؤخر کر دو یہاں تک کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: یہ احادیث اِس حدیث کے بھی خلاف نہیں جس میں ہے کہ اعمال شعبان کے مہینے میں اُٹھائے جاتے ہیں اور میں اِس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل روزے کی حالت میں اُٹھایا جائے۔ اِس لیے کہ جائز ہے ہفتے کے اعمال تفصیلاً اُٹھائے جاتے ہوں اور سال کے اعمال اجمالی طور پر شعبان میں اُٹھائے جاتے ہوں۔

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ ہمارے تمام اعمال اللہ کی طرف اُٹھائے اور پیش کیے جاتے ہیں جو اِن کی جزا و سزا کا مالک ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی مُتَصَرِّفُ الْأُمُور نہیں جس کے سامنے ہمارے اعمال پیش کیے جاتے ہوں۔ مسند احمد ۳/ ۱۶۵ کے حوالے سے جو روایت پیش کی گئی کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَعْمَالَکُمْ تُعْرَضُ عَلٰی اَقَارِبِکُمْ وَعَشَائِرِکُمْ مِنَ الْاَمْوَاتِ فَاِنْ کَانَ خَیْرًا اِسْتَبْشَرُوْا بِهٖ وَاِنْ کَانَ غَیْرَ ذَالِكَ قَالُوْا اللّٰهُمَّ لَا تُمِتْهُمْ حَتّٰی تَهْدِیَهُمْ کَمَا هَدَیْتَنَا.))

"تمہارے اعمال تمہارے عزیز و اقارب میں سے مرنے والوں پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر اعمال بہتر ہوں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر بہتر نہ ہوں تو وہ کہتے ہیں' اے اللہ تو اِن کو اِتنی دیر تک موت نہ دے جب تک انھیں ہماری طرح ہدایت نہ دے دے۔"

یہ روایت ضعیف ہے اِس لیے کہ اِس کی سند میں سفیان اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے درمیان مجہول راوی ہے۔

مفتی صاحب نے مسند احمد کے ساتھ مجمع الزوائد کا بھی حوالہ دیا ہے لیکن تعجب ہے کہ مفتی صاحب نے مجمع الزوائد کا حوالہ کوڈ کر دیا لیکن امام ہیثمی کی اِس روایت

پر جرح کو ہضم کر گئے ہیں۔ امام ہیثمی رحمہ اللہ مجمع الزوائد ۱/۳۳۱، ۳۳۲ پر یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رَوَاهُ اَحْمَدُ وَفِيْهِ رَجُلٌ لَّمْ يُسَمَّ۔

اِس کو احمد نے روایت کیا ہے اور اِس سند میں ایک آدمی ہے جس کا نام نہیں لیا گیا۔ اِس کے بعد امام ہیثمی نے اِس روایت کے مطابق ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کے بارے میں اشارہ کیا ہے اور ابو ایوب کی یہ روایت امام ہیثمی اِس بات سے پہلے والے باب میں لائے ہیں اور اِس کے بعد فرمایا: رواہ الطبرانی فی الکبیر (۱/ ۱۹۴/ ۲) والاوسط (۱/ ۷۲) وَفِيْهِ مسلمه بِنْ عَلِيِّ وَهُوَ ضَعِيْفٌ اِس روایت کو امام طبرانی المعجم الکبیر اور المعجم الاوسط میں لائے ہیں۔ اِس کی سند میں مسلمہ بن علی ضعیف راوی ہے۔ مسلمہ بن علی کے متعلق امام بخاری، امام ابنِ حبان اور امام ابوزرعہ رازی رحمہم اللہ فرماتے ہیں۔ یہ منکر الحدیث ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ میزان الاعتدال ۱/ ۶ پر راقم ہیں:

قَالَ الْبُخَارِيُّ كُلُّ مَنْ قُلْتُ فِيْهِ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ فَلَا تَحِلُّ الرِّوَايَةُ عَنْهُ ہر وہ شخص جس کے بارے میں میں یہ کہوں یہ منکر الحدیث ہے۔ اِس سے روایت بیان کرنا حلال نہیں۔ امام یعقوب بن سفیان فسوی نے اسے ضعیف الحدیث، امام جوزجانی، امام ازدی، امام نسائی، امام دارقطنی، امام برقانی نے متروک الحدیث، امام آجری نے ابوداؤد سے غیر ثقہ و غیر مامون نقل کیا ہے۔ امام حاکم نے کہا: يَرْوِيْ عَنِ الْاَوْزَاعِيِّ وَالزُّبَيْدِيِّ الْمَنَاكِيْرَ وَالْمُوْضُوعَاتِ۔

مسلمہ بن علی امام اوزاعی اور امام زبیدی سے منکر و موضوع روایتیں بیان کرتا تھا۔ تہذیب التہذیب ۵/ ۴۳۹، ۴۴۰ (۷۷۵۸) لہٰذا یہ روایت بھی انتہائی کمزور ہے۔

حلیۃ الاولیاء ۶/ ۱۷۹ اور کنز العمال ۵/ ۳۱۸ پر مروی روایت:

((اِنَّ اَعْمَالَ اُمَّتِيْ تُعْرَضُ عَلَيَّ فِيْ كُلِّ يَوْمِ جُمُعَةٍ وَاشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلَى الزُّنَاةِ.))

"سیدنا اَنس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہر جمعہ کو مجھ پر میری اُمت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ زنا کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب بہت سخت ہوتا ہے۔"

یہ روایت بھی انتہائی ضعیف ہے۔ اِس کی سند میں دو راوی مجروح ہیں۔ احمد بن عیسیٰ بن ماھان الرازی۔ یہ سیدنا علی کی فضیلت میں جھوٹی روایتیں بیان کرتا تھا اور عجیب و غریب روایات کو نقل کرتا تھا۔ محدثین نے اِس پر کلام کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ میزان الاعتدال ۱/ ۱۲۸ اور لسان المیزان ۱/ ۲۴۴۔

اِس روایت کا دوسرا راوی عباد بن کثیر بصری بھی متکلم فیہ ہے۔ ملاحظہ کیجئے تہذیب التہذیب وغیرہ۔

لہٰذا یہ روایت بھی قابل حجت نہیں۔ اِسی مضمون کی دو اور روایتیں سیدنا اَنس رضی اللہ عنہ سے منسوب ہیں۔ ایک روایت کو امام ابنِ عدی نے ۲/ ۱۲۴ پر نقل کیا ہے۔ اِس کی سند میں فراش بن عبداللہ ساقط الاعتبار ہے اور دوسری روایت میں محمد بن عبدالملک بن زیاط ابوسلمہ انصاری ہے جو من گھڑت اور جھوٹی روایتیں بیان کرتا ہے جسے امام ابنِ طاہر نے کذاب کہا ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سلسلة الاحادیث الضعیفة للالبانی (۹۷۵) ۲ / ۴۰۴ ـ ۴۰۶

لہٰذا یہ روزنامہ جنگ کے مفتی صاحب کی بیان کردہ روایات ضعیف اور ناقابل حجت ہیں جن سے استدلال کرنا کسی طرح بھی اہل عِلم کے لیے روا نہیں جبکہ قرآنِ مجید اور احادیث صحیحہ مرفوعہ سے یہ بات بالیقین درست ہے کہ تمام اعمال کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جو متصرف الامور، جزا و سزا کا مالک ہے۔ اِس کے علاوہ کوئی ہستی اسبابِ عالم سے بالاتر ہو کر متصرف الامور نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو متصرف الامور سمجھنا اور اعمال کو اِس کی طرف لوٹانے کا عقیدہ رکھنا قطعاً غلط اور باطل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کئی ایک ایسے واقعات ہوئے ہیں جو آپ

سے اوجھل رہے اور وہ اعمال آپؐ کے سامنے پیش نہیں کیے گئے جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ آپؐ کی مسجد کا ایک خادم (یا خادمہ) تھا جو وہاں صفائی کا انتظام سرانجام دیتا تھا۔ جب وہ فوت ہوا تو آپؐ کو بغیر اطلاع کیے اسے دفنا دیا گیا۔ چند روز بعد آپؐ نے اس کے متعلق دریافت کیا۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ وہ تو فوت ہو گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((اَفَلَا کُنْتُمْ آذَنْتُمُوْنِی۔ دُلُّوْنِی عَلٰی قَبْرِہٖ)) تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی۔ مجھے اس کی قبر پر رہنمائی کرو۔ مشکوٰۃ (۱۶۰۹) ۱/ ۵۲۳۔ اس حدیث صحیح سے معلوم ہوا کہ یہ سارا عمل رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر مخفی رہا۔ اگر آپؐ پر اعمال اُمت کو پیش کرنے والی بات درست ہوتی تو یہ معاملہ آپؐ پر کبھی بھی مخفی نہ رہتا۔ اسی طرح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو جب حدیبیہ کے موقعہ پر سفیر بنا کر بھیجا گیا تو ان کا معاملہ بھی آپؐ سے اوجھل رہا۔ لہٰذا جب آپؐ کی زندگی میں آپؐ پر اعمال پیش نہیں کیے گئے تو آپؐ کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ ہمارے اعمال آپؐ پر پیش کیے جاتے ہیں اور اعمالِ صالحہ دیکھ کر آپؐ خوش ہوتے ہیں اور اعمال سیۂ دیکھ کر آپؐ دُعا کرتے ہیں اور اسی طرح اعزاء و اقارب کے بارے میں ایسا عقیدہ درست نہیں ہے۔ (مجلّۃ الدعوۃ' جولائی/ ۱۹۹۶ء)

نبی ﷺ کی بیٹیوں (رضی اللہ عنہن) کی تعداد

س: کیا رسول اللہ ﷺ کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے صرف ایک بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں یا کہ زینب' رقیہ' اُم کلثوم رضی اللہ عنہن بھی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تھیں؟ قرآن و سنت اور شیعہ و سنی ہر دو مکتب فکر کی کتب سے وضاحت کر دیں۔ (محمد عباس' چکوال)

ج: رسول اکرم ﷺ کی ۲۵ برس کی عمر میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہوئی اور بعثت سے قبل سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے آپؐ کی تین بیٹیاں زینب' رقیہ' اُم کلثوم رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں اور بعثت کے بعد سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح آپؐ نے ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ سے کیا۔ رقیہ رضی اللہ عنہا اور اُم کلثوم

رضی اللہ عنہا کا نکاح بالترتیب آپ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا۔ تیسری صدی ہجری تک کسی بھی شخص نے آپ کی مذکورہ بالا چاروں بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کیا اور فریقین کی معتبر کتب میں اِن بنات کا تذکرہ موجود ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ایک غالی شیعہ ابوالقاسم علی بن احمد بن موسیٰ المتوفی ۳۵۲ھ نے اپنی بدنامِ زمانہ کتاب "الاسْتِغَاثَةُ فِیْ بِدَعِ الثَّلَاثَةِ" میں اِس بات کا انکار کیا اور کہا کہ یہ آپ کی حقیقی بیٹیاں نہیں تھیں بلکہ ربیبہ بیٹیاں تھیں حالانکہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح عتیق بن عائز مخزومی سے ہوا اور اِس سے ایک لڑکی ہندہ پیدا ہوئی۔ پھر اِس کے بعد دوسرا نکاح ابوھالہ تمیمی سے ہوا جس سے ایک لڑکا ہند اور ایک لڑکی ہالہ پیدا ہوئی اور اِس کے بعد پھر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ آپ سے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی چار بیٹیاں زینب' رُقیہ' اُم کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں۔ نسب کی یہ تفصیل کتاب نسب قریش ص ۲۳' ص ۲۲۸ کشف الغمة فی معرفة الائمة' عمدة الطالب فی انساب آل ابی طالب اور جمهرة الانساب وغیرہ میں موجود ہے۔ اِس سے معلوم ہوا سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اپنے پہلے خاوندوں سے زینب' رُقیہ اور اُم کلثوم (رضی اللہ عنہن) نامی کوئی بیٹی نہیں۔ یہ شیعہ کا دجل اور ان کی تلبیس ہے۔

لیکن شیعہ محدثین میں سے مشہور شیعہ عبداللہ مامقانی نے اپنی کتاب "تنقیح المقال" ص ۷۹ پر ابوالقاسم کوفی کی اِس بات کا رد کیا ہے۔ (تنقیح المقال شیعہ کے رجال پر بڑی معروف کتاب ہے۔)

چنانچہ عبداللہ مامقانی شیعہ نے ۷۹/ پر لکھا ہے:

"ابوالقاسم کوفی کا "الاستغاثة فی بدع الثلاثة" میں یہ قول کہ زینب اور رقیہ آپ کی بیٹیاں نہیں تھیں بلکہ ربیبہ تھیں۔ قولِ بلا دلیل ہے۔ یہ ابوالقاسم کی اپنے رائے محض ہے۔ جس کی حیثیت نصوص کے مقابلہ میں مکڑی کے جالے کے برابر بھی نہیں۔ کتب فریقین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیوں پر نصوص موجود ہیں

اور شیعوں کے پاس اپنے ائمہ کے اقوال موجود ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں۔"

یہ بات بھی یاد رہے کہ اکثر علمائے شیعہ نے ابوالقاسم شیعہ کی ہفوات پر نقد کیا ہے بلکہ اسے بے دین قرار دیا ہے جیسا کہ معروف شیعہ عالم شیخ عباس قمی نے "تتمہ المنتہٰی ص ۲۹ پر لکھا ہے۔"

"ابوالقاسم کوفی علی بن احمد بن موسی وفات یافت و اودر آخر عُمر مذہبش فاسد شدہ بود و کتابھا بسیار تالیف کردہ اند از کتابھائے ابوالقاسم کوفی کتاب الاستغاثة است۔"

"ابوالقاسم کوفی فوت ہوا تو آخر عُمر میں اُس کا مذہب فاسد ہوگیا تھا اور اِس نے کئی کتابیں تالیف کی ہیں۔ اِس کی کتابوں میں سے ایک کتاب "الاستغاثہ" بھی ہے۔

اسی طرح شیعہ عالم آقا میر نے "نقد الرجال ص ۲۲۶ پر لکھا ہے۔"

"اَبُوالْقَاسِم کُوْفِیٌّ رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ الْکُوْفَةِ کَانَ یَقُوْلُ مِنْ آلِ اَبِی طَالِبٍ وَغَلَا فِیْ آخِرِ عُمْرِهٖ وَفَسَدَ مَذْهَبُهٗ وَصَنَّفَ کُتُبًا کَثِیْرَةً اَکْثَرُهَا عَلَی الْفَسَادِ۔"

اِس سے معلوم ہوا کہ ابوالقاسم کوفی جو غالی شیعہ تھا اور کئی فساد پر مبنی کتابوں کا مصنف تھا اِس نے سب سے پہلے بنات الرسول ﷺ کا انکار کیا۔ پھر اِس کی پیروی میں بعد والے شیعوں نے انکار کیا حالانکہ قرآنِ مجید' کتب احادیث اور فریقین کی کتب سے یہ بات تواتر کی حد تک ثابت ہے کہ آپؐ کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے چار بیٹیاں تولد ہوئیں۔ اب نصوص ملاحظہ کریں :

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ ﴾ (الاحزاب : ۵۹)

"اے نبی (ﷺ) اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنے اُوپر اپنی بڑی چادریں لٹکا لیا کریں۔ یہ قریب تر ہے کہ وہ پہچانی جائیں۔ پس وہ ایذا نہ دی جائیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

اِس آیت کریمہ میں لفظ ازواج' زوجہ کی' بنات' بنت کی اور نساء' امراۃ کی جمع ہے اور جمع کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہے اور اِس آیت سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آپ کی بیٹیاں تین سے زائد تھیں اور فریقین کی کتب سے اِس بات کا تعین ہو جاتا ہے کہ آپؐ کی بیٹیوں کی تعداد چار ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں پردے کے احکام بیان کیے جا رہے ہیں اور احکامِ شرعیہ کا مُکلف بالغ ہوتا ہے' اِس سے معلوم ہوا کہ نزولِ آیت کے وقت آپؐ کی تین سے زائد بالغ بیٹیاں موجود تھیں جنہیں پردے کا حکم دیا گیا ہے۔

اہل سنت کے ہاں تو یہ بات متفقہ ہے کہ آپؐ کی چار صاحبزادیاں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں۔ اِس لیے اہل سنت کے حوالے نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ جو لوگ اِس بات کے منکر ہیں' ہم اُن کی معتبر کتابوں کے حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

❶ عبداللہ مامقانی شیعہ اپنی کتاب "تَنْقِيحُ الْمَقَالِ فِيْ اَحْوَالِ الرِّجَالِ" ص ۷۷ طبع نجف میں رقمطراز ہے:

اِنَّ كُتُبَ الْفَرِيْقَيْنِ مَشْحُوْنَةٌ بِاَنَّهَا وُلِدَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعُ بَنَاتٍ زَيْنَبُ وَ اُمُّ كُلْثُوْمٍ وفَاطِمَةُ و رُقَيَّةُ۔ وَبَنَاتُهٗ اَدْرَكْنَ الْاِسْلَامَ وَهَاجَرْنَ مَعَهٗ وَاتَّبَعْنَهٗ۔

بے شک فریقین کی کتب اِس بات سے بھری پڑی ہیں کہ آپؐ کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے چار بیٹیاں زینب' اُم کلثوم' فاطمہ اور رقیہ رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں اور اُنھوں نے اسلام کو پایا اور آپؐ کے ساتھ ہجرت کی اور آپؐ کی پیروی کی۔

❷ مشہور شیعہ محدث محمد بن یعقوب کلینی نے "اصول کافی" باب التاریخ

ص ۲۷۸ پر لکھا ہے:

"وَتَزَوَّجَ خَدِيْجَةَ وَهُوَ ابْنُ بِضْعٍ وَّعِشْرِيْنَ سَنَةً فَوُلِدَ لَهٗ مِنْهَا قَبْلَ مَبْعَثِهٖ الْقَاسِمُ وَرُقَيَّةُ وَزَيْنَبُ وَاُمُّ كُلْثُوْمٍ وَّوُلِدَ لَهٗ بَعْدَ الْمَبْعَثِ الطَّيِّبُ وَالطَّاهِرُ وَالْفَاطِمَةُ۔"

آپ نے ۲۵ برس کی عمر میں خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی اور خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بعثت سے پہلے آپ کے ایک بیٹا قاسم اور تین بیٹیاں رقیہ، زینب اور اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں اور بعثت کے بعد طیب، طاہر اور فاطمہ پیدا ہوئے۔

❸ شیخ صدوق نے اپنی کتاب "خصال" ۲/۱۸۶ پر لکھا ہے:

"وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا حُمَيْرَا فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى بَارَكَ فِي الْوَلُوْدِ فَاِنَّ خَدِيْجَةَ رَحِمَهَا اللّٰهُ وَلَدَتْ مِنِّي طَاهِرًا وَّهُوَ عَبْدُ اللّٰهِ وَهُوَ الْمُطَهَّرُ وَلَدَتْ مِنِّي الْقَاسِمَ وَفَاطِمَةَ وَرُقَيَّةَ وَاُمَّ كُلْثُوْمٍ وَّزَيْنَبَ۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے حمیرا (عائشہ رضی اللہ عنہا) بے شک اللہ تعالیٰ نے بچے دینے والی میں برکت رکھی ہے۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے مجھ سے طاہر کو جنم دیا اور وہ عبداللہ اور مطہر ہے اور اِس نے مجھ سے قاسم، فاطمہ، رقیہ، اُمِ کلثوم اور زینب (رضی اللہ عنہم) کو جنم دیا۔

اِس حوالہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی چار بیٹیوں کا اقرار کر رہے ہیں جو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہیں۔

❹ "مناقب" اِبن شہر آشوب ۱/۱۶۱ میں ہے:

"وَ اَوْلَادُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ خَدِيْجَةَ الْقَاسِمُ وعَبْدُاللّٰهِ وَهُمَا الطَّاهِرُ وَالطَّيِّبُ وَاَرْبَعُ بَنَاتٍ زَيْنَبُ وَرُقَيَّةُ وَاُمُّ كُلْثُوْمٍ وَّفَاطِمَةُ۔"

آپ کی خدیجہ سے اولاد قاسم اور عبداللہ (رضی اللہ عنہما) تھی اور وہ دونوں طاہر و طیب تھے اور چار بیٹیاں زینب، رقیہ، اُم کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن تھیں۔

❺ "تذکرۃ المعصومین" ص ۶ میں ہے:

تَزَوَّجَ خَدِيْجَةُ وَهُوَ ابْنُ بِضْعٍ وَّعِشْرِيْنَ سَنَةً فَوَلَدَتْ لَهُ قَبْلَ مَبْعَثِهِ رُقَيَّةَ وَاُمَّ كُلْثُوْمٍ وَّزَيْنَبَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُنَّ۔

جب رسول اللہ ﷺ کی عمر ۲۰ برس سے کچھ زائد تھی تو آپ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا اور بعثت سے پہلے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی تین بیٹیاں رُقیہ' اُمِ کلثوم اور زینب رضی اللہ عنہن تھیں۔

❻ شیعہ کی معروف ترین کتاب تحفۃ العوام / ۱۱۶ پر ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى رُقَيَّةَ بِنْتِ نَبِيِّكَ وَالْعَنْ مَنْ اٰذٰى نَبِيَّكَ فِيْهَا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اُمِّ كُلْثُوْمٍ بِنْتِ نَبِيِّكَ وَالْعَنْ مَنْ اٰذٰى نَبِيَّكَ فِيْهَا۔

اے اللہ اپنے نبی کی بیٹی رُقیہ رضی اللہ عنہا پر رحمت نازل فرما اور جس نے تیرے نبی (ﷺ) کو اِس بارے میں تکلیف دی' اُس کو لعنت کر۔ اے اللہ اپنے نبی (ﷺ) کی بیٹی اُم کلثوم رضی اللہ عنہا پر رحمت نازل فرما اور جس نے تیرے نبی (ﷺ) کو اِس کے بارے میں تکلیف دی اِس پر لعنت کر۔

اِس کے علاوہ شیعہ مذہب کی معتبر کتب حیاۃ القلوب' جلاء العیون' تہذیب الاحکام' الاستبصار' مراۃ العقول' فروع کافی' صافی شرح کافی' کشف الغمۃ' قرب الاسناد' مجالس المومنین' اعلام الوری' منتخب التواریخ' مناقب آل ابی طالب' امالی شیخ طوسی' رجال کشی اور انوار نعمانیہ وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے چار بیٹیوں کا ذکر موجود ہے۔

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ کی تحقیق

س لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (ترجمہ) : اے محمد اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو جہانوں کو ہی پیدا نہ کرتا۔ یہ روایت عام طور پر کئی علماء حضرات بیان کرتے ہیں اِس کی تحقیق درکار ہے۔ (ایک بندۂ خدا)

ج یہ روایت موضوع ہے جیسا کہ امام صنعانی نے اپنی کتاب الاحادیث الموضوعۃ ص (۵۲ رقم ۷۸ میں اور علامہ عجلونی نے کشف الخفاء ۲ / ۱۶۴ میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعۃ ۳۲۶ میں ذکر کیا ہے۔

ملا علی قاری کا یہ کہنا کہ حدیث کا معنی صحیح ہے اور اس کی تائید کے لیے دیلمی کی روایت یَا مُحَمَّدُ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْجَنَّةَ وَلَوْلَاكَ مَاخَلَقْتُ النَّارَ۔ اور ابنِ عساکر کی روایت لَوْلَاكَ مَا خَلَقْتُ الدُّنْيَا پیش کرنا حقیقت کے خلاف ہے۔

کیونکہ یہ روایات تب تائید میں پیش کی جا سکتی تھیں جب یہ پایہ ثبوت کو پہنچتیں جبکہ بلاشک و شبہ یہ روایات بھی ثابت نہیں۔ ابن عساکر والی روایت کو سیوطی اور ابن الجوزی نے موضوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح دیلمی والی روایت کو بھی علامہ ناصرالدین البانی حفظ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

قرآنِ مجید میں تو اللہ تعالیٰ نے جن و اِنس کی پیدائش کی حکمت بیان کی کہ :

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ (الذاریات : ۵۶)

”جن و انس کی پیدائش کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔“

گویا اِس مقصد کے علاوہ اللہ نے جن و اِنس کی پیدائش کا کوئی اور مقصد نہیں بتایا کہیں یہ ثابت نہیں کہ اللہ نے یہ سب کچھ اِس لیے پیدا کیا یا اس کے لیے پیدا کیا۔

پھر لطف کی بات ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اِس حدیث کو چُرا کر اپنی کتاب حقیقۃ الوحی کے صفحہ ۹۹ پر لکھا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے اِن الفاظ کے ساتھ مخاطب ہوا ہے لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ۔

سوچیے! ربِ کائنات کی تخلیق کی وہ حکمت تسلیم کی جائے گی جو قرآن میں ہے یا وہ جو اِس موضوع' من گھڑت اور جھوٹی روایت میں ہے؟

(ع - ع مجلۃ الدعوۃ' مارچ / ۱۹۹۵ء)

اُمِ کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما کا نکاح سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ سے

س: کیا اُمِ کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما کا نکاح حضرت عُمر رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا؟ ائمہ اہل سنت اور اہل تشیع کی کتب سے بادلائل ثابت کریں؟ (محمد اکرم۔ سرگودھا)

ج: سیدہ اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما جو کہ سیدہ فاطمۃ الزہراء بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی تھیں' بلاشبہ اُن کا نکاح حضرت عُمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ہوا اور یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس کا اعتراف فریقین محدثین و مؤرخین کو بغیر کسی تردد کے ہے اور ہر دو مکتب فکر کی معرکہ آراء کتب میں اِس کا ذکر موجود ہے۔ پہلے اہل سنت کے محدثین و مؤرخین کی تصریحات نقل کی جاتی ہیں' پھر شیعی محدثین و مؤرخین کے حوالہ جات درج کیے جائیں گے۔

((قَالَ ثَعْلَبَةُ بْنُ اَبِی مَالِكٍ اِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَسَمَ مُرُوْطًا بَیْنَ نِسَآءٍ مِّنْ نِّسَآءِ الْمَدِیْنَةِ فَبَقِیَ مِرْطٌ جَیِّدٌ فَقَالَ لَهٗ بَعْضُ مَنْ عِنْدَهٗ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَعْطِ هٰذَا بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الَّتِیْ عِنْدَكَ یُرِیْدُوْنَ اُمَّ كُلْثُوْمِ بِنْتَ عَلِیٍّ فَقَالَ عُمَرُ اُمُّ سَلِیْطٍ اَحَقُّ وَاُمُّ سَلِیْطٍ مِّنْ نِّسَآءِ الْاَنْصَارِ مِمَّنْ بَایَعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عُمَرُ فَاِنَّهَا كَانَتْ تَزْفِرُ لَنَا الْقِرَبَ یَوْمَ اُحُدٍ.))

(صحیح بخاری باب حمل النساء القرب الی الناس فی الغزو / کتاب الجہاد (۱/۴۰۳) و باب ذکر ام سلیط کتاب المغازی ۲/ ۵۸۲)

"ثعلبہ بن ابی مالک کہتے ہیں کہ سیدنا عُمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی عورتوں میں چادریں تقسیم کیں تو ایک عمدہ چادر بچ گئی۔ اُن کے پاس بیٹھنے والوں میں سے کسی نے کہا' اے امیرالمومنین! یہ چادر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی کو دیجئے یعنی اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما جو کہ سیدنا عُمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔ سیدنا عُمر رضی اللہ عنہ نے کہا اُم

سلیط زیادہ حقدار ہے وہ انصاری عورت تھیں۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے بیعت کی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ام سلیط جنگ اُحد کے دن ہمارے لیے مشکیں لادلاد کرلاتی تھیں۔"

شیخ الاسلام حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:

كَانَ عُمَرُ قَدْ تَزَوَّجَ أُمَّ كُلْثُومٍ بِنْتَ عَلِيٍّ وَّأُمُّهَا فَاطِمَةُ وَلِهٰذَا قَالُوْا لَهَا بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ قَدْ وُلِدَتْ فِيْ حَيَاتِهٖ وَهِيَ أَصْغَرُ بَنَاتِ فَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلَامُ۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری ۶/ ۷۹ کتاب الجہاد)

کہ سیدہ اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں اور اُن کی ماں فاطمہ بنت رسول ﷺ تھیں۔ اس لیے لوگوں نے اِن کو بنت رسول اللہ ﷺ کہا۔ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی پیدا ہوئی تھیں اور یہ سیّدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔

امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ و شارح بخاری حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی اِس تصریح سے واضح ہوا کہ سیدہ اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔

وُضِعَتْ جَنَازَةُ أُمِّ كُلْثُوْمٍ بِنْتِ عَلِيٍّ إِمْرَأَةِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَابْنٍ لَّهَا يُقَالُ لَهٗ زَيْدٌ وُضِعَا جَمِيْعًا وَالْإِمَامُ يَوْمَئِذٍ سَعِيْدُ بْنُ الْعَاصِ۔

اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما جو کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔ ان کا اور اِن کے بیٹے زید کا جناہ اکٹھا رکھا گیا اور اِس دن امام سعید بن عاص رضی اللہ عنہ تھے۔

امام ابنِ حزم جمہرۃ انساب العرب/ ۳۸، ۱۵۲ پر رقمطراز ہیں:

وَتَزَوَّجَ أُمَّ كُلْثُوْمٍ بِنْتَ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ بِنْتَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَوَلَدَتْ لَهٗ زَيْدًا لَمْ يُعْقِبْ وَرُقَيَّةَ۔

اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما جو کہ رسول اللہ ﷺ کی نواسی تھیں اِن سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا اور سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اِن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی رُقیہ پیدا

ہوئی۔

امام طبری نے اپنی کتاب تاریخ الامم والملوك ۲/ ۵۶۴ پر لکھا ہے کہ :

وَتَزَوَّجَ اُمَّ کُلْثُوْمٍ بِنْتَ عَلِيِّ بْنِ اَبِی طَالِبٍ وَاُمُّهَا فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَلَدَتْ لَهُ زَيْدًا وَّرُقَيَّةَ۔

اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما جن کی ماں فاطمہ بنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تھیں' سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا۔ اِس سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے۔

امام ابنِ عبدالبر نے الاستیعاب علی ھامش اصابہ ۴/ ۴۹۰ پر مذکورہ بالا عبارت کی طرح ہی لکھا ہے۔ ائمہ اہل سنت کی اِن تصریحات سے واضح ہوا کہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا تھا اور اِس سے زید اور رُقیہ پیدا ہوئے۔ اب شیعہ ائمہ کی تصریحات ملاحظہ کریں۔

سب سے پہلے ہم شیعہ کی معتبر کتاب کافی کی عبارت پیش کرتے ہیں جو ان کے ہاں بخاری شریف کے پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے اور بعض شیعی محدثین کی تصریح کے مطابق یہ وہ کتاب ہے جو محمد بن یعقوب کلینی "صاحب کافی" نے لکھنے کے بعد امام مہدی کے پاس غار میں پیش کی تو اُنہوں نے کہا :

هٰذَا كَافٍ لِشِيْعَتِنَا یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لیے کافی ہے۔

شیعہ کا ثقہ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی فروع کافی باب تزویج ام کلثوم کتاب النکاح ۵/ ۳۴۶ پر لکھتا ہے :

عَنْ اَبِی عَبْدِاللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِی تَزْوِيْجِ اُمِّ کُلْثُوْمٍ فَقَالَ اِنَّ ذٰالِكَ فَرْجٌ غُصِبْنَاهُ۔

امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ آپ سے اُم کلثوم کے نکاح کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے کہا یہ ایک رشتہ تھا جو ہم سے چھین لیا گیا۔

یہی مؤلف فروع کافی بَابُ الْمُتَوَفّٰى عَنْهَا زَوْجُهَا الْمَدْخُوْلُ بِهَا اَيْنَ تَعْتَدُّ وَمَا يَجِبُ عَلَيْهَا ۶/ ۱۱۵ کتاب الطلاق میں راقم ہے۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سِنَانٍ عَنْ اَبِی عَبْدِاللّٰهِ قَالَ سَاَلْتُهٗ عَنِ الْمَرْأَةِ الْمُتَوَفّٰی عَنْهَا زَوْجُهَا اَیْنَ تَعْتَدُّ فِیْ بَیْتِهَا اَوْ حَیْثُ شَآءَتْ؟ ثُمَّ قَالَ اِنَّ عَلِیًّا صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَیْهِ لَمَّا مَاتَ عُمَرُ اَتٰی اُمَّ كُلْثُوْمٍ فَاَخَذَ بِیَدِهَا فَانْطَلَقَ بِهَا اِلٰی بَیْتِهٖ۔

عبداللہ بن سنان امام صادق سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق سے مسئلہ دریافت کیا کہ جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے وہ عدت کہاں گزارے؟ اپنے شوہر کے گھر بیٹھے یا جہاں مناسب خیال کرے وہاں بیٹھے؟ تو آپ نے جواب دیا جہاں چاہے عدت گزار لے کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب فوت ہوئے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی ام کلثوم (بیوی عمر رضی اللہ عنہ) کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنے گھر لے گئے۔

فروع کافی ۶/ ۱۱۶ میں یہی روایت امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے بروایت سلیمان بن خالد بھی مروی ہے۔

شیعوں کے شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی نے اپنی کتاب تہذیب الاحکام میں فروع کافی سے اِن دونوں روایتوں کو اِسی طرح نقل کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ کتاب شیعوں کے ہاں صحیح مسلم کے پائے کی ہے۔

اسی طرح ابو جعفر محمد بن حسن طوسی نے اپنی دوسری کتاب الاستبصار ۳/ ۳۵۲ (جو کہ شیعوں کی صحاح اربعہ میں شمار ہوتی ہے) میں بھی اِس روایت کو درج کیا ہے۔

عَنْ جَعْفَرٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ مَاتَتْ اُمُّ كُلْثُوْمٍ بِنْتُ عَلِیٍّ وَابْنُهَا زَیْدُ بْنُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِیْ سَاعَةٍ وَّاحِدَةٍ لَّا یُدْرٰی اَیُّهُمَا هَلَكَ قَبْلُ وَلَمْ یُوَرَّثْ اَحَدُهُمَا مِنَ الْاٰخَرِ وَ صُلِّیَ عَلَیْهِمَا جَمِیْعًا۔ (تهذیب الاحكام كتاب المیراث ۹/ ۳۶۲، ۳۶۳)

امام جعفر صادق اپنے والد محمد باقر سے روایت کرتے ہیں کہ اُم کلثوم بنت علی اور اِس کا بیٹا زید بن عُمر بن خطاب دونوں ماں بیٹا ایک ہی وقت میں فوت ہوئے اور یہ علم نہ ہو سکا کہ دونوں میں سے پہلے کون فوت ہوا ہے اور اِن دونوں میں سے کوئی

بھی دوسرے کا وارث نہ بن سکا اور ان دونوں کی نمازِ جنازہ بھی اکٹھی پڑھی گئی۔

شیعہ فقہ کی معتبر کتاب شرائع الاسلام کی شرح ایک شیعی عالم سالک نے لکھی ہے وہ صاحب شرائع کے اِس قول يَجُوْزُ نِكَاحُ الْعَرَبِيَّةِ بِالْعَجَمِيِّ وَالْهَاشِمِيَّةِ وَبِالْعَكْسِ کے تحت لکھتا ہے:

زَوَّجَ عَلِيٌّ اِبْنَتَهٗ اُمَّ كُلْثُوْمٍ مِنْ عُمَرَ

عربی عورت کا عجمی مرد سے نکاح جائز ہے اور اسی طرح ہاشمیہ عورت کا غیرہاشمی مرد سے اور اِس کے بالعکس بھی جائز ہے اور اِس کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی اُم کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا تھا۔

کیا سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر فقیہ تھے؟

س فقہ حنفی کی وہ کونسی کتاب ہے جس میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ناسمجھ لکھا گیا ہے اور کیوں لکھا گیا ہے؟ لکھنے والے کا نام اور کتاب کا نام لکھیے؟

(عبدالستار، جھنگ شہر)

ج فقہ حنفی کو ماننے والے خواص و عام کی حالت یہ ہے کہ جب کسی صحابی کا فتویٰ یا قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے موافق ہو تو اُس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور اگر مخالف ہو تو غیر فقیہ و غیر مجتہد اور اعرابی کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ اِس لیے کہا گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

((لَا تَصُرُّوا الْإِبِلَ وَالْغَنَمَ وَمَنِ ابْتَاعَهَا فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ اَنْ يَحْتَلِبَهَا اِنْ رَضِيَهَا اَمْسَكَهَا وَاِنْ سَخِطَهَا رَدَّهَا وَصَاعًا مِّنْ تَمْرٍ.)) (بخاری، ۱۰۱۵)

"اونٹنی اور بکری کا دودھ روک کر نہ بیچو اور جو آدمی ایسا جانور خرید لے تو دودھ دوہنے کے بعد اس کی اپنی مرضی ہے اگر چاہے تو رکھ لے اور اگر چاہے تو اس کو واپس کردے اور ایک صاع کھجور کا بھی ساتھ دے۔"

حنفی کہتے ہیں کہ یہ حدیث قیاس کے خلاف ہے۔ ملا جیون حنفی نے نور الانوار ۱۷۹ میں لکھا ہے "فَاِنَّ هٰذَا الْحَدِيْثَ مُخَالِفٌ لِلْقِيَاسِ مِنْ كُلِّ وَجْهٍ" کہ اگر راوی عدالت اور ضبط کے ساتھ معروف ہو فقیہ نہ ہو جیسا کہ انس و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما ہیں تو اگر ان کی حدیث قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر قیاس کے خلاف ہوگی تو ضرورت کے تحت چھوڑ دیا جائے گا ورنہ ہر لحاظ سے رائے کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

بے شک یہ حدیث ہر لحاظ سے قیاس کے خلاف ہے کیونکہ یہ ایک صاع کھجور دودھ کے عوض دے رہا ہے۔ قیاس کا تقاضا ہے کہ دودھ کا تاوان دودھ سے ہی ادا کیا جائے یا اس کی قیمت سے اور اگر کھجور بدلہ ہو تو قیاس یہ چاہتا ہے کہ دودھ کی کمی بیشی کے لحاظ سے کھجور میں بھی کمی بیشی ہو نہ یہ کہ کمی اور بیشی کے ہر حال میں ایک صاع کھجور ضروری ہو۔

اس لیے حنفیوں نے کہا کہ اب ہم دیکھیں گے اس حدیث کا راوی کون ہے؟ اگر راوی فقیہ ہوا تو حدیث لی جائے گی اور قیاس کو ترک کیا جائے گا اور اگر راوی غیر فقیہ و غیر مجتہد ہوا تو قیاس کو مانا جائے گا اور حدیث کو چھوڑا جائے گا۔

احناف کا یہ قانون نور الانوار ۱۷۹، اصول شاشی ۷۵، الحسامی مع شرح النظامی ۷۵، اصول بزدوی ۱۵۹، التوضیح والتلویح / ۴۷۳، اصول سرخسی ۱ / ۳۴۱ اور مراۃ الاصول وغیرہ میں موجود ہے۔

احناف نے کہا اس حدیث کے راوی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ فقیہ نہیں اس لیے یہ حدیث متروک ہوئی۔ نور الانوار کی عبارت یہ ہے:

وَاِنْ عُرِفَ بِالْعَدَالَةِ وَالضَّبْطِ دُوْنَ الْفِقْهِ كَاَنَسٍ وَّاَبِيْ هُرَيْرَةَ اِنْ وَّافَقَ حَدِيْثُهُ الْقِيَاسَ عُمِلَ بِهٖ وَاِنْ خَالَفَهُ لَمْ يُتْرَكْ اِلَّا بِالضَّرُوْرَةِ لَا نُسَدُّ بَابُ الرَّائِيْ مِنْ كُلِّ وَجْهٍ۔

یہ حدیث صرف سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی نہیں بلکہ اس حدیث کو سیدنا

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی بیان کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی روایت کے بعد ان کا یہ فتویٰ درج کیا ہے اور مذکورہ بالا روایت کی وجہ سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر فقیہ ہیں تو حنفیوں کو چاہیے کہ وہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھی غیر فقیہ کہہ دیں۔ اِس کے علاوہ یہ حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مسند ابو یعلیٰ موصلی میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنن ابوداؤد اور طبرانی میں سیدنا عمرو بن عوف المزنی سے خلافیاتِ بیہقی میں اور رجل من اصحاب النبی سے تحفۃ الاحوذی ۲ / ۲۴۴ میں مروی ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی فتح الباری ۴ / ۳۶۵ پر رقمطراز ہیں کہ :

وَاَظُنُّ اَنَّ لِهٰذِهِ النُّكْتَةِ اَوْرَدَ الْبُخَارِيُّ حَدِيْثَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَقِبَ حَدِيْثِ اَبِي هُرَيْرَةَ اِشَارَةً مِنْهُ اِلٰى اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ قَدْ اَفْتٰى بِوَفْقِ حَدِيْثِ اَبِي هُرَيْرَةَ فَلَوْلَا اَنَّ خَبَرَ اَبِي هُرَيْرَةَ فِي ذٰلِكَ ثَابِتٌ لَمَا خَالَفَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ الْقِيَاسَ الْجَلِيَّ فِي ذٰلِكَ۔

مجھے یقین ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بعد سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اِس لیے نقل کی تاکہ معلوم ہو کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کے ساتھ فتویٰ دیا۔ اگر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ثابت نہ ہوتی تو ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ قیاسِ جلی کی مخالفت نہ کرتے اسی لیے اصولِ شاشی کا محشی صاحب احسن الحواشی چیخ اٹھا اور کہا: لٰكِنْ هٰهُنَا دِقَّةٌ قَوِيَّةٌ وَهِيَ اَنَّ هٰذَا الْحَدِيْثَ جَاءَ فِي الْبُخَارِيِّ بِرِوَايَةِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَيْضًا وَالْحَالُ اَنَّهُ مَعْرُوْفٌ بِالْفِقْهِ وَالْاِجْتِهَادِ احسن الحواشی ۷۴۔

یہاں دقت قوی یہ ہے کہ یہی روایت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے بخاری میں مروی ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ فقہ و اجتہاد میں معروف ہیں اسی لیے بعض حنفیوں نے اِس اصول سے جان چھڑانے کے لیے کہا کہ یہ قاضی ابو یوسف کے شاگرد عیسیٰ بن ابان کا قاعدہ ہے۔ مگر ان کی جان خلاصی اِس قانون سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ اولاً اس لیے کہ ان کے اصول کی معتبر کتابوں میں یہ قانون موجود ہے

جس کی بنا پر یہ حدیث مصراۃ کو رَد کرتے ہیں اور یہ قانون جہاں جہاں موجود ہے اِس کے حوالے میں نے اُوپر درج کر دیئے ہیں۔

ثانیاً : مولوی خلیل احمد سہارنپوری نے یہ بات تسلیم کی کہ ہمارے حنفی علماء کا ہی یہ قاعدہ وکلیہ ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کے حاشیہ ۱/ ۲۸۸ پر لکھتے ہیں :

"وَالاصْلُ عِنْدَنَا اَنَّ الرَّاوِی اِنْ کَانَ مَعْرُوْفًا بِالْعَدَالَۃِ وَالْحِفْظِ وَالضَّبْطِ دُوْنَ الْفِقْهِ وَالْاِجْتِهَادِ مِثْلُ اَبِی هُرَیْرَةَ وَاَنَسِ بْنِ مَالِكٍ فَاِنْ وَافَقَ حَدِیْثُهُ الْقِیَاسَ عُمِلَ بِهٖ وَاِلَّا لَمْ یُتْرَكْ اِلَّا لِضَرُوْرَةٍ وَانْسِدَادِ بَابِ الرَّاىِ وَتَمَامُهٗ فِیْ اُصُوْلِ الْفِقْهِ"

ہمارے نزدیک قاعدہ یہی ہے کہ اگر راوی عدالت حفظ اور ضبط میں تو معروف ہو لیکن فقاہت و اجتہاد کی دولت سے محروم ہو جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں تو اگر ان کی حدیث قیاس کے مطابق ہوگی تو عمل کیا جائے گا اور اگر قیاس کے خلاف ہوگی تو بوقت ضرورت چھوڑ دیا جائے گا تاکہ رائے و قیاس کا دروازہ بند نہ ہو اور اس کی مکمل بحث اصولِ فقہ کی کتب میں موجود ہے۔

حنفی علماء کا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہنا سراسر باطل ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے سیر اعلام النبلاء ۲/ ۶۱۹ پر لکھا ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حفظ حدیث اور اداءِ حدیث میں سب سے فائق تھے۔ اُنہوں نے حدیث مصراۃ بھی آپ ﷺ سے روایت کی ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم اِس پر عمل کریں۔

یہاں یہ بات ضرور یاد رہے کہ اصل صرف کتاب و سنت ہے اِس کے برعکس قیاس و فرع ہے۔ اصل کو فرع کے ساتھ رَد کرنا مردود و باطل ہے۔ اِس کے علاوہ یہ روایت قیاس کے بھی مطابق ہے۔ تفصیل کے لیے امام ابنِ قیم رحمہ اللہ کی اعلام الموقعین کا مطالعہ کیجیے۔ (مجلۃ الدعوۃ' نومبر/ ۱۹۹۳ء)

جِنّات میں توالد و تناسل کا بیان

س: کیا جِنّات میں شادی' بیاہ اور توالد و تناسل کا سلسلہ موجود ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں اِس کی وضاحت کیجئے۔ (محمد اکرم' میانوالی)

ج: شیاطین و جِنّات میں انسانوں کی طرح شادی و بیاہ اور مناکحت و توالد کا سلسلہ موجود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿ فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴾

(الرحمٰن : ۵۶)

"ان (نعمتوں) کے درمیان نیچی نگاہوں والیاں (حوریں) ہوں گی۔ جنہیں جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہو گا۔"

امام بغوی نے معالم التنزیل ۴ / ۲۷۵ پر لم یطمثهن کا معنی لکھا ہے کہ: لم یجامعھن کہ ان سے جِنّوں اور انسانوں نے کبھی بھی جماع نہیں کیا۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر انوار التنزیل و اسرار التاویل ۲ / ۴۵۶ پر لکھا ہے کہ:

وَفِيهِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ الْجِنَّ يَطْمِثُونَ۔

اِس آیت میں اِس بات پر دلیل ہے کہ جِنّ بھی جماع کرتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ انسانوں کی طرح جِنّوں میں بھی نکاح و جماع کا سلسلہ موجود ہے اور شیطان کی اولاد و ذریت کا تذکرہ بھی اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ﴾ (الکھف : ۵۰)

"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے لیے سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا وہ جِنّات میں سے تھا اِس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی

کی۔ کیا تم اِس کو اور اِس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارا دشمن ہے اور ظالموں کے لیے بُرا ہے بدلہ۔"

اِس آیت سے شیطان و جِنّات کی ذریت ثابت ہوئی۔ اسی طرح حدیث پاک میں آتا ہے کہ :

((عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ قَالَ : اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَ الْخَبَائِثِ.))

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو یہ دُعا پڑھتے :

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ.))

اِس حدیث میں خُبُثٌ' خَبِیْثٌ کی جمع ہے اور خَبَائِثُ' خَبِیْثَةٌ کی جمع ہے۔

امام محمد بن اسماعیل الصنعانی لکھتے ہیں کہ :

یُرِیْدُ بِالْاَوَّلِ ذُکُوْرَ الشَّیَاطِیْنِ وَ بِالثَّانِیْ اِنَاثَهُمْ۔ (سبل الاسلام ۱/ ۷۳)

کہ پہلے (خبث) سے مُراد مَرد شیاطین اور دوسرے (خبائث) سے مُراد شیاطین کی عورتیں ہیں۔

اِس حدیث اور مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ مَرد و عورت کا سلسلہ جِنّات میں بھی موجود ہے اور وہ ایک دوسرے سے مباشرت و مناکحت بھی کرتے ہیں جس سے ان کا سلسلۂ توالد قائم ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' اگست/ ۱۹۹۲ء)

عہدِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں کونسا فرقہ تھا؟

س: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کونسا مسلک تھا اور لوگ کس مسلک کے پابند تھے؟ اِس کی وضاحت کریں (مشتاق مجاہد' مانسہرہ)

ج: دورِ حاضر میں امت مسلمہ میں جو کھینچا تانی اور تفرقہ بازی' ضد و ہٹ

دھڑی اور شخصی نسبتیں اور تصوف کے مختلف سلسلے جیسے قادری، سہروردی، نقشبندی، سیفی، مجددی وغیرہ دھڑے بندیاں اور فقہی مسالک جیسے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری وغیرہ موجود ہیں۔ یہ سلسلے نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ مبارک اور عہدِ مسعود میں نہیں تھے۔ ان کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آج امت میں دو طرح کی گروپ بندیاں ہیں۔ ایک وہ فرقے جن میں الحاد گھسا ہوا ہے۔ یہ زیادہ تر منکرینِ حدیث ہیں اور قرآنی آیات کی بھی اپنی من پسند تاویل کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اپنے اپنے امام کی تقلید پر قائم ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ انسانیت کی راہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے تھے اور لوگوں کو صرف کتاب و سنت کی تعلیم دیتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْأُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ آیَاتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ ﴾ (الجمعه : ۲)

"اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھی میں سے مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"

اِس طرح کی کئی ایک آیات قرآنِ مجید میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ انسانیت کے لیے راہبر اور امامِ اعظم بنا کر بھیجے گئے تاکہ انسانیت کو ضلالت و گمراہی اور کفر و شرک سے نکال کر نورانیت اور رُشد و ہدایت کی طرف لائیں۔ بدعات اور رسوم و رواج سے ان کا تزکیہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کے پیارے اور آخری رسول ﷺ نے اِس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نصاب تعلیم کتاب و سنت رکھا۔ حکمت سے مُراد تقریباً تمام مفسرین نے سنت نبوی (ﷺ) لی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریق کار اور منہج دو چیزیں ہی تھیں۔ وہ قرآنِ مجید کے ساتھ ساتھ حدیثِ نبوی کو مدرسۂ عمل سمجھتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی سنت کو ترک

کرنا گمراہی و ضلالت سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں کوئی بھی شخص کسی دوسرے شخص کا مقلد نہیں تھا بلکہ وہ براہِ راست کتاب و سنت پر عمل پیرا تھے اور تقلید سے منع کیا کرتے تھے۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ :

"اَمَّا الْعَالِمُ فَاِنِ اهْتَدٰی فَلَا تُقَلِّدُوْہُ دِیْنَکُمْ۔"

عالم اگر راہِ راست پر بھی ہو تو اِس کی اپنے دین میں (ذاتی آراء کی) تقلید نہ کرو۔

ملاحظہ ہو (جامع البیان العلم ۲/۱۱۱)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ آپ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ملت پر ہیں؟ تو اُنہوں نے جواب دیا نہیں!

"وَلَا عَلٰی مِلَّةِ عُثْمَانَ اَنَا عَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔"

اور نہ ہی سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی ملت پر ہوں' میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت پر ہوں۔ (حلیۃ الاولیاء ۱/۳۲۹ مصنف عبدالرزاق ۱۱/ ۴۵۳)

معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مقلد نہ تھے بلکہ وہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لیے مشعل راہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح تابعین' تبع تابعین' ائمہ مجتہدین اور محدثین تقلید سے منع کیا کرتے تھے اور کتاب و سنت کی پیروی کا حکم دیا کرتے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ ابنِ تیمیہ ۲۰/ ۱۰' ۲۱۱ وغیرہ۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق چوتھی صدی ہجری سے پہلے لوگ کسی خاص مذہب کے مقلد نہ تھے۔ فرماتے ہیں :

"اِعْلَمْ اَنَّ النَّاسَ کَانُوْا قَبْلَ الْمِائَةِ الرَّابِعَةِ غَیْرَ مُجْتَمِعِیْنَ عَلَی التَّقْلِیْدِ الْخَالِصِ لِمَذْهَبٍ وَّاحِدٍ بِعَیْنِهٖ۔"

واضح رہے کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے کسی خاص مذہب کی تقلید پر لوگوں کا اجماع نہیں تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ مترجم ۱/۳۴۷)

معلوم ہوا کہ فرقہ بندیاں' شخصی نسبتیں اور مختلف مکاتب فکر جس طرح آج

امت مسلمہ میں پائے جاتے ہیں' عہدِ نبوی ﷺ اور عہدِ صحابہ میں اِس کا وجود نہیں تھا۔ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے تمام مسائل میں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرے اور کسی بھی فرقے کا پابند نہ ہو۔ صرف اور صرف اللہ اور اِس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے کو ہی اپنے لیے کامیابی کی راہ تصور کرے۔

ہاں! البتہ کوئی گروہ اگر اسی بیان کردہ مسلک یعنی صرف کتاب و سنت پر چل رہا ہے اور امتیاز کے لیے کوئی بھی اچھا نام اِس کا مشہور ہو گیا ہے' چاہے وہ اہلسنت کہلاتے ہوں' اہلحدیث' سلفی یا انصار السنة تو ایسے لوگوں کو نہ تو فرقہ کہا جائے گا اور نہ ان کے ساتھ وابستگی غلط ہوگی کیونکہ فرقہ وہ ہوتا ہے جو اپنے اصل سے ہٹ جائے اور جو اصل پر قائم ہو' وہ فرقہ نہیں ہوتا اور اگر کسی فرقہ کی نسبت ہی غلط ہو' وہ کسی شخصیت اور امام کی طرف منسوب ہو جیسے حنفی' شافعی' مالکی' قادری' چشتی وغیرہ تو یہ شخصی نسبتیں اسلام میں جائز نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی گروہ علاقے کی طرف منسوب ہو تو علاقائی نسبت اختیار کرنا بھی اسلام میں جائز نہیں جیسے بریلوی' دیوبندی وغیرہ۔ امتیازی نسبت بھی صرف وہی ہونی چاہیے جو اسلام کے صحیح مسلک کو ظاہر کرتی ہو۔ اوّل تو بات یہ ہے کہ ہماری بڑی نسبت مسلمان کہلانا ہے اور یہ امتیازی نسبتیں اختیار کرنے کی مجبوری ہوتی ہے جہاں اسلام کا نام لینے والے بہت سے فرقے موجود ہوں یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ سب فرقے صرف مسلمان کہلائیں اور ان کی کوئی اضافی نسبت نہ ہو۔ اگر کوئی گروہ اپنی اضافی نسبت نہیں اختیار کرے گا تو لوگ خود ہی پہچان کے لیے الگ الگ عقائد و نظریات کے لوگوں کو کوئی نہ کوئی نام دے لیں گے اور عملاً بھی یہی صورتِ حال ہے کہ جو لوگ صرف مسلمان کہلانے کے عادی تھے' لوگوں نے پہچان کے لیے ان کے نام رکھ دیئے۔ کوئی پرویزی کہلاتا اور کوئی مسعودی۔ اسلام کا نام لینے والی دنیا میں ایک بھی ایسی جماعت نہیں جس کا مخصوص امتیازی نام نہ ہو۔ اِس لیے ہمارا حق یہ ہے کہ صرف کتاب و سنت پر چلیں اور ایسے گروہ کے ساتھ چلیں جو اسی مسلک کا حامل ہو۔

(مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۶ء)

ترجمہ پڑھنے کا اجر

س کیا ترجمہ پڑھنے کا ثواب ملتا ہے یا صرف ثواب تلاوت کا ہی ملتا ہے؟

ج اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کو سمجھ کر پڑھنے کا حکم دیا ہے:

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ (محمد : ۲۴)

"پس! کیا وہ غور نہیں کرتے قرآن میں یا دلوں پر اُن کے قفل لگ رہے ہیں۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ.)) (مشکوٰۃ کتاب العلم)

"اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرنا چاہتا ہے اِس کو دین میں سمجھ دے دیتا ہے۔"

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

"اللہ جسے چاہے دین کی باتوں میں عقل اور سمجھ دے دیتا ہے اور جسے سمجھ عنایت ہوئی، اسے بڑی نعمت مل گئی اور نصیحت قبول کرنا صرف عقلمند کا کام ہے۔"

(البقرہ : ۲۶۹)

حدیث میں ہے:

"عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے جیسے چودھویں کے چاند کی فضیلت ستاروں پر۔"

(مشکوٰۃ کتاب العلم)

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ دین میں سمجھ بوجھ اور بصیرت حاصل کرنے کی فضیلت ملتی ہے۔ اگر قرآن کی تلاوت کے علاوہ ترجمہ پڑھنے اور دین میں بصیرت حاصل کرنے کا ثواب نہ ہوتا تو یہ فضیلت علماء کو بھی حاصل نہ ہوتی۔ البتہ صرف ترجمہ پڑھنے کو قرآن کی تلاوت قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ ترجمہ پڑھنے کا ثواب اپنی جگہ اور تلاوت کا ثواب اپنی جگہ ہے۔

(از : ر۔ ر، مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۶ء)

قرآنِ میں لفظ شیعہ؟

س شیعہ اپنے مذہب کی صداقت کی یہ دلیل دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے ﴿ وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ ﴾ کہ نوح علیہ السلام کے شیعوں میں سے ابراہیم علیہ السلام بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ اِس آیت سے معلوم ہوا' ابراہیم علیہ السلام بھی شیعہ تھے۔

قرآن و سنت کی رُو سے واضح کریں کہ مندرجہ بالا آیت کا کیا مطلب ہے؟ کیا لفظ شیعہ قرآن میں کسی خاص فرقے کے لیے استعمال کیا گیا ہے؟ (ناصر' پھالیہ)

ج لفظ شیعہ کا معنی گروہ اور فرقہ ہے۔ قرآنِ مجید میں لفظ شیعہ کسی خاص مذہب کے لیے مستعمل نہیں ہوا۔ شیعہ حضرات کا اپنے مذہب کی حقانیت کے لیے مندرجہ بالا آیت کو پیش کرنا قطعاً درست نہیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہ جو لفظ استعمال کیا گیا ہے' اِس کا معنی گروہ ہے نہ کہ موجودہ شیعہ۔ آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام' سیدنا نوح علیہ السلام کے گروہ سے تھے۔ یعنی جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے' اسی طرح ابراہیم علیہ السلام بھی نبی تھے۔

قرآنِ مجید نے جہاں پر ابراہیم علیہ السلام کے دین کا ذکر کیا ہے' وہاں یوں ارشاد فرمایا ہے :

﴿ مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ﴾

(اٰلِ عمران : ٦٧)

"ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی لیکن وہ تو یک سو مسلم تھے۔"

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کا دین بیان کرتے ہوئے ﴿ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ﴾ کہا ہے۔ اگر وہ مذہباً شیعہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے : مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ كَانَ شِیْعَةً۔ لیکن قرآن میں اِس طرح مذکور نہیں۔

قرآنِ مجید میں اکثر و بیشتر مواقع پر لفظ شیعہ' شریروں' فسادیوں اور فتنہ بازوں

کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

❶ ﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ (الحجر ۱۰ : ۱۱)

"البتہ ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول اگلے شیعوں میں بھیجے اور ان کے پاس کوئی بھی رسول نہیں آیا مگر وہ ان سے مذاق کرتے تھے۔"

اگر لفظ شیعہ سے مراد شیعہ فرقہ ہے تو پھر اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسولوں کے ساتھ مذاق کرنے والے شیعہ تھے۔ اِس آیت کی تفسیر میں شیعہ مفسر عمار علی نے اپنی تفسیر عمدۃ البیان ۲ / ۱۷۴ پر لکھا ہے :

"یہاں شیعہ سے مراد وہ کافر ہیں جو رسولوں کے ساتھ ٹھٹھہ و مذاق کرتے تھے۔"

❷ ﴿ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ﴾ (الانعام : ۶۵)

"کہہ دیجئے اللہ تعالیٰ اِس بات پر قادر ہے کہ تمھیں اُوپر سے عذاب بھیج دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تم کو شیعہ بنا کر آپس میں لڑا دے۔"

اگر لفظ ﴿ شِيَعًا ﴾ سے شیعہ فرقہ مراد ہے تو ان کے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

اِس آیت کے متعلق شیعہ مفسر عمار علی نے عمدۃ البیان ۱/ ۳۵۳ پر لکھا ہے

"اس آیت میں لفظ ﴿ شِيَعًا ﴾ شریروں، فسادیوں اور فتنہ بازوں پر بولا گیا ہے۔"

❸ ﴿ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا ﴾ (القصص : ۴)

"بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور وہاں کے رہنے والوں کو شیعہ بنا دیا۔"

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو شیعہ بنانے والا فرعون تھا۔

● ﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا ﴾ (الروم ۳۲: ۳۱)

"اور نماز قائم کرو اور مشرکوں سے نہ بنو جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تھے وہ شیعہ۔"

اِس آیت کی تفسیر میں شیعہ مفسر نے عمدۃ البیان ۳ / ۱۴۳ میں لکھا ہے:

"اس آیت میں شیعہ..... مشرکوں' بت پرستوں' دشمنانِ دین اور یہود و نصاریٰ کو کہا گیا ہے۔"

● ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ ﴾ (الانعام: ۱۶۰)

"بے شک وہ لوگ جنہوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور شیعہ ہو گئے' ان سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔"

اِس آیت نے صراحت کر دی کہ اللہ کے رسول ﷺ کا شیعوں سے کوئی تعلق نہیں۔ جس فرقہ سے اللہ کے رسول ﷺ کا کوئی تعلق نہ ہو' اِس کے گمراہ ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں لفظ شیعہ گروہ بندی کے معنی میں ہے۔ اگر لفظ شیعہ سے خاص فرقہ مراد لیں تو خود سمجھ لیں کہ مذکورہ بالا پانچ آیات میں شیعہ کسے کہا گیا ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' ستمبر ۱۹۹۳ء)
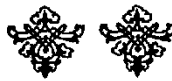
كتاب

الطَّهَارَةِ

نماز میں وضو کا ٹوٹنا

س: نماز کے دوران اگر کسی کا وضو ٹوٹ جائے تو کیا اُس پر نماز چھوڑ کر وضو کرنا لازمی ہے؟ اِس طرح اگر امام کا وضو ٹوٹ جائے تو وہ کیا کرے؟ نماز چھوڑ کر وضو کرنا پڑے گا یا کہ وہ نماز کو پورا کرے گا؟ (محمد شریف' کھڈیاں خاص ضلع قصور)

ج: نماز کے لیے وضو کا ہونا شرط ہے۔ جب وضو ٹوٹ جائے تو نمازی کو نماز چھوڑ کر چلے جانا چاہیے اور نئے سرے سے وضو کر کے نماز ادا کرنی چاہیے۔ اگر امام ہے تو پیچھے سے کسی کو آگے کھڑا کر کے چلا جائے اور نئے سرے سے وضو کر کے نماز ادا کرے اور یہ بھی یاد رہے کہ نماز ابتداء سے شروع کرے نہ کہ جہاں سے چھوڑی تھی۔ سیدنا علی بن طلق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا فَسَا اَحَدُكُمْ فِيْ الصَّلَاةِ فَلْيَنْصَرِفْ وَلْيَتَوَضَّا وَلْيُعِدِ الصَّلَاةَ.))

"جب تم میں سے کوئی آدمی نماز میں اپنی ہوا خارج کرے تو وہ واپس جا کر وضو کرے اور نماز دوبارہ پڑھے۔" یہ حدیث حسن ہے۔ ترمذی (۱۱۶۴' ۱۱۶۶' ۱۱۶۶) ابوداوٗد (۲۰۵) عبدالرزاق ۱/ ۱۳۹' ابنِ حبان (۲۰۳' ۲۰۴' ۲۰۴) دارقطنی ۱/ ۱۵۳۔

علماء احناف کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ اگر نمازی کا وضو ٹوٹ جائے تو وہ چلا جائے اور وضو کر کے آئے اور اگر اِس نے نماز کے منافی کوئی حرکت نہیں کی تو جہاں سے نماز چھوڑی تھی' وہیں سے ابتداء کرے۔ نئے سرے سے نماز ادا نہ کرے اور اِس کی دلیل میں وہ یہ روایت پیش کرتے ہیں:

((عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَصَابَهُ قَيْءٌ اَوْ رُعَافٌ اَوْ قَلْسٌ اَوْ مَذِيٌّ فَلْيَنْصَرِفْ ثُمَّ لِيَبْنِ عَلٰى صَلَاتِهٖ وَهُوَ فِيْ ذٰلِكَ لَا يَتَكَلَّمُ))

(ابنِ ماجہ (۱۲۲۱) دارقطنی ۱/ ۱۵۳' ۱۵۵)

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جسے قے یا نکسیر یا پیٹ کا کھانا یا مذی آ جائے' وہ پھر جائے' وضو کرے اور اپنی نماز پر بنا کرے بشرطیکہ اِس نے اِس دوران کلام نہ کیا ہو۔"

یہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بلوغ المرام میں فرمایا ہے ضَعَّفَهُ اَحْمَدُ وَغَيْرُهُ اِس حدیث کو امام احمد وغیرہ نے ضعیف کہا ہے۔ لہٰذا اِس روایت سے استدلال درست نہیں ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ نئے سرے سے وضو کر کے ابتداء سے نماز پڑھی جائے کیونکہ وضو نماز کے لیے شرط ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۴ء)

غسل جمعہ کے بعد وضو کرنا؟

س: کیا غسل جمعہ کرنے کے بعد وضو کرنا ضروری ہے؟

ج: اگر وضو کر کے غسل کیا ہے تو پھر دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں بشرطیکہ شرمگاہ کو ہاتھ نہ لگے کیونکہ شرمگاہ کو ہاتھ لگنے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَا تُقْبَلُ صَلٰوةُ مَنْ اَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّاَ.))

(متفق علیہ مشکوٰۃ باب ما یوجب الوضو)

"بے وضو نماز قبول نہیں ہوگی یہاں تک کہ وضو کرے۔"

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا مَسَّ اَحَدُكُمْ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّاْ)) (مشکوٰۃ ص ۴۱)

"جب تم میں سے کوئی اپنی شرمگاہ کو چھوئے تو وضو کرے یا کسی اور وجہ سے وضو ٹوٹ جائے تو وضو کرنا پڑے گا۔" (از: ر۔ر' مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۶ء)

ٹخنوں سے نیچے شلوار لٹکانا

س: وضو کرنے کے بعد اگر شلوار ٹخنوں سے نیچے چلی جائے تو کیا اس سے

وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔ (محمد آصف' واہ کینٹ)

ج چادر یا شلوار کا ٹخنے سے نیچے لٹکانا شدید گناہ ہے اور حدیث میں وارد ہے کہ:

((مَا اَسْفَلَ مِنَ الْکَعْبَیْنِ مِنَ الْاِزَارِ فِی النَّارِ.))

یعنی کپڑے کا وہ حصہ جو ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہے وہ آگ میں ہے۔"

ایک حدیث میں آتا ہے:

((مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَیْهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ.))

(ابو دائود ۲۸۶' کتاب اللباس)

"جو شخص اپنا کپڑا غرور و تکبر سے لٹکائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر نہیں کرے گا۔"

اسی طرح حدیث میں آتا ہے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر کے ڈھلکنے کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپ نے فرمایا:

((اِنَّكَ لَسْتَ مِمَّنْ یَصْنَعُ ذَالِكَ خُیَلَاءَ.)) (نسائی' ۵۳۳۴)

"تو ان لوگوں میں سے نہیں جو اس فعل کو تکبر سے کرتے ہیں۔"

اور یہ بھی یاد رہے کہ آپ نے کپڑے کا ٹخنوں سے نیچے جانے کو فرمایا ((فَاِنَّھَا مِنَ الْمَخِیْلَةِ)) (نسائی) یہ تکبر سے ہے۔ مذکورہ بالا روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مرد کے لیے کپڑا ٹخنے سے نیچے لٹکانا شدید ترین جرم ہے اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ نے خود مستثنیٰ قرار دیا۔ لیکن کسی بھی فقیہ محدث نے کتب حدیث کے تراجم و ابواب میں اس کو نواقض وضو میں شمار نہیں کیا اور اس ضمن میں جو روایت سنن ابوداؤد میں آتی ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو اس حالت میں نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کا کپڑا ٹخنوں سے نیچے تھا تو آپ نے اسے حکم دیا ((اِذْھَبْ فَتَوَضَّا)) جا اور وضو کر۔ یہ روایت صحیح نہیں اس کی سند میں ابو جعفر غیر معروف راوی ہے۔ امام منذری نے مختصر سنن ابی داوٗد ۳۲۴/۱ اور علامہ شوکانی نے نیل

الاوطار ۳/۱۱۸ میں لکھا ہے کہ :

وَفِيْ إِسْنَادِهٖ أَبُوْ جَعْفَرٍ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ لَا يُعْرَفُ اسْمُهٗ

اِس حدیث کی سند میں اہل مدینہ سے ایک راوی ہے جس کا نام معروف نہیں اور مشکوٰۃ المصابیح پر تعلیق لکھتے ہوئے علامہ البانی حفظہ اللہ نے لکھا ہے کہ :

وَإِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ فِيْهِ أَبُوْ جَعْفَرٍ وَعَنْهُ يَحْيٰى بْنُ أَبِيْ كَثِيْرٍ وَهُوَ الْأَنْصَارِيُّ الْمَدَنِيُّ الْمُؤَذِّنُ وَ هُوَ مَجْهُوْلٌ كَمَا قَالَ ابْنُ الْقَطَّانِ وَفِي التَّقْرِيْبِ أَنَّهٗ لَيِّنُ الْحَدِيْثِ فَقُلْتُ مَنْ صَحَّحَ إِسْنَادَ الْحَدِيْثِ فَقَدْ وَهَمَ۔ (مشکوٰۃ ۱/۲۳۸)

یعنی اِس حدیث کی سند ضعیف ہے اِس میں راوی ابو جعفر ہے۔ اِس سے بیان کرنے والا یحییٰ بن ابی کثیر ہے اور وہ انصاری مدنی مؤذن ہے جو کہ مجہول ہے جس طرح ابن القطان نے کہا ہے اور تقریب میں ابنِ حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ اِس کی حدیث کمزور ہے۔ علامہ البانی حفظہ اللہ کہتے ہیں کہ جس نے اِس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اسے وہم ہوا ہے۔

لہٰذا جب یہ روایت کمزور ہے اور کسی محدث نے اسے نواقض وضو میں شمار نہیں کیا تو جس آدمی کا کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہو جائے اِس کا وضو نہیں ٹوٹتا البتہ یہ جرم ضرور ہوگا جس کی وعید احادیث میں مرقوم ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۳ء)

بغیر وضو قرآن کی تلاوت کرنا کیسا ہے؟

س وضو کے بغیر قرآنِ مجید کی تلاوت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ ایک حدیث میں آتا ہے ((لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرًا)) "قرآن کو طاہر کے سوا کوئی نہ چھوئے" قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

ج بے وضو قرآنِ مجید کی تلاوت کر سکتا ہے کیونکہ کوئی ایسی صریح اور صحیح حدیث موجود نہیں ہے جس میں بے وضو آدمی کو قرآنِ مجید کی تلاوت سے روکا گیا ہو اور قرآنِ مجید کی تلاوت کا حکم خود قرآنِ مجید میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾

"کہ جو قرآن مجید سے میسر ہو' پڑھو۔"

اِس میں یہ نہیں کہ وضو کے بغیر نہ پڑھو۔ جو حدیث آپ نے پیش کی ہے یہ حدیث بمجموع طرقہٖ صحیح ہے کہ طاہر کے سوا قرآن مجید کو کوئی نہ چھوئے۔ اس کی تفسیر بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت میں آئے جن میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مجلس سے نکل گئے۔ جب مجلس میں واپس آئے تو سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ((سُبْحَانَ اللّٰہِ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا یَنْجُسُ)) کہ مومن نجس نہیں ہوتا یعنی طاہر ہی رہتا ہے۔ اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ ((اِلَّا طَاھِرًا)) سے مراد الا مومن ہے یعنی کافر قرآن مجید کو نہ چھوئے' مومن چھو سکتا ہے خواہ وہ باوضو ہو یا بے وضو۔

صحیح بخاری شریف میں ہی ایک حدیث ہے جسے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں۔ اِس حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سوئے ہوئے تھے جب اُٹھے تو اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے صاف کیا اور پھر:

((قَرَأَ الْعَشْرَ الْاٰیَاتِ الْخَوَاتِمِ مِنْ سُوْرَۃِ آلِ عِمْرَانَ ثُمَّ قَامَ اِلٰی شَنٍّ مُعَلَّقَۃٍ فَتَوَضَّأَ مِنْھَا فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ قَامَ یُصَلِّی.))

(صحیح بخاری مع الفتح ۱/۳۴۳' ۳۴۴)

"نبی کریم ﷺ نے سورۃ آل عمران کی آخری دس آیات کی تلاوت کی۔ پھر لٹکائے ہوئے مشکیزہ کی طرف بڑھے اور وضو کیا اور نماز شروع کر دی۔"

اِس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تلاوت کی اور وضو بعد میں کیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اِس حدیث پر باب قائم کیا ہے:

باب قراءۃِ القرآن بعد الحدثِ وغیرہٖ۔

بے وضو ہونے کے بعد قرآنِ مجید کی تلاوت کرنا۔

یہ بات تو مسلم ہے کہ نبی کریم بے وضو بھی ہوتے تھے اور مسلم شریف کی صحیح حدیث میں ہے کہ:

((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهٖ.))

"کہ نبی کریم ﷺ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے۔"

اور اللہ کے ذکر میں قرآنِ مجید بھی داخل ہے۔ ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کی تلاوت کے لیے باوضو ہونا لازمی نہیں ہے۔

اِس کا مطلب یہ بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ آدمی اپنی عادت ہی بنا لے کہ میں نے تلاوت ہی بے وضو ہونے کی حالت میں کرنی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ باوضو ہو کر کرے۔ (ع۔ع' مجلۃ الدعوۃ' مارچ/ ۱۹۹۵ء)

حائضہ عورت کا قرآن پڑھنا

س کیا حائضہ عورت قرآنِ مجید کی تلاوت کر سکتی ہے؟ ہم ایک مدرسہ میں قرآنِ مجید حفظ کرتی ہیں۔ بعض اہل عِلم کے بارہ میں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ جائز کہتے ہیں اور بعض اِس سے روکتے ہیں۔ ہمیں صرف قرآن و سنت سے اِس مسئلہ کی وضاحت درکار ہے۔ (بعض طالبات' فیصل آباد۔ م۔ن' بہاولپور)

ج اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل عِلم کی اس میں آراء مختلف ہیں۔ امام بخاری' ابنِ جریر طبری' ابنِ المنذر' امام مالک' امام شافعی' ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ ان سب کے نزدیک حائضہ عورت کا قرآن کی تلاوت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ راجح بات بھی یہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ قرآن و سنت میں کوئی صریح اور صحیح دلیل موجود نہیں جس میں حیض والی عورتوں کو قرآن مجید کی تلاوت سے روکا گیا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ عورتیں اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں بھی حائضہ ہوتی تھیں۔ اگر قرآنِ مجید کی تلاوت ان کے لیے حرام ہوتی تو اللہ کے رسول انہیں قرآنِ مجید کی تلاوت سے روک دیتے جس طرح کہ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے روک دیا تھا اور جب حیض کی کثرت کے باوجود کسی صحابئ رسول نے یا اُمھات المؤمنین رضی اللہ عنہن میں سے

کسی نے بھی امام الانبیاء ﷺ سے اس کی ممانعت نقل نہیں کی تو معلوم ہوا کہ جائز ہے۔ اب اِس چیز کا عِلم ہونے کے باوجود کہ رسول اللہ ﷺ سے اِس کی ممانعت بالکل منقول نہیں اِس کو حرام کہنا درست نہیں ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اِس بارہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے کہ:

((لَا تَقْرَأُ الْحَائِضُ وَلَا الْجُنُبُ شَيْئًا مِنَ الْقُرْآنِ))

(ابوداؤد' ترمذی' ابنِ ماجہ)

یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اِس کی سند میں اسماعیل بن عیاش ہے۔ جب یہ شخص حجازیوں سے کوئی روایت بیان کرے تو وہ قابل اعتماد نہیں ہوتی اور یہ روایت حجازیوں سے ہے اور دوسری جابر بن عبداللہ کی حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَقْرَأُ الْحَائِضُ وَلَا النُّفَسَاءُ مِنَ الْقُرْآنِ شَيْئًا)) (دارقطنی)

یہ حدیث بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ اِس کی سند میں محمد بن الفضل ہے جسے محدثین نے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ احادیث گھڑنے کا بھی اِس پر الزام ہے۔

یہی حدیث جابر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی مروی ہے۔ اِس کی سند میں یحییٰ بن ابی انیسہ ہے اور یہ کذاب ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ ان دونوں احادیث کے بارہ میں لکھتے ہیں:

"لَا يَصْلُحَانِ لِلِاحْتِجَاجِ بِهِمَا عَلٰى ذٰلِكَ فَلَا يُصَارُ اِلَى الْقَوْلِ بَالتَّحْرِيْمِ اِلَّا بِدَلِيْلٍ" (نیل الاوطار ۱/۲۴۶)

کہ ان دونوں حدیثوں کو حائضہ عورت کے لیے قرآنِ مجید کی تلاوت کی ممانعت کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا اور بغیر دلیل کے اسے حرام نہیں کہا جاسکتا۔

باقی مفتی اعظم شیخ ابنِ باز نے کہا ہے کہ ایسی عورت قرآن کو چھو نہیں سکتی۔

منہ زبانی پڑھ سکتی ہے لیکن مجھے اِس کی کوئی دلیل نہیں ملی۔

((لَا یَمَسُّ الْقُرْآنَ اِلَّا طَاھِرٌ))

کہ قرآن کو طاہر کے سواء کوئی نہ چھوئے' سے اِس پر استدلال درست نہیں ہے کیونکہ الاطاہر کا معنی بخاری شریف کی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث متعین کرتی ہے کہ اِس کا معنی ہے مومن کے سواء قرآن کو کوئی نہ چھوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(ع۔ ح' مجلّۃ الدعوۃ' اکتوبر/ ۱۹۹۵ء)

حائضہ عورت کا قرآن کو چھونا

س: حائضہ عورت قرآن مجید کو چھو سکتی ہے یا نہیں؟ قرآنِ مجید کی آیت ﴿ لَا یَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ کے حوالہ سے وضاحت کریں۔ اِس آیت کی بناء پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ حائضہ عورت قرآن کو چھو نہیں سکتی۔ قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔ (ہدایت اللہ شاہین)

ج: حائضہ عورت کے قرآنِ مجید کی تلاوت کے بارے میں اکتوبر ۹۵ء کے مجلّۃ الدعوۃ میں تفصیلاً لکھا گیا ہے کہ شریعت میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں جس میں حائضہ عورت کو قرآنِ مجید پڑھنے سے روکا گیا ہو۔

رہا قرآنِ مجید کو چھونے کا مسئلہ تو اِس کے متعلق اہل عِلم کی آراء مختلف ہیں۔ عدل و انصاف کے ترازو سے جس بات کو ترجیح ملتی ہے وہ یہ ہے کہ عورت کو ایسی حالت میں بلاوجہ قرآنِ مجید کو نہ چھونا چاہیے لیکن پڑھنے اور پڑھانے کے سلسلہ میں اگر چھو بھی لیتی ہے تو اِس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ قرآنِ مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو اِس کی حرمت پر دال ہو۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں حائضہ ہوتی تھیں۔ وہ قرآن مجید پڑھتی پڑھاتی بھی تھیں لیکن کہیں بھی ان کو یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ وہ ایسی حالت میں قرآنِ مجید کو چھو نہیں سکتیں۔ اِس وقت اِس مسئلہ کے بیان کی ضرورت بھی تھی لیکن ضرورت کے باوجود شارع علیہ السلام کی اِس پر خاموشی اِس کے جواز کی دلیل ہے۔ قرآنِ مجید کی

جس آیت سے استدلال کرتے ہیں وہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ یہ آیت قرآنِ مجید کے چھونے کے بارے میں نہیں ہے۔

اِس آیت کے سیاق و سباق کا غور سے مطالعہ کریں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ قرآن مجید کے متعلق نہیں بلکہ لوحِ محفوظ کے متعلق کہی گئی ہے۔ ((لَا یَمَسُّہٗ)) کی ضمیر کا مرجع ((فِیْ کِتَابٍ مَکْنُوْنٍ)) ہے۔ اور ((لَا یَمَسُّہٗ)) سے مراد فرشتے ہیں۔ تو اِس آیت کا معنی ہے کہ "لوحِ محفوظ کو فرشتوں کے سوا کوئی نہیں چھوتا۔"

((اَلْمُطَهَّرُوْنَ)) سے مراد فرشتے ہیں۔ اِس بات پر عبداللہ بن عباس، انس بن مالک کے علاوہ تابعین کی بہت بڑی جماعت متفق ہے۔

احناف کی تفسیر روح المعانی میں ہے :

"اِنَّ الْمُرَادَ بِالْمُطَهَّرِيْنَ الْمَلَائِكَةُ مَرْوِيٌّ مِنْ عِدَةِ طُرُقٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَكَذَا اَخْرَجَهُ جَمَاعَةٌ عَنْ اَنَسٍ وَقَتَادَةَ وَابْنِ جُبَيْرٍ وَ مُجَاهِدٍ وَاَبِي الْعَالِيَةِ وَغَيْرِهِمْ۔"

ابنِ کثیر میں بھی اِس معنی کی عبارت موجود ہے کہ مطہرین سے مراد فرشتے ہیں۔ یہ عبداللہ بن عباس سے کئی اسناد کے ساتھ مروی ہے اور انس رضی اللہ عنہ سے بھی ایک جماعت نے اِس کو روایت کیا ہے۔ تفسیر رازی میں ہے اَلضَّمِيْرُ عَائِدٌ اِلَى الْكِتَابِ عَلَى الصَّحِيْحِ کہ لَا یَمَسُّہٗ کی ضمیر کتاب (لوحِ محفوظ) کی طرف راجع ہے۔

اشرف الحواشی میں ہے کہ بعض نے اِس ضمیر کو قرآنِ مجید کے لیے مانا ہے اور یہ استدلال کیا ہے کہ بے وضو ہونے کی حالت میں اسے چھونا جائز نہیں ہے مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے اور قرآن مجید کو بے وضو چھونا جائز ہے گو بہتر یہ ہے کہ وضو کر لیا جائے۔

قرآن مجید کو چھونے کے متعلق جو صحیح حدیث کے الفاظ ہیں ((لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا طَاهِرٌ)) ہیں "طاہر کے سواء قرآن کو کوئی نہ چھوئے۔" اِس طاہر کی تفسیر صحیح بخاری

شریف کی حدیث میں موجود ہے۔ جس کے راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ جنبی تھے، نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر دور سے گزر گئے، غسل کے بعد واپس آکر رسول اللہ ﷺ سے ملے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو کہا ((اَلْمُؤْمِنُ لَا یَنْجُسُ)) کہ مومن نجس ہوتا ہی نہیں ہے۔

اِس حدیث سے ظاہر ہے کہ ((اِلَّا طَاھِرٌ)) سے مراد الا مومن ہے۔ یعنی قرآن مجید کو مومن کے سوا دوسرا نہ چھوئے۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ حیض کی حالت میں عورت مومنہ ہی رہتی ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ مجھے مسجد سے مصلّٰی پکڑاؤ۔ انہوں نے کہا کہ میں حائضہ ہوں تو نبی کریم ﷺ نے ان سے کہا:

((اِنَّ حَیْضَتَكِ لَیْسَتْ فِیْ یَدِكِ)) (رواہ مسلم، مشکوۃ المصابیح باب الحیض)

"بے شک تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

نبی اکرم ﷺ کے یہ الفاظ اِس مسئلہ میں نص کی حیثیت رکھتے ہیں کہ حیض کی نجاست ہاتھ کے اندر نہیں ہے۔ بلکہ حیض کی حالت میں ہاتھ پاک ہی رہتا ہے۔

اِس ساری وضاحت کے باوجود اگر مسلمان عورت زیادہ تعظیم اور احترام کے پیش نظر قرآن مجید کو بغیر چھونے کے اگر پڑھ سکتی ہے یا کوئی صاف ستھرا کپڑا قرآن مجید کو پکڑنے اور اوراق اُلٹانے کے لیے استعمال کر لے تو بہت بہتر اور اچھا ہے۔ اِس سے علماء کے اختلاف سے بھی نکل جائے گی۔ ایسی صورت میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "جَائِزٌ بِلَا خِلَافٍ" (شرح المہذب ۲/۷۲/۳) کہ اِس کے جواز میں کسی کو اختلاف نہیں۔ (ع۔ع، مجلۃ الدعوۃ، دسمبر/ ۱۹۹۵ء)

حالتِ حیض میں حج اور طواف

سوال عورت حیض کی حالت میں طواف یا حج اور عمرہ کر سکتی ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

ج حائضہ عورت حج اور عمرہ کا احرام باندھ لے اور حج کے سارے کام کرتی جائے صرف بیت اللہ کا طواف نہ کرے اور نہ ہی نمازیں ادا کرے پھر جب حیض سے پاک ہو جائے تو خانہ کعبہ کا طواف کرلے کیونکہ طواف کے لیے طہارت شرط ہے۔ اگر طہارت نہ ہو تو طواف نہیں ہوتا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:

((خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نَذْكُرُ اِلَّا الْحَجَّ فَلَمَّا كُنَّا بِسَرِفٍ طَمِثْتُ فَدَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَبْكِيْ فَقَالَ لَعَلَّكِ نَفِسْتِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَاِنَّ ذٰلِكَ شَيْئٌ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلٰى بَنَاتِ اٰدَمَ فَافْعَلِي مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ غَيْرَ اَنْ لَّا تَطُوْفِي بِالْبَيْتِ حَتّٰى تَطْهُرِيْ)) (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ۵۸۱/۲)

"ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے۔ ہمارا مقصود صرف حج تھا پھر جب ہم سرف مقام پر پہنچے تو میں حائضہ ہوگئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے تو میں رو رہی تھی۔ آپ نے فرمایا شاید تجھے حیض آنا شروع ہوگیا' میں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ جو کچھ حاجی کرتے ہیں تُو بھی کرتی جا۔ سوائے اِس کے کہ پاک ہونے تک بیت اللہ کا طواف نہ کرنا۔"

اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ حیض میں عورت بیت اللہ کے طواف کے علاوہ باقی حاجیوں والے تمام کام کر سکتی ہے اور جب حیض سے پاک ہو جائے تو پھر بیت اللہ کا طواف کرے۔ (مجلّہ 'الدعوۃ' جون / ۱۹۹۲ء)

ڈاڑھی کا مسئلہ اور مصری علماء

س ڈاڑھی کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ میرے پاس مصری علماء کا ایک فتویٰ ہے جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں جو مفتی مصر نے صادق میرپوری کے

استفسار پر ان کو بھیجا ہے۔ اِس میں کہا گیا ہے کہ آدمی ڈاڑھی اپنی پسند کے مطابق رکھ سکتا ہے۔ (قاری محمد اعظم' میرپور آزاد کشمیر)

ج از (ط۔ن) : بعض مصری علماء کا زیر نظر فتوی قطعاً کتاب و سنّت پر مبنی نہیں ہے۔ یہ فتویٰ ان مصری علماء کے گروپ کا ہے جو احادیث کو عموماً دین کا حصّہ اور حجت نہیں سمجھتے۔ ایسے مصری علماء کو جن حضرات نے دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان میں اسلام اور اسلامی شعائر کا کس قدر احترام پایا جاتا ہے؟ ان کی فکر و سوچ ہی نہیں ان کے طور و اطوار' بود و باش اور حرکت و عمل کا ہر زاویہ اسلامی تشخص کی بجائے خالصتاً یورپی ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ لوگ کلین شیو' پینٹ شرٹ اور ٹائی جیسے صلیبی شعائر سے آراستہ ہوتے ہیں اور یورپ کے نقال بن کر اسلام کے بارے میں راہنمائی دیتے ہوئے ((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) (ابوداؤد) کا مصداق ہو جاتے ہیں۔ زیر نظر فتویٰ ان کے اسی فکر و عمل کا غماز ہے۔ جیسا کہ سائل نے جب ان سے یہ پوچھا کہ وہ لوگ جو ڈاڑھی مسلسل منڈواتے یا کٹواتے ہیں یا اِس کی لمبائی کی تحدید کے قائل ہیں کیا وہ گناہ گار ہیں اور کیا وہ زنا اور چوری سے بھی بڑے گناہ کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟

جمہوریہ مصر کا مفتی اِس کو جو جواب بھیجتا ہے اِس کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

- ڈاڑھی کا چھوڑنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ آپؐ ڈاڑھی کی کانٹ چھانٹ کیا کرتے تھے تاکہ ڈاڑھی خوبصورت ہو جائے اور چہرے کے مناسب ہو جائے۔

بعض فقہاء نے ان احادیث کو وجوب پر محمول کیا ہے جبکہ اکثر علماء نے اِس کو سنت کہا ہے کہ جس پر عمل کرنے سے تو ثواب ہوتا ہے لیکن چھوڑنے والے کو عذاب نہیں ہوتا اور جن لوگوں نے ڈاڑھی مونڈھنے کو حرام قرار دیا ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اب آخر میں فرماتے ہیں۔

- بلکہ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ ایسا شیو اپنائے جس کو اپنی شکل و شباہت کے لیے بہتر سمجھے اور لوگ بھی اسے پسند کریں۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے مفتی مصر کی رسول اللہ ﷺ سے عملی طور پر محبت اور علمی پوزیشن کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے حالانکہ شریعت سے معمولی واقفیت رکھنے والا عام آدمی بھی جانتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وفات کے وقت تک مکمل (پوری) ڈاڑھی رکھی اور پوری زندگی اپنی ڈاڑھی کا ایک بھی بال کبھی نہیں کاٹا جبکہ مفتی مصر صاحب کہہ رہے ہیں کہ دائیں' بائیں سے اور اُوپر سے نبی کریم ﷺ ڈاڑھی کاٹتے تھے۔ نعوذ باللہ۔

مفتی مصر نے اپنی اِس بودی دلیل کی بنیاد ترمذی شریف میں آنے والی صرف ایک روایت ((یَاْخُذُ مِنْ طُوْلِھَا وَعَرْضِھَا.)) پر رکھی ہے۔ یہ انتہائی کمزور اور ضعیف ہے لیکن اِس کا ضعف معلوم ہونے کے باوجود اِس سے استدلال کرنا نبی کریم ﷺ پر تہمت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور ساتھ یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ ڈاڑھی خوبصورت بنانی چاہئے اور چہرے کے مناسب ہونی چاہئے۔ اگر سنت رسول کو اختیار کرنے کا معیار یہ قائم کیا جائے گا تو پھر لوگ ڈاڑھی اُسترے سے منڈوا کر دلیل پیش کریں گے اور کرتے ہیں کہ اب خوبصورت اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔ تو کیا شریعت کی رُو سے ایسا درست تسلیم کر لیا جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاڑھی بڑھانا عین فطرت ہے کیونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہُ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَشَرٌ مِّنَ الْفِطْرَۃِ قَصُّ الشَّارِبِ وَاِعْفَاءُ اللِّحْیَۃِ))(مسلم)

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دس چیزیں فطرت سے ہیں۔ ان میں سے مونچھ کا کٹوانا اور ڈاڑھی کا بڑھانا بھی ہے۔"

بخاری میں صیغہ اَمر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((خَالِفُوْا الْمُشْرِکِیْنَ اَحفُوا الشَّوَارِبَ وَاَعْفُوا اللُّحٰی))(بخاری)

جہاں تک خوبصورتی کا تعلق ہے' اگر ڈاڑھی کے کاٹنے اور نہ ہونے یا کٹوا کر چھوٹی کرنے کو مفتی صاحب نے خوبصورت گردانا ہے تو اصل بات یہ ہے کہ ڈاڑھی ہی مرد کی خوبصورتی اور حسن و جمال اور وجاہت کی نشانی ہے۔ شاید ان کی نظر سے مسلم شریف کی یہ روایت نہیں گزری کہ :

((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَثِيْرَ شَعْرِ اللِّحْيَةِ)) (مسلم)

"یعنی رسول اللہ ﷺ کی ڈاڑھی مبارک بہت گھنی تھی۔"

ڈاڑھی کے کاٹنے سے خوبصورتی نہیں بلکہ عورتوں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے جو کہ اسلام میں ناجائز ہے۔ ایسی خوبصورتی کے رد میں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

((لَعَنَ اللّٰهُ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَآءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَآءِ بِالرِّجَالِ)) (ابوداؤد)

"یعنی اللہ تعالیٰ مردوں پر لعنت کرتا ہے جو عورتوں کے ساتھ مشابہت کرتے ہیں اور ان عورتوں پر لعنت کرتا ہے جو مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرتی ہیں۔"

دوسرے اقتباس میں ڈاڑھی کے مسئلہ کو ختم کرنے کے لیے پہلے تو ڈاڑھی کو سنت کا درجہ دے رہے ہیں کہ فرض اور واجب نہیں۔ پھر یہ کہہ کر کہ جن لوگوں نے ڈاڑھی مونڈنے کو حرام قرار دیا ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ (جو کہ بالکل غلط ہے) اب یہ کہہ کر ڈاڑھی کاٹنے والوں کے لیے راستہ بالکل صاف کر دیا ہے کہ جس طرح چاہیں ڈاڑھی کاٹیں۔ لیکن اگر ڈاڑھی کے وجوب اور فرض ہونے پر مروی احادیث پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ڈاڑھی کے متعلق کتب احادیث میں موجود احادیث میں پانچ صیغے استعمال ہوئے ہیں اور پانچوں ہی امر کے ہیں۔ مثلاً :

((وَاعْفُوْا)) (ڈاڑھی کو معاف کرو) ((اَوْفُوْا)) (ڈاڑھی پوری کرو) ((وَفِّرُوْا)) (ڈاڑھی کافی مقدار میں رکھو) ((اَرْخُوْا)) اَوْ اَرْجُوْ (ڈاڑھی کو لٹکاؤ)

نبی کریم ﷺ سے احادیث میں وارد ہونے والے یہ سب کے سب صیغے امر

کے ہیں جو کہ ڈاڑھی کے وجوب اور فرض ہونے پر واضح دلالت کرتے ہیں۔

تیسری جگہ یہ کہہ کر بالکل حدیث کا انکار ہی کر دیا کہ "مسلمان کو چاہیے کہ وہ ایسا شیو اپنائے جس کو اپنی شکل و شباہت کے لیے بہتر سمجھے اور لوگ بھی اسے پسند کریں۔"

اسلام کے اصولوں پر عمل کا معیار دنیا والوں کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی میں نہیں بلکہ اللہ کی رضا اور پسندیدگی میں ہے۔ اِس طرح تو وہ تمام لوگ جو اپنی ڈاڑھی اُسترے اور بلیڈ سے منڈواتے ہیں وہ اسی کو ہی اپنی شکل و شباہت کے لیے بہتر سمجھتے ہیں اور دین سے ناواقف اور بے بہرہ لوگ بھی ان کو اسی حالت میں پسند کرتے ہیں۔ اِس طرح تو (ماننا پڑے گا) کہ وہ تمام لوگ شریعت کی روشنی میں سب افعال سرانجام دے رہے ہیں جو کہ سراسر شریعت سے مذاق ہے۔

رہا مسئلہ زانی اور چور سے کس طرح بڑھ کر گناہ گار ہے تو یہ ایک سمجھنے کی بات ہے اور ایک بڑے گناہ پر تسلسل سے قائم رہنے کا نتیجہ ہے۔ مثلاً چور تو کبھی کبھار یا ایک آدھ بار چوری کرتا ہے' زانی سے بھی کبھی کبھار گناہ سرزد ہوتا ہے اور پھر وہ پشیمان بھی ہوتا ہے لیکن ڈاڑھی اور سنت رسول کو روزانہ تیز دھار اُسترے سے کاٹ کر گندگی میں پھینک دیتا ہے۔ اِس طرح وہ روزانہ تسلسل سے ایک فرض کو قتل کر کے گناہ گار ہوتا ہے اور وہ ایسا کر کے پشیمان ہونے کے بجائے اِس کو درست سمجھتا ہے اور آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھ کر اپنے اِس قبیح عمل پر خوش ہوتا ہے جبکہ چور اور زانی کبھی کبھی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اِس بناء پر ایسا گناہ جس پر تسلسل سے مداومت اور ہمیشگی اختیار کر لی جائے وہ تمام گناہوں سے بڑھ کر سخت گناہ بن جاتا ہے۔

کتاب

الْاَذَانِ

اقامت کا جواب

س: کیا اقامت کا جواب اَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا کہنا صحیح ہے؟ تکبیر کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ ہمارے بڑے اسی طرح کرتے آئے ہیں۔ تم ایک نیا فتنہ کھڑا کر رہے ہو۔ اس مسئلہ میں ہماری صحیح راہنمائی فرمائیں۔

(محمد یوسف' کٹھیالہ شیخاں)

ج: اقامت کا جواب دینے کے لیے جو اَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا کہا جاتا ہے یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ اس سلسلہ میں سنن ابو داؤد میں جو روایت بطریق محمد بن ثابت از رجل من اهل الشام از شهر بن حوشب از ابی امامه یا عن بعض اصحاب النبی مروی ہے' انتہائی کمزور ہے۔ اس کی وجہ ضعف یہ ہے کہ اس کی سند میں درج ذیل تین علتیں پائی جاتی ہیں۔ پہلی علت یہ ہے:

(۱) محمد بن ثابت العبدی ضعیف راوی ہے۔ امام علی بن مدینی اور دیگر محدثین نے کہا ہے کہ یہ حدیث میں قوی نہیں ہے۔ امام ابنِ معین نے فرمایا لَیْسَ بِشَیْءٍ یہ کچھ نہیں ہے۔ (میزان الاعتدال ۴۹۵/۳)

امام ابوحاتم نے کہا ہے لَیْسَ بِالْمَتِیْنِ امام بخاری نے کہا یُخَالِفُ فِی بَعْضِ حَدِیْثِهٖ امام نسائی نے فرمایا لَیْسَ بِالْقَوِیِّ امام ابنِ عدی نے کہا عَامَّةُ اَحَادِیْثِهٖ مِمَّا لَا یُتَابَعُ عَلَیْهِ امام ابو داؤد نے کہا لَیْسَ بِشَیْءٍ امام ابواحمد الحاکم نے کہا لَیْسَ بِالْمَتِیْنِ (تہذیب التہذیب ۸۵/۹)

دوسری علت یہ ہے کہ:

(۲) رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الشَّامِ مجہول ہے یعنی یہ بات معلوم نہیں کہ اہل شام میں سے کون سا آدمی ہے جس سے یہ روایت مروی ہے۔

(۳) تیسری خرابی یہ ہے کہ شہر بن حوشب متکلم فیہ ہے (جیسا کہ میزان ۲۸۳/۲ اور تہذیب ۳۶۹/۴ میں موجود ہے) حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے تقریب میں اسے کثیر الاوہام یعنی کثرت ۔ سے وہم میں مبتلا ہونے والا قرار دیا ہے۔

لہٰذا جب یہ روایت صحیح نہیں تو اس سے استدلال کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے یاد رہے کہ بڑوں کی بات کوئی حجت نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے احکامات ہی ہمارے لیے حجت ہیں۔ جو بات قرآن و سنت سے ملتی ہے وہ لے لو اور جس کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں۔ اس پر عمل کرنے کے ہم مکلف نہیں اللہ کے رسول ﷺ نے جب دعوت کا سلسلہ شروع کیا تھا تو آپ کو بھی یہی جواب دیا گیا تھا کہ ہمارے بزرگ اور بڑے آج تک اس طریقہ پر گامزن ہیں۔ کیا وہ غلط ہیں اور تم جو نیا دین لائے ہو وہ صحیح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ (بقرہ : ۱۷۰)

"جب انہیں کہا جاتا کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہدایت یافتہ تھے"۔

یہاں سے معلوم ہوا منزل من اللہ دین کی بات کے مقابلے میں آباؤ اجداد کے اقوال و افعال کو پیش کرنا پرانے مشرکین و کفار کا طرزِ عمل تھا۔ اہل اسلام کو یہ بات زیبا نہیں کہ وہ شرعی احکامات کے سامنے اپنے آباؤ اجداد کو پیش کریں۔ جن مسائل کا ثبوت قرآن و سنت کی نصوص سے نصاً یا اشارتاً ملتا ہے انہیں لے لو۔

(مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۳ء)

اذان میں اَشْهَدُ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيٌّ وَلِيُّ اللّٰهِ کا اضافہ

س کیا اذان کے کلمات میں شہادتین کے بعد اَشْهَدُ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ

عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہِ وغیرہ کے کلمات کہنا درست ہے۔ قرآن و سنت کی رو سے وضاحت فرمائیں؟

ج اذان شعائر اسلام میں سے ہے اس کے الفاظ وہی درست ہیں جو نبی اکرم ﷺ سے منقول ہیں۔ اذان میں نہ اپنی طرف سے اضافہ جائز ہے اور نہ کمی۔ جو شخص اذان میں بعض کلمات کا اضافہ کرتا ہے وہ بدعتی ہے بلکہ لعنت کا موجب ہے۔

سیدنا عبداللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ کی جو روایت اذان کے بارے میں مروی ہے' اس میں یہ بات مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جس وقت لوگوں کو نماز کے لیے جمع کرنے کے واسطے ناقوس بجانے کا حکم دیا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کے ہاتھ میں ناقوس ہے تو میں نے اس کو کہا' اے اللہ کے بندے کیا تو ناقوس بیچے گا تو اس نے کہا آپ اس کے ساتھ کیا کریں گے۔ تو میں نے کہا میں نماز کے لیے اس کے ذریعے لوگوں کو ندا دوں گا۔ تو اس نے کہا کہ میں تجھے ایسی بات پر راہنمائی کروں جو اس سے بہتر ہے۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ تو اس نے کہا کہ تو کہہ : اَللّٰہُ اَکْبَرُ' اَللّٰہُ اَکْبَرُ' اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ' اَشْھَدُ اَنْ لاَّ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ' اَشْھَدُ اَنْ لاَّ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ' اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ' حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ' حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ' حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ' اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ صبح میں نے نبی اکرم ﷺ کو اپنا خواب سنایا تو آپ نے فرمایا :

((اِنَّ ھٰذَا رُؤْیَا حَقٌّ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ))

"یقیناً یہ خواب سچا ہے اگر اللہ نے چاہا"۔

پھر آپ نے فرمایا : "بلال رضی اللہ عنہ کو یہ کلمات سکھا دو تاکہ وہ اذان کہے کیونکہ اس کی آواز تجھ سے بہتر ہے"۔ (منتقی لابن جارود (۱۵۸) ابو داؤد (۴۹۹) ابنِ ماجہ (۷۰۶) ترمذی (۱۸۹) احمد ۴/ ۴۳ دارمی ۱/ ۲۱۴' دارقطنی ۱/ ۲۴۱' ابنِ خزیمہ ۱/ ۱۸۹' ۱۹۱' ۱۹۳)

اسی طرح فجر کی اذان میں حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کے بعد دوبار اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ

النَّوْمِ کہنا بھی مشروع ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

مِنَ السُّنَّةِ اِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ فِیْ اَذَانِ الْفَجْرِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ قَالَ الصَّلَاةُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْمِ

"صبح کی اذان میں حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کے بعد الصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہنا سنت میں سے ہے"۔ (ابنِ خزیمہ (۳۸٦) ۱/۲۰۲، دار قطنی ۱/۲۴۳، بیہقی ۱/۴۲۳، ابنِ منذر ۲۱/۳)

اور اصول میں یہ بات متحقق ہے کہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا کہ مِنَ السُّنَّةِ کَذَا مسند اور مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ امام نووی نے المجموع ۵/۲۳۲، ابنِ ہمام نے "التحریر" اور اس کے شارح ابنِ امیر الحاج نے ۲/۲۲۴ پر جمہور اصولیین و محدثین سے یہی موقف نقل کیا ہے۔ اسی طرح سیدنا ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اذان سکھلائی اور فرمایا صبح کی اذان میں الصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، الصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہا کرو۔ یہ حدیث سیدنا ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے متعدد طرق کے ساتھ درج ذیل کتب میں مروی ہے مسند احمد ۳/۴۰۸، ابو داؤد (۵۰۱) نسائی (۲/۷)، ابنِ خزیمہ (۳۸۵) دار قطنی ۱/۲۴۴، بیہقی ۱/۴۲۲، ابنِ حبان (۲۸۹) تاریخ الکبیر ۱/۱۲۳، عبدالرزاق ۱/۴۷۲، حلیہ الاولیاء ۸/۳۱۰

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ فجر کی پہلی اذان میں الصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہا جاتا ہے۔

(طحاوی ۱/۱۳۷، بیہقی ۱/۴۲۳، التلخیص الحبیر ۱/۲۰۱)

ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے اذان میں ترجیع بھی ثابت ہے یعنی شہادتین کے کلمات کو دوبارہ کہنا۔ پہلی بار آہستہ دوسری بار اس سے اونچی آواز میں۔ مذکورہ بالا صحیح احادیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اذان کے مذکورہ کلمات ہی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ ان میں نہ اضافہ جائز ہے اور نہ ہی کمی۔ اس اذان میں اَشْهَدُ اَنَّ عَلِیًّا وَلِیُّ اللّٰهِ وغیرہ کے کلمات نہیں ہیں جو لوگ ان کلمات کا اضافہ کرتے ہیں، وہ احداث فی

الدین کے مرتکب ہیں اور بدعتی ہیں۔ فقہ جعفریہ میں بھی ان کلمات کا اذان میں کہنا ثابت نہیں ہے بلکہ فقہ جعفریہ کی رو سے یہ کلمات اذان میں کہنا گناہ ہے اور کہنے والا لعنت کا مستحق ہے۔

فقہ جعفریہ کی صحاح اربعہ وغیرہ میں مرقوم اذان اور اہل سنت کی اذان میں فرق صرف یہ ہے کہ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے بعد فقہ جعفریہ کی طرف سے حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ دو مرتبہ کہنا ہے۔ باقی اذان کے الفاظ وہی ہیں جو اہل سنت کی اذان کے ہیں۔ شیعہ مذہب کی معتبر کتاب الفقیہ من لا یحضرہ الفقیہ ص ۱۸۸/۱ پر ابنِ بابویہ قمی نے اذان کے الفاظ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

هٰذَا هُوَ الْاَذَانُ الصَّحِيْحُ لَا يُزَادُ فِيْهِ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُ وَالْمُفَوِّضَةُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ قَدْ وَضَعُوْا اَخْبَارًا وَّزَادُوْا فِي الْاَذَانِ مُحَمَّدًا وَّاٰلَ مُحَمَّدٍ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ مَرَّتَيْنِ وَفِيْ بَعْضِ رِوَايَاتِهِمْ بَعْدَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ مَرَّتَيْنِ وَمِنْهُمْ مَنْ رَّوٰى بَدَلَ ذٰالِكَ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقٌّ مَرَّتَيْنِ وَلَا شَكَّ فِيْ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ وَاَنَّهٗ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقًّا وَاَنَّ مُحَمَّدًا وَّاٰلَهٗ صَلَوٰتُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ وَلٰكِنْ لَيْسَ ذٰالِكَ فِيْ اَصْلِ الْاَذَانِ وَاِنَّمَا ذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِيُعْرَفَ بِهٰذِهِ الزِّيَادَةِ الْمُتَّهَمُوْنَ بِالتَّفْوِيْضِ الْمُدَلِّسُوْنَ اَنْفُسَهُمْ فِيْ جُمْلَتِنَا۔

"یہی اذان صحیح ہے نہ اس میں زیادتی کی جائے گی اور نہ کمی اور مفوضہ فرقہ پر اللہ تعالٰی کی لعنت ہو۔ انہوں نے بہت سی روایات گھڑیں اور اذان میں محمد و آل محمد خیر البریہ دو مرتبہ کہنے کے لیے بڑھا دیئے اور انکی بعض روایات میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ کے بعد اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ دو دفعہ ذکر کیا گیا ہے۔ ان مفوضہ میں سے بعض نے ان الفاظ کی بجائے یہ الفاظ روایت کیے ہیں اَشْهَدُ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقًّا یہ

بات یقینی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ' اللہ کے ولی اور سچے امیر المؤمنین ہیں اور محمد و آل محمد خیر البریہ ہیں لیکن یہ الفاظ اصل اذان میں نہیں ہیں۔ میں نے یہ الفاظ اس لیے ذکر کیے ہیں تاکہ ان کی وجہ سے وہ لوگ پہچانے جائیں جو مفوضہ ہونے کی اپنے اوپر تہمت لیے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود اپنے آپ کو اہل تشیع میں شمار کرتے ہیں"۔ انتھی ابنِ بابویہ قمی شیعہ محدث کی اس صراحت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ وغیرہ کلمات اصل اذان کے کلمے نہیں بلکہ اس لعنتی فرقہ مفوضہ نے یہ گھڑے ہیں اور اذان میں داخل کر دیئے ہیں۔ ائمہ محدثین کے ہاں ان کا کوئی ثبوت نہیں۔ الفقیہ من لا یحضرہ الفقیہ ص ۱۸۸/۱ کے حاشیہ میں مفوضہ فرقے کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے :

فِرْقَةٌ ضَالَّةٌ قَالَتْ بِاَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ مُحَمَّدًا وَفَوَّضَ اِلَيْهِ خَلْقَ الدُّنْيَا فَهُوَ الْخَلَّاقُ وَقِيْلَ بَلْ فَوَّضَ ذَالِكَ اِلٰى عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ

"مفوضہ ایک گمراہ فرقہ ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف محمد ﷺ کو پیدا کیا۔ اس کے بعد دنیا کی پیدائش کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کے سپرد کر دیا لہٰذا آپ ہی خلاق (بہت زیادہ پیدا کرنے والے) ہوئے اور ان کے عقائد میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش کا معاملہ نبی ﷺ کی بجائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا"۔

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہو گیا کہ مفوضہ ایک لعنتی فرقہ ہے۔ اس نے یہ کلمات اذان میں بڑھائے ہیں۔ سنت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔ شیعہ مذہب کی معتبر کتاب المبسوط ۹۹/۱ ط تہران لابی جعفر بن محمد حسن الطوسی میں لکھا ہے کہ :

فَاَمَّا قَوْلُ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاٰلَ مُحَمَّدٍ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ عَلٰى مَاوَرَدَ فِي شَوَاذِّ الْاَخْبَارِ فَلَيْسَ بِمَعْمُوْلٍ عَلَيْهِ فِي الْاَذَانِ وَلَوْ فَعَلَهُ الْاِنْسَانُ يَاْثَمُ بِهٖ غَيْرَ اَنَّهٗ لَيْسَ مِنْ فَضِيْلَةِ الْاَذَانِ وَلَا كَمَالِ فُصُوْلِهٖ

"بہر حال اذان میں اشهد ان علیا امیر المومنین وال محمد خیر البریہ کہنا جیسا کہ شاذ روایات میں آیا ہے ان کے کہنے پر کوئی کاربند نہیں ہے اور اگر کوئی شخص اذان میں یہ کلمات کہے تو وہ گناہگار ہو گا۔ علاوہ ازیں یہ کلمات اذان کی فضیلت اور کمال میں سے نہیں ہیں"۔

اسی طرح شیعہ مذہب کی معتبر کتاب اللمعة الدمشقیہ ۲۴۰/۱ پر لکھا ہے:

"مذکورہ اذان (جو کہ اہل سنت کے مطابق ہے) یہی شرع میں منقول ہے۔ اس کے علاوہ زائد کلمات کا شرعی طور پر درست سمجھنا جائز نہیں ہے خواہ وہ اذان کے اندر ہوں یا اقامت میں۔ جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کی گواہی کے الفاظ اور محمد و آل محمد کے خیر البریہ یا خیر البشر ہونے کے الفاظ ہیں۔ اگرچہ جو کچھ ان الفاظ میں کہا گیا ہے' وہ واقعی درست ہے (یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ولی اللہ ہونا اور محمد و آل محمد کا بہترین مخلوق ہونا) لیکن ہر وہ بات جو واقعتا درست اور حق ہو' اسے ایسی عبادات میں داخل کر لینا جو شرعی وظیفہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حد بندی کی گئی ہو' جائز نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا ان کلمات کا اذان میں کہنا بدعت ہے اور ایک نئی شریعت بنانا ہے"۔

اسی طرح شیعہ کی کتاب فقہ امام جعفر صادق لمحمد جواد ۱۶۶/۱ ط ایران میں لکھا ہے:

وَاتَّفَقُوْا جَمِيْعًا عَلٰى اَنَّ قَوْلَ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ لَيْسَ مِنْ فُصُوْلِ الْاَذَانِ وَاَجْزَائِهِ وَاَنَّ مَنْ اَتٰى بِنِيَّةِ اَنَّهٗ مِنَ الْاَذَانِ فَقَدْ اَبْدَعَ فِي الدِّيْنِ وَاَدْخَلَ فِيْهِ مَا هُوَ خَارِجٌ عَنْهُ

"تمام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ کلمات اذان اور اس کے اجزاء میں سے نہیں ہے اور اس پر بھی کہ جو شخص ان الفاظ کو اس نیت سے کہتا ہے کہ یہ بھی اذان میں شامل ہیں تو اس نے دین میں بدعت نکالی اور وہ بات دین میں داخل کر دی جو اس سے خارج تھی"۔

اسی طرح شیعہ محدث و مفسر شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن حسن الطوسی نے اپنے

فتاوی النہایہ فی مجرد الفقہ والفتاوی ص ۶۹ ط قم ایران میں لکھا ہے:

وَاَمَّا مَا رُوِیَ فِی شَوَاذِّ الْاَخْبَارِ مِنْ قَوْلِ "اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ وَاٰلَ مُحَمَّدٍ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" فَمِمَّا لَا يُعْمَلُ عَلَيْهِ فِي الْاَذَانِ وَالْاِقَامَةِ فَمَنْ عَمِلَ بِهَا كَانَ مُخْطِئًا

"شاذ روایات میں یہ "قول اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ آلَ مُحَمَّدٍ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" جو مروی ہے' یہ ان کلمات میں سے ہے جن پر اذان اور اقامت میں عمل نہیں کیا جاتا جس شخص نے اس پر عمل کیا وہ غلطی پر ہے"۔

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات متحقق ہوتی ہے کہ اذان کے کلمات شعائر اسلام میں سے ہیں اور یہ اللہ کے رسول ﷺ نے مقرر کیے ہیں۔ کسی شخص کو ان میں نہ اضافہ کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی کمی کی۔ جو شخص اذان میں اضافہ یا کمی کرتا ہے' وہ بدعتی ہے اور موجب لعنت ہے۔ فقہ جعفریہ کی امہات الکتب میں بھی یہی اذان جو اہل سنت کے ہاں مشروع ہے' نقل کی گئی ہے سوائے حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ کے اور فقہ جعفریہ کی رو سے "اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ" کے کلمات کا اذان میں درج کرنا گناہ ہے اور بدعت ہے بلکہ یہ الفاظ لعنتی فرقہ مفوضہ نے گھڑے ہیں اور اذان میں داخل کر دیے ہیں حالانکہ یہ کلمات اذان نہیں ہیں۔ ہم دعوے کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ' سیدنا حسن رضی اللہ عنہ' سیدنا حسین رضی اللہ عنہ' علی زین العابدین وغیرہ جو شیعہ کے ہاں ائمہ اہل بیت' معصوم عن الخطاء شمار ہوتے ہیں۔ ان سے صحیح سند کے ساتھ تو کیا ضعیف سند کے ساتھ بھی ان کلمات کا اذان میں کہنا درست ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی نماز کے لیے اذان دی جاتی تھی تو کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات اذان میں کہلوائے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ اذان میں یہ کلمات نہیں کہتے' ان کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ اہل بیت رضی اللہ عنہم سے محبت نہیں ہے۔ یہ بات سراسر غلط ہے اگر محبت کی یہ علامت ہے کہ جس کے ساتھ محبت ہو' اس کا نام اذان میں لیا جائے تو ان حضرات کو سیدہ فاطمہ

رضی اللہ عنہا اور ان کی تمام اولاد' اسی طرح ان کے مزعومہ بارہ امام اور ان کی اولاد کا نام بھی اذان میں لینا چاہیے تاکہ کھل کر محبت کا اظہار ہو اور اگر اس طرح اذان شروع کر دی جائے تو ہو سکتا ہے ۲۴ گھنٹے میں اذان بھی مکمل نہ ہو اور نماز کا وقت ہی نہ ملے۔ اوپر شیعہ مجتہدین سے صراحت کے ساتھ نقل کر دیا ہے کہ جو بات امر واقع میں درست ثابت ہو' اس کو اذان میں اپنی طرف سے داخل کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اذان کے کلمات اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں اور متعین ہیں۔ ان میں اضافہ کرنا اپنے آپ کو لعنت کا حقدار بنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو سنت نبوی پر عمل کی کماحقہ توفیق عنایت فرمائے۔

(مجلۃ الدعوۃ' جون / ۱۹۹۴ء)

اکیلے آدمی کا اذان اور اقامت کہہ کر نماز ادا کرنا

س کیا اکیلا آدمی جب نماز ادا کرتا ہے تو اذان و اقامت کہہ سکتا ہے؟

(ماسٹر مطلوب صاحب' اٹک)

ج اگر نمازی اکیلا نماز پڑھے تو اذان و اقامت کہہ سکتا ہے۔ سنن ابو داؤد کی صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَعْجَبُ رَبُّكُمْ مِنْ رَاعِي غَنَمٍ فِي رَأْسِ شَظِيَّةٍ بِجَبَلٍ يُؤَذِّنُ بِالصَّلٰوةِ وَيُصَلِّي فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ أُنْظُرُوْا اِلٰى عَبْدِيْ هٰذَا يُؤَذِّنُ وَيُقِيْمُ الصَّلٰوةَ يَخَافُ مِنِّيْ فَقَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِيْ وَاَدْخَلْتُهُ الْجَنَّةَ

"تمہارا رب ایسے چرواہے سے خوش ہوتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر اپنا ریوڑ چراتا ہے اور نماز کے لیے اذان کہتا ہے اور نماز ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے میرے اس بندے کی طرف دیکھو جو اذان و اقامت نماز کے لیے مجھ سے ڈرتے ہوئے کہتا ہے میں نے اپنے اس بندے کو معاف کر دیا اور میں نے اسے جنت میں داخل کر دیا ہے"۔ (سنن ابو داؤد باب الاذان فی السفر ۲/۴ (۱۲۰۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آدمی اکیلا نماز پڑھے تو وہ اذان و اقامت کہہ سکتا ہے۔ یہ اس کے لیے بخشش کا ذریعہ بنتی ہیں۔ (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۲ء)

كتاب
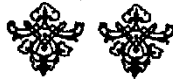
الصَّلٰوةِ

زبان سے نیت کرنے کا حکم

س: کیا نماز ادا کرتے ہوئے زبان سے نیت اس طرح کرنا کہ چار رکعت نماز فرض وقت نماز ظہر واسطے اللہ تعالیٰ کے پیچھے اس امام کے اللہ اکبر' جائز ہے یا نہیں کیا رسول اللہ سے اس بات کا کوئی ثبوت مروی ہے وضاحت فرمائیں۔ (ابو علی' سولت)

ج: نیت کا معنی قصد اور ارادہ ہے تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ قصد و ارادہ دل کا فعل ہے نہ کہ زبان کا امام ابن قیم راقم ہیں کہ:

اَلنِّيَّةُ هِيَ الْقَصْدُ وَالْعَزْمُ عَلٰى فِعْلِ الشَّيْءِ وَمَحَلُّهَا الْقَلْبُ لَا تَعَلُّقَ لَهَا بِاللِّسَانِ اَصْلاً (اغاثة اللهفان' ۱/۱۵۶)

"نیت کسی کام کے قصد و پختہ ارادے کا نام ہے اور اس کا محل دل ہے اور زبان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں"۔

مولانا انور شاہ کاشمیری حنفی نے بھی فیض الباری ۱/۸ پر لکھا ہے کہ فَالنِّيَّةُ اَمْرٌ قَلْبِيٌّ "نیت دل کا معاملہ ہے"۔ لہٰذا اگر نمازی نے دل سے نیت کر لی تو تمام ائمہ کے نزدیک اس کی نماز صحیح ہو گی زبان سے نیت کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی یہ نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ سے ثابت ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد ۱/۲۰۱ پر لکھا ہے:

كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلٰوةِ قَالَ : اللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَمْ يَقُلْ شَيْئًا قَبْلَهَا وَلَا تَلَفَّظَ بِالنِّيَّةِ اَلْبَتَّةَ وَلَا قَالَ اُصَلِّيْ لِلّٰهِ صَلٰوةَ كَذَا مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ اِمَامًا اَوْ مَاْمُوْمًا' وَلَا قَالَ اَدَاءً وَلَا قَضَاءً' وَلَا فَرْضَ الْوَقْتِ' وَهٰذِهٖ عَشْرُ بِدَعٍ لَمْ يَنْقُلْ عَنْهُ اَحَدٌ قَطُّ بِاِسْنَادٍ صَحِيْحٍ وَّلَا ضَعِيْفٍ وَّلَا مُسْنَدٍ وَّلَا مُرْسَلٍ لَفْظَةً وَاحِدَةً مِنْهَا اَلْبَتَّةَ' بَلْ وَلَا عَنْ اَحَدٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ وَلَا اسْتَحْسَنَهٗ

اَحَدٌ مِنَ التَّابِعِیْنَ وَلَا الْاَئِمَّةُ الْاَرْبَعَةُ۔

"نبی کریم ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے اور اس سے پہلے کچھ نہ کہتے اور نہ زبان سے نیت کرتے اور نہ یوں کہتے کہ میں چار رکعت فلاں نماز منہ طرف قبلہ کے امام یا مقتدی ہو کر پڑھتا ہوں اور نہ ادا یا قضا یا فرض وقت کا نام لیا ہو یہ دس بدعات ہیں اس بارے میں ایک لفظ بھی کسی نے رسول اللہ ﷺ سے سند صحیح یا سند ضعیف یا مرسل سے قطعاً نقل نہیں کیا بلکہ آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک سے بھی ایسا منقول نہیں اور نہ ہی کسی تابعی نے اسے پسند کیا اور نہ ائمہ اربعہ نے"۔

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی حنفی لکھتے ہیں کہ:

"و حال آنکه از آن سرور علیه و علی اله الصلاة والسلام ثابت است نه بروایت صحیح و نه بروایت ضعیف و نه از اصحاب کرام و تابعین عظام که بزبان نیت کرده باشند بلکه چون اقامت می گفتند تکبیر تحریمه میفر مودند پس نیت بزبان بدعت باشد"۔

"زبان سے نیت کرنا رسول اللہ ﷺ سے سند صحیح بلکہ سند ضعیف سے بھی ثابت نہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ زبان سے نیت نہیں کرتے تھے بلکہ جب اقامت کہتے تو صرف اللہ اکبر کہتے تھے زبان سے نیت بدعت ہے"۔
(مکتوبات دفتر اول حصہ سوم مکتوب نمبر ۱۸۶ ص ۷۳)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَلَوْ مَکَثَ اَحَدُهُمْ عُمُرَ نُوْحٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ یُفَتِّشُ هَلْ فَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوْ اَحَدٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ شَیْئًا مِنْ ذٰلِكَ لَمَا ظَفَرَ بِهٖ اِلَّا اَنْ یُجَاهِرَ بِالْكَذِبِ الْبُحْتِ وَلَوْ كَانَ فِیْ هٰذَا خَیْرٌ لَسَبَقُوْنَا اِلَیْهِ وَلَدَلُّوْنَا عَلَیْهِ۔

"اگر کوئی انسان سیدنا نوح علیہ السلام کی عمر کے برابر تلاش کرتا رہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے زبان سے نیت کی ہو تو وہ ہرگز کامیاب نہیں ہوگا سوائے سفید جھوٹ بولنے کے اگر اس میں بھلائی ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب سے پہلے کرتے اور ہمیں بتا کر جاتے"۔

(اغاثۃ اللھفان ۱/۱۵۸) (مجلہ الدعوۃ' اکتوبر / ۱۹۹۲ء)

بیل بوٹے والی جائے نماز پر نماز پڑھنے کا حکم

س جس جائے نماز پر بیل بوٹے و نقش و نگار اور بعض مساجد کی تصاویر بنی ہوتی ہیں' ان پر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

(ابو موسیٰ عبدالرحمٰن گوجرانوالہ' صوفی محمد ندیم فیصل آباد)

ج ایسی جائے نمازوں پر نماز ادا کرنا بہتر نہیں ہے۔ خواہ وہ تصاویر بیل بوٹے ہوں یا بعض مساجد کی کیونکہ یہ تصاویر انسان کے ذہن اور دل کو اپنی طرف مشغول کرنے کا سبب بنتی ہیں جس سے نمازی کے خشوع میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اس کی دلیل بخاری شریف کی یہ حدیث ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک تصاویر والا پردہ تھا جس کے ساتھ انہوں نے اپنے گھر کو ایک طرف ڈھانپا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

أَمِيْطِيْ عَنَّا قِرَامَكِ هٰذَا فَإِنَّهُ لَا يَزَالُ تَصَاوِيْرُهُ تَعْرِضُ لِيْ صَلَاتِيْ

"کہ ہم سے اس پردے کو ہٹا دو۔ اس کی تصویریں نماز میں میرے سامنے آتی رہتی ہیں"۔ (بخاری کتاب الصلوۃ)

علامہ صنعانی لکھتے ہیں:

وَفِي الْحَدِيْثِ دَلَالَةٌ عَلٰى إِزَالَةِ مَا يُشَوِّشُ عَلَى الْمُصَلِّيْ صَلَاتَهُ مِمَّا فِيْ مَنْزِلِهٖ أَوْ فِيْ مَحَلِّ صَلَاتِهٖ

"اس حدیث میں دلیل ہے کہ ہر وہ چیز جو نمازی کو نماز سے غافل کر دے' اس کو دور کر دینا چاہیے خواہ وہ چیز اس کے مکان میں ہو یا نماز کی جگہ میں"۔

(سبل السلام ۱/۲۵۲)

دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ دھاری دار چادر میں نماز پڑھی۔ نماز میں اس چادر کی دھاریوں کی طرف ایک نظر دیکھا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا میری یہ چادر ابو جہم کے پاس لے جاؤ اور اس سے ایک سادہ چادر لے آؤ۔ اس چادر نے تو مجھے میری نماز سے غافل کر دیا۔ (صحیح بخاری' کتاب الصلوۃ)

اس حدیث رسول ﷺ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ نمازی کے سامنے ایسی چیزوں کا ہونا ناپسندیدہ ہے جو نماز میں خلل ڈالیں۔ خواہ وہ تصاویر والی چٹائیاں ہوں یا جائے نماز ہاں یہ بات یاد رہے کہ اگر کوئی شخص ایسی جائے نمازوں پر نماز ادا کر لیتا ہے تو اس کی نماز کو باطل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (از: ع۔ع' (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۵ء)

مسئلہ رفع یدین اور آمین بالجہر

س: ہمارے محلے میں ہر بدھ جماعت اسلامی والوں کا درس ہوتا ہے آج میں بھی شوقیہ چلی گئی وہاں جو سوال زیر بحث آیا وہ یہ کہ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ رفع الدین اور آمین کہیں یا نہ کہیں آپ کی مرضی ہے کافی بحث ہوئی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہمارے نبی پاک ﷺ نے اس لیے رفع یدین کیا تھا کہ کفار آپ کے پیچھے بغلوں میں بت دبا کر کھڑے ہو جاتے تھے اس لیے آپ نے رفع یدین کیا اور کروایا۔ اس کے بعد آپ نے ایسا کرنا چھوڑ دیا کیا ایسا ہی ہے؟ پھر یہ کہ کیا آپ نے واقعی چھوڑ دیا تھا اور انہوں نے مزید یہ بھی کہا کہ امام شافعی اور امام مالک کے درمیان بھی یہ بحث جاری رہی اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں مفصل جواب دیں۔ (عذرا یاسمین' شازیہ یاسمین' بہاولپور)

ج: صورت مسئولہ میں جو دو مسئلے ذکر کیے گئے ہیں وہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہیں اور صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ اور مسئلہ رفع الیدین تو ایسا ہے جو آپؐ کی متواتر احادیث سے ثابت ہے اور کسی بھی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ آپ

نے کبھی رفع الیدین کو چھوڑا ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ :

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ وَإِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوْعِ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ رَفَعَهُمَا كَذَالِكَ.))

"تحقیق رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے۔ اور جب رکوع کے لیے تکبیر کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اسی طرح اٹھاتے تھے"۔ (بخاری (۷۳۵) مسلم ۴ : ۹۳۔۹۳' مسند احمد ۲ : ۸' ۲ : ۱۸' ۶۲' ۷ '۱۴' موطا امام مالک ۱ : ۷۵' مصنف عبدالرزاق (۲۵۱۷' ۲۵۱۸)' ابنِ ماجہ (۸۵۸)' دارمی ۱ : ۲۸۵' دار قطنی ۱ : ۲۸۷' بیہقی ۲ : ۶۹' شرح السنہ ۵۵۹' مسند ابو عوانہ ۲/ ۹۱' ابوداؤد (۷۲۱)' نسائی ۲/ ۱۲۲' ۱۸۲' ۱۹۴' ۲۰۶' ۲۳۱۔)

اسی طرح رفع الیدین کی روایت سیدنا وائل بن حجرؓ سے سنن ابو داؤد ۱/ ۱۹۳ (۷۲۶) نسائی اور مسلم ۱/ ۱۷۳ میں بھی مروی ہے اور سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام ہیں۔ چنانچہ علامہ بدر الدین عینی حنفی بخاری کی شرح عمدۃ القاری ۳/ ۹ پر رقمطراز ہیں کہ :

وَائِلُ بْنُ حُجْرٍ اَسْلَمَ فِي الْمَدِيْنَةِ فِيْ سَنَةِ تِسْعٍ مِنَ الْهِجْرَةِ

"وائل بن حجر ۹ ہجری میں مدینہ میں مسلمان ہوئے"۔

یہ حضرموت کے علاقہ میں رہنے والے تھے اور حضرموت سے مدینہ تک اس وقت کی مسافت کے لحاظ سے چھ ماہ کا سفر تھا جب پہلی دفعہ آپ کے پاس آئے اور آپ سے دین کے احکامات سیکھ کر دوبارہ اپنے وطن واپس چلے گئے پھر اس کے بعد ۱۰ھ میں دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیان کرتے ہیں :

((ثُمَّ جِئْتُ بَعْدَ ذَالِكَ فِيْ زَمَانٍ فِيْهِ بَرْدٌ شَدِيْدٌ فَرَاَيْتُ النَّاسَ عَلَيْهِمْ جُلُّ الثِّيَابِ تَحَرَّكُ اَيْدِيْهِمْ تَحْتَ الثِّيَابِ.))

"پھر میں اس کے بعد ایک زمانے میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا ان دنوں سخت سردی تھی میں نے لوگوں کو دیکھا کہ ان کے اوپر موٹی چادریں تھیں۔ ان کے ہاتھ کپڑوں کے نیچے سے حرکت کرتے تھے"۔ (ابو داؤد (۷۲۷) ۱: ۱۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ ۱۰ھ تک آپ سے رفع الیدین ثابت ہے اس کے بعد آپ وفات پا گئے جو حضرات نسخ کے قائل ہیں وہ ۱۰ھ کے بعد کی عدم رفع الیدین کی کوئی صحیح روایت پیش کریں۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے رفع الیدین کا حکم اس لیے دیا کہ کافر آپ کے پیچھے بت لے کر کھڑے ہو جاتے تھے جاہلوں کا پھیلایا ہوا بہت بڑا جھوٹ ہے جسے بیان کرنے والا اگر کوئی عالم ہے تو اسے خدا کے عذاب سے ڈرنا چاہیے ایسی بات کا وجود تو پورے ذخیرہ حدیث میں کہیں بھی نہیں۔ نہ کسی صحیح حدیث میں نہ ہی کسی ضعیف حدیث میں محض لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے کے شوق میں اور سیاسی اور جمہوری مصلحتوں میں آ کر نبی اکرم ﷺ سے جھوٹی بات منسوب کرنا اور اس پر اصرار کرنا خدا کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ ایسی مصلحتوں کا دنیا میں تو کوئی فائدہ نہ ہو گا لیکن آخرت میں لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر سنت رسول ﷺ کے خلاف ایسی مہم بازی کا جو نتیجہ ملے گا' اس سے پھر وہاں کوئی بچانے والا نہ ہو گا۔

دوسری بات یہ ہے کفار کا آپ کے پیچھے آ کر نماز کے لیے کھڑا ہونا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ اگر رفع الیدین اس لیے کیا کہ لوگ بغلوں میں جو بت رکھتے تھے ان کو گرانے کا یہ ایک طریقہ تھا تو کیا پہلی دفعہ تکبیر تحریمہ کے ساتھ جو رفع یدین کی جاتی ہے اس وقت بت نہیں گرتے تھے۔ جو لوگ پہلی دفعہ رفع یدین کے وقت بت نہیں گرنے دیتے وہ رکوع کی رفع یدین کے وقت کیسے گرنے دیں گے۔

نبی کریم ﷺ سے ترک رفع الیدین کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ امام جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز کتاب الازھار المتناثرۃ فی الاخبار المتواترۃ میں رفع یدین کی حدیث کو متواتر کہا

ہے۔ اسی طرح نظم المتناثر میں الحدیث المتواتر اور تدریب الراوی وغیرہ ملاحظہ ہوں۔ امام شافعی اور امام مالک تو صحیح روایت کے مطابق رفع یدین کے قائل و فاعل تھے ان میں اس مسئلہ پر کوئی اختلاف اور بحث تمحیص مروی نہیں ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی رفع یدین والی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

وَبِهٰذَا يَقُوْلُ اَهْلُ الْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُمْ ابْنُ عُمَرَ وَجَابِرُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ ' وَاَبُوْهُرَيْرَةَ وَاَنَسٌ وَابْنُ عَبَّاسٍ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الزُّبَيْرِ وَغَيْرُهُمْ وَمِنَ التَّابِعِيْنَ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ وَعَطَاءٌ وَّطَاوسٌ وَمُجَاهِدٌ وَّنَافِعٌ وَسَالِمُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ وَ سَعِيْدُ بْنُ جُبَيْرٍ وَغَيْرُهُمْ وَبِهٖ يَقُوْلُ مَالِكٌ وَّمُعْمَرٌ وَالْاَوْزَاعِيُّ وَابْنُ عُيَيْنَةَ وَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ الْمُبَارَكِ وَالشَّافِعِيُّ وَاَحْمَدُ وَاِسْحَاقُ

"یہی بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اہل علم کہتے ہیں۔ ان میں سے ابنِ عمرؓ جابر بن عبداللہ' ابو ہریرہ' انس' ابنِ عباس' عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ اور تابعین میں سے حسن بصری عطا' طاؤس' مجاہد' نافع' سالم' سعید بن جبیر رحمہم اللہ وغیرہ۔ اور یہی بات امام مالک' امام معمر' امام اوزاعی' امام ابنِ عینیہ' امام عبداللہ بن مبارک' امام شافعی' امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کہتے ہیں"۔

(ترمذی ۲/ ۳۷)

امام ترمذی رحمہ اللہ کی اس صراحت سے معلوم ہو گیا کہ امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل وغیرہ بھی رفع یدین کے قائل و فاعل تھے۔

لہٰذا یہ بات کہنی کہ امام شافعی اور امام مالک کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف تھا ختم نہیں ہو سکا سرا سر غلط اور بے بنیاد ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ بفرض محال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ شافعی و مالک میں یہ اختلاف تھا تو پھر بھی ان کے اختلاف کی وجہ سے مسئلہ رفع یدین پر کوئی آنچ نہیں آسکتی کیونکہ یہ آپ کی

متواتر سنت ہے جو آپ نے کبھی بھی ترک نہیں کی اور آپ کی حدیث کے مدمقابل تو کسی امام کی بات قابل حجت نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ کے مقابل میں امام کی بات کو ترجیح دیتا ہے تو گویا اس نے امام جو کہ امتی ہے اس کا درجہ نبی کریم ﷺ سے بڑا سمجھا ہے۔ اس کے علاوہ آمین بالجہر کی بھی احادیث کئی ایک ہیں۔ سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ:

((سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَءَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ فَقَالَ اٰمِيْنَ مَدَّ بِهَا صَوتَهُ.))

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ نے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ پڑھا اور آمین کے ساتھ اپنی آواز کو دراز کیا"۔ (ابو داؤد (۹۳۲)، ترمذی (۲۴۸)، دارمی ۱: ۲۸۴، دارقطنی ۱: ۳۳۴، ۳۳۳، بیہقی ۱: ۵۷، ابن ابی شیبہ ۲: ۴۲۵)

بعض روایتوں میں مَدَّ بِهَا صَوْتَهُ کی جگہ رَفَعَ بِهَا صَوْتَهُ آتا ہے یعنی اپنی آواز کو بلند کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ:

((اٰمَّنَ ابْنُ الزُّبَيْرِ وَمَنْ وَرَآئَهُ حَتّٰى اَنَّ لِلْمَسْجِدِ لَلَجَّةً.))

"عبداللہ بن زبیر اور ان کے مقتدیوں نے اس قدر بلند آواز سے آمین کہی کہ مسجد لرز گئی"۔ (بخاری ۲: ۲۶۲، مسند شافعی ۲۱۲، ۱۵، بیہقی ۲: ۵۹)

اسی طرح حضرت عطاء تابعی رحمہ اللہ سے مروی ہے جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے استاذ ہیں کہتے ہیں کہ:

"میں نے مسجد حرام میں دو سو (۲۰۰) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پایا جب امام وَلَا الضَّالِّيْنَ کہتا تو سب صحابہ بلند آواز سے آمین کہتے تھے"

بیہقی ۲: ۵۹، ابن حبان (۱۹۹۶، ۱۹۹۷)

((عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا حَسَدَتْكُمُ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ مَا حَسَدَتْكُمْ عَلَى السَّلَامِ وَالتَّاْمِيْنِ.))

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس قدر یہودی آمین اور سلام پر حسد کرتے ہیں اس قدر کسی اور چیز پر حسد نہیں کرتے"۔

(مصباح الزجاجہ ۱/ ۲۹۷)

امام بوصیری رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے تمام رواۃ سے امام مسلم نے حجت لی ہے۔ یہی روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مسند احمد ۶ : ۱۳۴، ۱۳۵، بیہقی ۲ : ۵۶، مجمع الزوائد، ابن ماجہ (۸۵۶)، صحیح ابن خزیمہ ۵۷۴ وغیرہ میں موجود ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ آمین رفع یدین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہیں جو کہ منسوخ نہیں ہیں بلکہ آپ ان پر ہمیشہ عمل درآمد کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر صحیح معنوں میں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

(مجلۃ الدعوۃ، اگست/ ۱۹۹۲ء)

مسئلہ رفع الیدین

نماز میں چار مقامات پر رفع الیدین کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ تکبیر تحریمہ کے وقت، رکوع جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے اور تیسری رکعت کو اٹھتے ہوئے اور اس کے خلاف ایک بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ ((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَإِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوْعِ وَإِذَا رَفَعَ رَاسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ رَفَعَهُمَا كَذٰلِكَ وَقَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وَكَانَ لَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي السُّجُوْدِ))

"سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے اور جب رکوع کے لیے تکبیر کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اسی طرح اٹھاتے اور سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہتے اور سجدوں میں رفع یدین نہ

کرتے تھے"۔ (بخاری ۱/۱۰۲، مسلم ۱/۱۶۸)

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ رفع یدین کرنا نبی اکرم ﷺ کی سنت ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ لوگ بغلوں میں بت رکھ کر نماز پڑھتے تھے' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان سے رفع یدین کرائی۔ تو غور کرنے کی بات ہے اللہ کے رسول ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے کہ وہ بت رکھ کر نماز پڑھتے تھے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توہین ہے۔ دوسری بات یاد رہے کہ اس قصے کا ثبوت کسی صحیح حدیث سے تو درکنار کسی ضعیف حدیث سے بھی نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں اگر بعض لوگ بغلوں میں بت رکھتے تھے تو جب وہ پہلی دفعہ رفع الیدین کرنے سے نہیں گرتے تھے تو وہ دوسری دفعہ رفع الیدین کرنے سے بھی نہیں گرتے تھے۔ وہ تو اسی وقت گر جانے چاہئیں تھے جب تکبیر تحریمہ کے لیے ہاتھ اٹھائے جاتے تھے۔ بت گرانے کے لیے اس کے بعد رکوع میں اور رکوع کے بعد ہاتھ اٹھوانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ (مجلۃ الدعوۃ' مئی/ ۱۹۹۴ء)

رفع الیدین کا مسئلہ

س میں حنفی مسلک سے تعلق رکھتا تھا اب الحمد للہ میں اہل حدیث ہو گیا ہوں۔ میرا سوال رفع الیدین کے بارے میں ہے۔ آپ اس کی حقیقت قرآن و سنت کی روشنی میں واضح کریں اور میرے لیے کوئی ایک ایسی کتاب تجویز کریں جس میں نماز اور اس سے متعلق مسائل موجود ہوں۔ (علی رضا ۱۸۸ سی' شاہ رکن عالم کالونی' ملتان)

ج نماز کے افتتاح کے وقت' رکوع جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت اور دو رکعت پڑھ کر اٹھتے وقت رفع الیدین کرنا سنت متواترہ ہے۔ تقریباً وہ تمام کتب حدیث جن میں باب صفۃ النبی ﷺ موجود ہے۔ ان میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَرْفَعُ یَدَیْہِ حَذْوَ مَنْکِبَیْہِ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاۃَ وَاِذَا کَبَّرَ لِلرُّکُوْعِ وَاِذَا رَفَعَ رَاسَہٗ مِنَ الرُّکُوْعِ رَفَعَھُمَا کَذٰلِکَ وَقَالَ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ وَکَانَ لَا یَفْعَلُ ذٰلِکَ فِی السُّجُوْدِ))

"سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے اور جب رکوع کے لیے تکبیر کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اسی طرح اٹھاتے اور سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ کہتے اور سجدوں میں رفع یدین نہ کرتے تھے"۔ (بخاری ۱/۱۰۲، مسلم ۱/۱۶۸)

علاوہ ازیں اس کے متعلق بے شمار احادیث ہیں اور ائمہ محدثین نے اس مسئلہ کو متواتر احادیث میں شمار کیا ہے ملاحظہ ہو:

قَطْفُ الْاَزْھَارِ الْمُتَنَاثِرَۃِ مِنَ الْاَحَادِیْثِ الْمُتَوَاتِرَۃِ

اور شروع سے لے کر آج تک اہل حدیث کی یہ علامت رہی ہے جیسا کہ امام ابو احمد الحاکم محمد بن محمد احمد بن اسحاق نے اپنی کتاب شِعَارُ اَصْحَابِ الْحَدِیْثِ میں ص ۷۴ رفع الیدین کا باب باندھ کر بتایا ہے۔ اسی طرح امام حاکم، امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھیوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

یُظْھِرُوْنَ شِعَارَ اَھْلِ الْحَدِیْثِ مِنْ اِفْرَادِ الْاِقَامَۃِ وَرَفْعِ الْاَیْدِیْ فِی الصَّلٰوتِ وَغَیْرِ ذٰلِکَ

"امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھی اہل حدیث کے شعار (علامتیں) اکہری اقامت اور رفع یدین وغیرہ کا علی الاعلان اظہار کرتے تھے"۔ (سیر اعلام النبلاء ۱۲/۳۶۵)

لہٰذا رفع یدین سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور شروع سے لے کر آج تک کتاب و سنت کے متوالوں کا عمل ہے۔ مسئلہ رفع یدین کی تفصیل کے لیے محدث العصر امام محمد گوندلوی رحمہ اللہ کی کتاب اَلتَّحْقِیْقُ الرَّاسِخُ فِی اَنَّ اَحَادِیْثَ رَفْعِ الْیَدَیْنِ لَیْسَ

لَهَا نَاسِخٌ اور استاذ الاساتذہ حافظ عبدالمنان نوری پوری حفظہ اللہ کی کتاب "مسئلہ رفع الیدین۔ تحریری مناظرہ" وغیرہ ملاحظہ کریں۔ یا نماز کے عام فہم مسائل کے لیے صلوۃ الرسول (مخرج) حکیم صادق سیالکوٹی اور رسول اکرم ﷺ کی نماز از مولانا اسماعیل سلفی ملاحظہ کریں۔ ان شاء اللہ العزیز کافی معلومات حدیث نبوی ﷺ کے مطابق ملیں گی۔

س رفع الیدین کی روایت کرنے والے سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتائیں۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی روایت عدم رفع الیدین کے بارے میں بتائیں کہاں تک صحیح ہے؟ فقہ حنفی اور حدیث کا تقابل بھی چند مسائل میں بتائیں۔

(حافظ ارشد عزیز سلفی۔ ساہیوال)

ج سیدنا وائل بن حجر یمن کے عظیم شہزادے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے آنے سے تین دن قبل ان کے متعلق بشارت دی جیسا کہ کتاب الثقات لابن حبان ۳/۴۲۴، ۴۲۵ اور کتاب مشاہیر علماء الامصار لابن حبان کے ص ۴۴ رقم ۲۷۶ پر مرقوم ہے۔

آپ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی خدمت پر مامور فرمایا تھا اور امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ ۵/۷۰ پر وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ان وفود میں کیا ہے جو ۹ھ میں رسول اکرم ﷺ کے پاس تشریف لائے تھے۔ علامہ عینی نے عمدۃ القاری شرح بخاری ۵/۲۷۴ ط قدیم میں فرمایا ہے کہ :

وَوَائِلُ بْنُ حُجْرٍ اَسْلَمَ فِي الْمَدِيْنَةِ سَنَةَ تِسْعٍ مِنَ الْهِجْرَةِ

"وائل بن حجر رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں ۹ھ میں مسلمان ہوئے"۔

یہ صحابی رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ سے رفع الیدین ذکر کرتے ہیں جیسا کہ صحیح مسلم مع شرح النووی ۱/۱۷۳، ابنِ خزیمہ ۱/۳۴۶، ابنِ حبان ۳/۱۶۷، اور ابی عوانہ ۲/۹۷ وغیرہ پر مروی ہے۔ پھر آپ دوبارہ آئندہ سال (یعنی ۱۰ھ میں) رسول اللہ ﷺ کے پاس

آئے تو پھر رفع الیدین کا مشاہدہ کیا۔ ابن حبان ۱۶۸/۳ اور سنن ابو داؤد وغیرہ میں ہے۔ علامہ سندھی حنفی حاشیہ نسائی ص ۱۴۰ پر راقم ہیں۔

مَالِكُ بْنُ الْحُوَيْرِثِ وَوَائِلُ بْنُ حُجْرٍ مِمَّنْ صَلَّى مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آخِرَ عُمُرِهِ فَرِوَايَتُهُمَا الرَّفْعَ عِنْدَ الرُّكُوعِ وَالرَّفْعَ مِنْهُ دَلِيلٌ عَلَى بَقَائِهِ وَبُطْلَانِ دَعْوَى نَسْخِهِ

"مالک بن الحویرث اور وائل بن حجر رضی اللہ عنہما ان صحابہ میں سے ہیں جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی عمر کے آخری حصہ میں نماز پڑھی اور ان دونوں کی روایت میں رکوع جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے رفع الیدین کا تذکرہ ہے جو رفع یدین کے باقی رہنے اور اس کے منسوخ ہونے کے دعوے کو باطل کرنے کی دلیل ہے"۔

حافظ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب ۳۲/۶ رقم ۷۵۵۵ میں راقم ہیں۔

مَاتَ فِي ولاية معاويه بن ابی سفيان

"وائل رضی اللہ عنہ امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے ایام حکومت میں فوت ہوئے"۔

۲۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے عدم رفع الیدین کے متعلق مروی روایت ضعیف اور ناقابل حجت ہے۔ امام عبداللہ بن مبارک نے کہا کہ یہ ثابت نہیں۔ ترمذی ۵۹/۱ امام احمد نے کہا ضعیف ہے۔ العلل و معرفۃ الرجال ۱۱۲/۱ ۱۱۷ امام ابو حاتم رازی نے کہا (هذا خطاء   علل الحدیث امام ابن حبان نے کہا وَهُوَ فِي الْحَقِيقَةِ أَضْعَفُ شَيْءٍ التَّلْخِيص ۲۲۲/۱ کہ یہ حقیقت میں سب سے زیادہ ضعیف ہے۔ امام ابن قیم نے المنار المنیف میں کہا باطل ہے۔ لہذا یہ روایت قابل حجت نہیں، تفصیل کے لیے استاذ الاساتذہ حافظ عبدالمنان حفظہ اللہ کی کتاب مسئلہ "رفع الیدین تحریری مناظرہ" ملاحظہ کریں۔ ان شاء اللہ تشفی ہو جائے گی۔

۳۔ فقہ حنفی اور احادیث نبویہ کے لیے مولانا محمد جوناگڑھی رحمہ اللہ کی سیف محمدی، شمع محمدی وغیرہ کا مطالعہ کریں۔ (مجلۃ الدعوۃ، اپریل / ۱۹۹۶ء)

نماز میں ہاتھوں کا سینے کے اوپر باندھنا

س نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے' ناف کے اوپر یا سینے کے اوپر باندھے جائیں۔ (آصف حسین راجپوت' سانگھڑ مکان نمبر ۲۵۷ سی)

ج نماز میں ہاتھ سینے کے اوپر باندھنے چاہئیں جو کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے :

((عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى عَلٰى صَدْرِهٖ.))

"وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر باندھے"۔

(صحیح ابنِ خزیمہ (۴۷۹) بیہقی ۲/۳۰)

اس طرح اس روایت کی تائید میں۔ مسند احمد ۵/۲۲۶ پر مروی ہے کہ :

((عَنْ هُلْبٍ: قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْصَرِفُ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ يَسَارِهٖ وَرَاَيْتُهُ قَالَ يَضَعُ هٰذَا عَلٰى صَدْرِهٖ.))

"ھلب صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھا ہوا تھا"۔

اس کی تائید اس مرسل روایت سے بھی ہوتی جسے امام ابو داؤد نے سنن ابو داود (۷۵۶) میں روایت کیا ہے کہ :

((عَنْ طَاؤُسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضَعُ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى يَدِهِ الْيُسْرٰى ثُمَّ يَشُدُّ بَيْنَهُمَا عَلٰى صَدْرِهٖ وَهُوَ فِي الصَّلٰوةِ.))

سیدنا طاؤس فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ اپنا دایاں ہاتھ نماز میں اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ کر اپنے سینے پر باندھتے تھے"۔

ان احادیث کی رو سے نمازی کو اپنے ہاتھ نماز کے اندر اپنے سینے پر باندھنے چاہئیں۔ اور زیر ناف ہاتھ باندھنے والی روایت انتہائی ضعیف ہے۔ امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ متفق علی ضعفه کہ اس حدیث کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے اور جو روایت تَحْتَ السُّرَّہ والی ابو داؤد میں مروی ہے اس میں عبدالرحمٰن بن اسحاق الواسطی ضعیف راوی ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' اگست / ۱۹۹۳ء)

سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی

س نماز جنازہ میں سورۃ الفاتحہ لازمی پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ احادیث سے جواب دیں۔

۲۔ نماز میں مقتدی کو سورۃ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنی چاہیے یا کہ نہیں؟

(ایک سائل از بہاولپور)

ج آپ کے سوالات کے ترتیب وار جوابات حاضر خدمت ہیں۔

۱) طلحہ بن عبداللہ بن عوف سے روایت ہے انہوں نے کہا:

((صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلٰى جَنَازَةٍ فَقَرَأَ فِيْهَا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَاَخَذْتُ بِيَدِهٖ فَقُلْتُ تَقْرَأُ بِهَا؟ قَالَ اِنَّهَا سُنَّةٌ وَحَقٌّ.))

"میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی۔ انہوں نے اس میں سورۂ فاتحہ پڑھی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا آپ فاتحہ پڑھتے ہیں تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا بے شک یہ سنت ہے اور حق ہے"۔

(المنتقی لابن جارود(۵۳۴) بخاری مع فتح الباری ۲۰۳/۳ ابو داؤد (۳۱۹۸) نسائی ۷۴/۴' ۷۵ ترمذی (۱۰۲۸) حاکم ۳۵۷/۱ بیہقی ۳۸/۴)

اور اصول حدیث میں یہ بات متحقق ہے کہ جب صحابی رسول ﷺ کہے کہ مِنَ السُّنَّةِ كَذَا اس مسئلہ میں سنت اسی طرح ہے تو وہ مسند و مرفوع روایت سمجھی جاتی ہے۔ یہی بات احناف' شوافع اور جمہور علماء اصولین کے نزدیک درست ہے جیسا کہ

المجموع للنوی ۵/۲۳۲ اور ابنِ الہمام حنفی نے اپنی کتاب "التحریر" میں لکھا اور اس کے شارح ابنِ امیر الحاج نے ۲/۳۳۴ پر لکھا ہے کہ ہمارے متقدمین علماء کے نزدیک یہ بات درست ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنا نبی پاک ﷺ کا عمل تھا۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔

(۲) صحیح احادیث کی رو سے امام ہو یا مقتدی منفرد ست پر ہر نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنا لازمی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

عَنْ عِبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ

"سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہے"۔ (بخاری مع فتح الباری ۲/۲۳۶، ۲۳۷، ۲۴۳، مسلم ۱/۲۹۵، ابو داؤد (۸۲۲)، نسائی ۲/۱۳۷، ۱۳۸، ترمذی (۲۴۷)، ابنِ ماجہ (۸۳۷)

اس حدیث سے معلوم ہوا جو بھی نمازی خواہ امام ہو یا مقتدی، منفرد ہو یا رکوع پانے والا اگر سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ قسطلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

اَیْ فِیْ كُلِّ رَكْعَةٍ مُّنْفَرِدًا اَوْ اِمَامًا اَوْ مَاْمُوْمًا سَوَاءٌ اَسَرَّ الْاِمَامُ اَوْ جَهَرَ (قسطلانی شرح بخاری ۲/۴۳۹)

"اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ ہر رکعت میں ہر نمازی خواہ امام ہو یا منفرد یا مقتدی، خواہ امام آہستہ پڑھے یا بلند آواز سے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے"۔

اسی طرح علامہ کرمانی شرح بخاری میں فرماتے ہیں۔

وَفِي الْحَدِيْثِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ قِرَاءَةَ الْفَاتِحَةِ وَاجِبَةٌ عَلَى الْاِمَامِ وَالْمَاْمُوْمِ فِي الصَّلٰوةِ كُلِّهَا

اس حدیث میں دلیل ہے کہ سورۃ فاتحہ امام اور مقتدی پر ہر نماز میں واجب ہے"۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

صبح کے وقت ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے اور آپ قراءت کر رہے تھے۔ آپ پر قرأت ثقیل ہو گئی' نماز سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا۔ شاید تم امام کے پیچھے پڑھتے ہو۔ ہم نے عرض کیا جلدی جلدی پڑھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرو کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ ابو داؤد مع عون ۱/۳۰۴ دار قطنی ۱/۳۱۸ حاکم ۱/۲۳۸ بیہقی ۲/۱۶۴ مسند احمد ۵/۳۱۶ ابنِ خزیمہ ۳/۳۰۴ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ہر نمازی پر نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنی لازم ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۴ء)

قرأت کرتے وقت ہر آیت پر وقف کرنا

س: نماز میں امام کو قراءت کرتے وقت کیا ہر آیت پر رکنا چاہیے۔ دلائل کی رو سے واضح کریں۔ (قاری عمر فاروق' ساہیوال)

ج: قرأتِ قرآن کا مسنون اور افضل طریقہ یہی ہے کہ آدمی تلاوت کرتے وقت ہر آیت پر وقف کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ ہر آیت پر ٹھہرتے تھے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے :

((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْطَعُ قِرَاتَهٗ يَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ثُمَّ يَقِفُ ثُمَّ يَقُوْلُ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ثُمَّ يَقِفُ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَرَءَ قَطَّعَ اٰيَةً اٰيَةً يَقُوْلُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ثُمَّ يَقِفُ.))

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب قراءت کرتے تو ہر آیت کو علیحدہ علیحدہ پڑھتے۔ آپ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھتے پھر ٹھہر جاتے پھر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

کہتے پھر وقف کرتے پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہتے پھر وقف کرتے"۔ (مشکوۃ مع تنقیح الرواۃ ۲/۱۱، مسند احمد ۲/۳۰۲، ترمذی ۵/۱۷۰، حاکم ۱/۲۲، ابن خزیمہ ۱/۲۴۷، بیہقی ۲/۴۴، دارقطنی ۱/۳۱۳، طحاوی ۱/۱۳۸، ابو داؤد ۱/۵۶۷)

ایک روایت میں ہے نبی ﷺ جب قرأت کرتے، ہر آیت کو الگ الگ کرتے (مثلاً بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہتے پھر وقف کرتے۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح علی شرط الشیخین اور امام دارقطنی نے صحیح الاسناد اور امام نووی نے اسے صحیح کہا ہے۔ المجموع ۳/۳۳۳۔

امام سیوطی فرماتے ہیں:

قَالَ الْبَیْهَقِیُّ فِی الشُّعَبِ وَاُخَرُوْنَ اَلْاَفْضَلُ الْوُقُوْفُ عَلَی الْاٰیَاتِ اِتِّبَاعًا هَدْیَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَسُنَّتَهٗ

"امام بیہقی نے شعب الایمان میں اور دیگر اہل علم نے کہا ہے رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں ہر آیت پر وقف افضل ہے"۔ (الاتقان صفحہ ۱۲۲) (مجلۃ الدعوۃ، دسمبر/ ۱۹۹۳ء)

امام ابو عمر الدوانی نے فرمایا:

وَقَدْ کَانَ جَمَاعَةٌ مِنَ الْاَئِمَّةِ السَّلَفِیِّیْنَ وَالْقُرَّاءِ الْعَافِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْقَطْعَ عَلَیْهِنَّ

"ائمہ سلف اور قراء کرام کی ایک جماعت آیات پر وقف مستحب سمجھتی ہے"۔

(ارواء الغلیل ۲/۶۲)

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ امام ہو یا منفرد یا نمازی غرض قرأت کرتے وقت آیات پر وقف کرنا چاہیے۔ یہی طریقہ افضل ہے۔

جہری نماز میں قرآنی آیات کا جواب دینا

س: نماز جمعہ یا کسی بھی جہری نماز میں جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی اور

اسی طرح دیگر سورتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو مقتدی بھی جواب دیتے ہیں کیا مقتدی کا آیت سن کر جواب دینا کسی حدیث سے ثابت ہے۔ (محمد یوسف 'کھٹیالہ شیخاں)

ج سنن ابو داؤد میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے جو یہ روایت آتی ہے کہ:

((اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا قَرَءَ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی قَالَ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی.))

نبی کریم ﷺ جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی پڑھتے تو کہتے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی"۔

یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ابو اسحاق سبیعی جو کہ مدلس ہے اور صیغہ عن سے روایت کرتا ہے اور یہاں تصریح بالسماع نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ثقات رواۃ نے اسے موقوفاً بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں ترمذی شریف میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سورۂ رحمٰن پڑھی اور صحابہ خاموش رہے۔ آپ نے فرمایا یہ سورت میں نے جنوں پر پڑھی۔ فَکَانُوْا اَحْسَنَ مَرْدُوْدًا مِّنْکُمْ تو وہ تم سے اچھا جواب دیتے تھے۔ جب ہر بار میں اس آیت پر پہنچتا تھا ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴾ تو وہ جواب میں کہتے لَا بِشَیْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُکَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ اے ہمارے رب تیری نعمتوں میں سے ہم کسی چیز کو نہیں جھٹلاتے۔ پس تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں (ترمذی ۳۲۹۱ 'ابنِ کثیر ۲۸۹/۴ 'ابنِ عدی' ۱۰۷۴/۳ 'مستدرک ۴۷۳/۲) میں مروی ہے اور اپنے شواہد کی بنا پر حسن درجہ کی ہے مگر اس میں نماز کا ذکر نہیں ہے۔ یہ عام حالات میں تلاوت کا ذکر ہے اس کے علاوہ ایک اور حسن حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنی بعض نماز میں اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَسِیْرًا کہتے۔

امام حاکم نے اس حدیث کو مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے تلخیص میں ان کی موافقت کی ہے۔

(مستدرک ۲۰۰ '۵۰۱ مسند احمد ۴۸/۶' ابنِ خزیمہ ۸۴۹)

ان احادیث سے یہ بات ثابت معلوم ہوتی ہے کہ جو آدمی قرأت کرے' وہ جواب دے یا عام حالات میں جب تلاوت قرآن ہو تو سامع بھی جواب دے سکتا ہے لیکن مقتدی کا قرآن سن کر جواب دینا مجھے کسی حدیث سے نہیں ملا واللہ اعلم بالصواب

نماز میں قرآن مجید دیکھ کر قرأت کرنا

س: نمازِ تراویح میں قرآن ہاتھ میں اٹھا کر پڑھا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کی کیا دلیل ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ یہ عمل کثیر ہے اور عمل کثیر سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اس بات کی وضاحت فرمائیں۔ (اختر منیر' انجینئرنگ یونیورسٹی' لاہور)

ج: نماز میں قرآن مجید کو اٹھا کر قرأت کرنا جائز و درست ہے لیکن اسے معمول نہیں بنانا چاہیے اس کی دلیل یہ ہے کہ بخاری شریف میں آتا ہے کہ :

((وَ كَانَتْ عَائِشَةُ يَؤُمُّهَا عَبْدُهَا ذَكْوَانُ مِنَ الْمُصْحَفِ.))

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی امامت ان کا غلام ذکوان، قرآن دیکھ کر کرتا تھا"۔

(بخاری ۱/ ۱۷۷)

حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس کی شرح فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ :

وَصَلَهُ اَبُوْ دَاوٗدَ فِي كِتَابِ الْمَصَاحِفِ مِنْ طَرِيْقِ اَيُّوْبَ عَنِ ابْنِ اَبِي مُلَيْكَةَ

ابو داؤد نے کتاب المصاحف میں اس اثر کو بطریق ایوب عن ابنِ ابی ملیکہ اور اسی طرح ابنِ ابی شیبہ نے وکیع عن ہشام بن عروۃ عن ابنِ ابی ملیکہ اور امام شافعی اور عبدالرزق نے بھی اس کو دوسرے واسطوں سے موصولاً بیان کیا ہے۔

امام مروزی نے قیام اللیل ۱۶۸ پر لکھا ہے کہ وَسُئِلَ ابْنُ شِهَابٍ عَنِ الرَّجُلِ يَؤُمُّ النَّاسَ فِيْ رَمَضَانَ فِي الْمُصْحَفِ قَالَ مَا زَالُوْا يَفْعَلُوْنَ ذَالِكَ مُنْذُ كَانَ الْاِسْلَامُ كَانَ خِيَارُنَا يَقْرَؤُوْنَ فِي الْمَصَاحِفِ امام ابنِ شہاب زہری سے ایسے

آدمی کے متعلق سوال کیا گیا جو رمضان میں لوگوں کی امامت قرآن سے دیکھ کر کرتا تھا۔ تو امام زہری نے فرمایا جب سے اسلام آیا ہے اس وقت سے وہ لوگ جو ہم سے بہتر تھے قرأت قرآنِ مجید سے کرتے رہے ہیں۔

اس کے علاوہ امام مروزی نے امام ابراہیم بن سعد' قتادہ' سعید بن مسیب' ایوب' عطاء' یحییٰ بن سعید' عبداللہ بن وہب اور امام احمد بن حنبل سے اس کا جواز نقل کیا ہے۔ نماز میں قرآن مجید سے قرأت کرنے سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک نماز فاسد ہو جاتی ہے لیکن ان کے شاگردوں قاضی ابویوسف اور امام محمد نے اس مسئلہ میں انکی مخالفت کی ہے جیسا کہ ہدایہ ۱/۱۳۷ پر ہے کہ وَاِذَا قَرَأَ الْاِمَامُ مِنَ الْمُصْحَفِ فَسَدَتْ صَلَاتُهٗ عِنْدَ اَبِی حَنِیْفَةَ وَقَالَا هِیَ تَامَّةٌ جب امام قرآن مجید دیکھ کر قرأت کرے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک نماز فاسد ہو جاتی ہے جب کہ انکے شاگردوں کے نزدیک نماز پوری ہو جاتی ہے (فاسد نہیں ہوتی) امام ابوحنیفہ پر تعجب ہے کہ ان کے نزدیک اگر نمازی قرآن دیکھ کر قرأت کرے تو نماز فاسد لیکن اگر نماز میں کسی عورت کی طرف بنظر شہوت دیکھے تو نماز فاسد نہیں۔ امام ابنِ نجیم حنفی نے الاشباہ والنظائر ۲۱۸ پر لکھا ہے کہ وَلَوْ نَظَرَ الْمُصَلِّیْ اِلَی الْمُصْحَفِ وَقَرَاءَ مِنْهُ فَسَدَتْ صَلٰوتُهٗ لَا اِلٰی فَرْجِ امْرَاَةٍ بِشَهْوَةٍ

علماء احناف کا اسے عمل کثیر کہہ کر رد کرنا تحکم اور سراسر باطل ہے اگر اتنے عمل کو عمل کثیر کہہ کر نماز کو باطل قرار دے دیں تو اس قدر عمل کثیر نماز کے اندر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ :

((عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ یُصَلِّیْ وَهُوَ حَامِلٌ اُمَامَةَ بِنْتَ زَیْنَبَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَلِاَبِی الْعَاصِ بْنِ رَبِیْعَةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ فَاِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا وَاِذَا قَامَ حَمَلَهَا.))

"ابو قتادۃ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ امامہ بنت زینب بنت

رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے اٹھائے رہتے تھے۔ ابو العاص بن ربیعہ بن عبد شمس کی حدیث میں ہے کہ جب سجدہ میں جاتے تو اتار دیتے اور جب قیام فرماتے تو اٹھا لیتے"۔ (بخاری ۱/۷۴)

اسی طرح بخاری شریف میں آتا ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک رات اُم المؤمنین میمونہ کے گھر سویا اس رات نبی اکرم ﷺ کی بھی وہیں سونے کی باری تھی۔ آپؐ نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور میں آپؐ کے بائیں طرف کھڑا ہو گیا اس لیے آپ نے مجھے پکڑ کر دائیں طرف کر دیا"۔

(بخاری ۱/ ۱۷۹)

ان ہر دو حدیثوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو اٹھا کر نماز پڑھنا اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کو بائیں طرف سے دائیں طرف کرنا عمل کثیر نہیں اور اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی تو قرآن دیکھ کر قرأت کرنا بھی عمل کثیر نہیں اور نہ ہی اس سے نماز فاسد ہوتی ہے عمل کثیر احناف کا من گھڑت مفروضہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں اور تعجب اس بات پر ہے کہ حنفی اسی قانون کی خود بھی کئی مقامات پر مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ در مختار صفحہ ۲۰ پر ہے کہ کتے کے بچے کو اٹھا کر نماز پڑھنا جائز ہے اور منیۃ المصلی ۱۰۰ پر ہے کہ نماز میں ٹھہر ٹھہر کر جوئیں مارنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ تو کیا کتے کے بچے کو اٹھا کر نماز پڑھنا اور نماز میں جوئیں مارنا عمل کثیر نہیں احناف کا وطیرہ ہے کہ جو حدیث قولِ امام کے خلاف ہو اسے حیل و حجت سے رد کر دیتے ہیں اور جو قول امام کے موافق ہو خواہ وہ کتنی ہی ضعیف کیوں نہ ہو وہ ان کے ہاں حجت ٹھہرتی ہے۔ جیسا کہ اس کی مثالیں نور الانوار' اصول شاشی' اصول بزدوی وغیرہ جو احناف کی معتبر کتب ہیں ان میں موجود ہیں۔

(مجلۃ الدعوۃ' اگست / ۱۹۹۲ء)

نماز میں سورتوں کی ترتیب

س کیا نماز کے اندر ترتیب قرآن کے مطابق سورتیں پڑھنی چاہئیں یا آگے پیچھے کر کے بھی پڑھ سکتے ہیں؟ ہمارے امام صاحب نماز میں ترتیب قرآن کا لحاظ نہیں رکھتے۔ سورتوں میں تقدیم و تاخیر کر جاتے ہیں' کیا یہ درست ہے؟

(ایک سائل' ملتان)

ج امام کا موجودہ ترتیب قرآن سے ہٹ کر سورتوں کو نماز میں تقدیم و تاخیر سے پڑھنا درست ہے۔ نبی اکرم ﷺ اور سلف صالحین رحمہم اللہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں "بَابُ الْجَمْعِ بَيْنَ السُّوْرَتَيْنِ فِي الرَّكْعَةِ وَالْقِرَاءَةِ بِالْخَوَاتِيْمِ وَ بِسُوْرَةٍ قَبْلَ سُوْرَةٍ وَ بِاَوَّلِ سُوْرَةٍ" کا عنوان قائم کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دو سورتیں ایک رکعت میں پڑھنا یا سورتوں کی آخری آیات یا سورتوں کو تقدیم و تاخیر سے پڑھنا یا سورتوں کی پہلی آیات پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے جواز کے لیے کچھ آثار و احادیث نقل کی ہیں۔

((عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ كَانَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ يَؤُمُّهُمْ فِي مَسْجِدِ قُبَاءٍ وَكَانَ كُلَّمَا افْتَتَحَ سُوْرَةً يَقْرَأُ بِهَا لَهُمْ فِي الصَّلَاةِ مِمَّا تُقْرَاءُ بِهِ افْتَتَحَ بِقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْهَا ثُمَّ يَقْرَأُ سُوْرَةً اُخْرٰى مَعَهَا وَكَانَ يَصْنَعُ ذٰلِكَ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ.)) الْحَدِيْث

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری مسجد قبا میں ان کی امامت کراتا تھا۔ وہ جب بھی کوئی سورۃ پڑھتا تو پہلے قل ھو اللہ احد پڑھتا پھر اس کے بعد کوئی اور سورۃ اس کے ساتھ ملاتا اور ہر رکعت میں اسی طرح کرتا تو اس کی قوم نے اسے کہا تم قل ھو اللہ پر اکتفا کیوں نہیں کرتے بلکہ اس کے بعد اور سورۃ ملاتے ہو تو صرف قل ھو اللہ پڑھ لیا کرو یا اسے چھوڑ کر کوئی دوسری سورت پڑھا کرو تو اس نے جواب دیا کہ میں یہ کام ترک نہیں کروں گا۔ اگر تم پسند کرو گے تو تمہاری امامت کراؤں گا

اور اگر تم ناپسند کرتے ہو تو امامت چھوڑ دیتا ہوں۔ قوم نے ان کے علاوہ کسی کی امامت کو پسند نہ کیا کیونکہ وہ ان تمام سے افضل تھا۔ جب اس قوم میں نبی ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے آپ کو اس بات کی خبر دی تو آپ نے اس سے کہا تجھے اپنے ساتھیوں کی بات ماننے سے کونسی چیز روکتی ہے اور ہر رکعت میں اس سورۃ کے لازمی پڑھنے پر تجھے کس چیز نے ابھارا ہے' تو اس نے کہا' مجھے اس سورت سے محبت ہے تو آپ نے فرمایا' تیری اس سورت کے ساتھ محبت تجھے جنت میں داخل کر دے گی۔

مندرجہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ سورتوں کی تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے۔ اگر یہ درست نہ ہوتی تو اللہ کے رسول ﷺ منع کر دیتے۔ آپ نے اسے منع نہیں کیا اور نہ ہی اسے امامت سے علیحدہ کیا۔

اسی طرح مسلم کی ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ نے نماز کے اندر پہلے سورۂ بقرہ پڑھی پھر نساء اور پھر آل عمران۔ حالانکہ آل عمران سورۂ نساء سے پہلے آتی ہے۔ بخاری شریف میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے صبح کی نماز میں پہلی رکعت میں سورۂ کہف اور دوسری میں سورۂ یوسف یا یونس پڑھی۔

مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں ترتیب قرآنی ضروری نہیں اس میں تقدیم و تاخیر درست ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۳ء)

سجدہ میں گھٹنے پہلے رکھیں یا ہاتھ

س: کیا نماز ادا کرتے ہوئے جب سجدہ کو جائیں تو پہلے ہاتھ رکھیں یا گھٹنے؟ صحیح احادیث کی رُو سے وضاحت فرمائیں۔

ج: نماز میں سجدہ کو جاتے ہوئے پہلے ہاتھ رکھنا ہی صحیح ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ

قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ.))

"جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے بلکہ اپنے ہاتھ گھٹنوں سے پہلے رکھے"۔ (ابوداؤد (۸۴۰) نسائی ۲/۲۰۷' دارمی ۱/۳۰۳' احمد ۲/۳۸۱' دار قطنی ۱/۳۴۴' بیہقی ۲/۹۹-۱۰۰)

اس حدیث کی سند جید ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ ' امام زرقانی رحمہ اللہ ' امام عبدالحق اشبیلی رحمہ اللہ ' علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے کہا یہ حدیث سیدنا وائل بن حجر والی حدیث سے زیادہ قوی ہے۔ ملاحظہ ہو مجموع ۴۲۱/۳ تحفة الاحوذی ۲۲۹/۱ بلوغ المرام مع سبل السلام ۳۱۶/۱) اس حدیث کی شاہد حدیث سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہ والی حدیث بھی ہے۔ نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھ رکھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ یہ حدیث ابنِ خزیمہ (۶۲۷) دار قطنی ۱/ ۳۴۴' بیہقی ۲/ ۱۰۰' حاکم ۱/ ۲۲۶ میں ہے۔ اس حدیث کو امام حاکم نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ جو لوگ سجدہ جاتے ہوئے پہلے گھٹنے رکھنے کے قائل ہیں۔ وہ یہ روایت پیش کرتے ہیں :

((عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ وَاِذَا نَهَضَ رَفَعَ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ.))

"وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ سجدہ کرتے تو دونوں گھٹنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھتے اور جب سجدے سے اٹھتے تو دونوں ہاتھ گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے"۔ (ابوداؤد (۸۳۸)' نسائی ۲/۲۰۶' ترمذی (۲۶۸)' ابنِ ماجہ (۸۸۲)' دارمی ۱/ ۳۰۳' ابن خزیمہ (۶۲۶)' طحاوی ۱/۲۵۵' ابنِ حبان (۴۸۷)' دار قطنی ۱/۳۴۵' بیہقی ۲/۹۸' شرح السنہ (۶۴۲)

لیکن یہ روایت ضعیف ہے اس کی سند میں شریک بن عبداللہ القاضی ضعیف راوی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سلسلة الاحادیث الضعیفة ۳۲۹/۲

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ راجح اور قوی مذہب یہی ہے کہ سجدے میں جاتے وقت آدمی گھٹنوں کی بجائے پہلے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے۔ امام اوزاعی، امام مالک، امام ابنِ حزم رحمہم اللہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل کا بھی یہی مذہب ہے۔

حدیث وائل بن حجر کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی ترجیح اسی موقف کو ہے۔ اس لیے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث قولی ہے اور وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث فعلی ہے اور تعارض کی صورت میں قولی حدیث کو فعلی حدیث پر ترجیح دی جاتی ہے اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شاہد ابنِ عمر رضی اللہ عنہما والی صحیح حدیث بھی ہے۔ علاوہ ازیں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہاتھوں سے قبل گھٹنے رکھنے کی ممانعت ہے اور تعارض کی صورت میں ممانعت والی روایت کو لیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں (محلٰی ابنِ حزم ۱۲۹/۴، ۱۳۰) (مجلۃ الدعوۃ، مئی / ۱۹۹۴ء)

سجدہ سہو کی صورتیں

س نماز میں بھول کر ایک رکعت کم پڑھی جائے تو کیا کیا جائے؟ پوری نماز دہرائی جائے یا صرف ایک رکعت پڑھی جائے نیز سجدۂ سہو کی صورت کیا ہو گی۔ حنفی حضرات ایک طرف سلام پھیر کر سجدے کرتے ہیں اور التحیات دوبارہ پڑھتے ہیں اس کی اصل کیا ہے؟ (رانا محمد سلیم، مانگٹ)

ج اگر کوئی آدمی بھول کر ایک رکعت کم پڑھ لے یا اسے پھر یاد آ جائے کہ میں نے ایک رکعت کم پڑھی ہے تو اسے پوری نماز دہرانے کی بجائے ایک رکعت ہی ادا کرنی چاہیے جیسا کہ صحیح مسلم ۸۷/۲ پر سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھائی اور تین رکعت ادا کر کے سلام پھیر دیا پھر اپنے گھر چلے گئے پھر ایک شخص جسے خرباق کہا جاتا تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر بتایا کہ نماز میں سہو واقع ہوا ہے۔ پھر آپ غصے کی حالت میں اپنی چادر کھینچتے

ہوئے لوگوں کے پاس آئے اور پوچھا:

((اَصَدَقَ هٰذَا قَالُوْا نَعَمْ فَصَلّٰى رَكْعَةً ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ.))

"کیا اس نے سچ کہا ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہاں! پھر آپ نے ایک رکعت نماز ادا کی پھر دو سجدے کیے پھر سلام پھیرا"۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آدمی کی نماز ایک رکعت کم ہو گئی اور اس نے تین رکعت ادا کر لی ہوں اگرچہ اس دوران کچھ باتیں بھی ہو چکی ہوں تو وہ بقیہ ایک رکعت ہی ادا کر کے سلام پھیرے اور سجدہ سہو کرے۔

سجدہ سہو کے بارے میں دو قسم کی احادیث مروی ہیں ایک حدیث میں سلام سے قبل سجدہ سہو کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں سلام کے بعد سجدہ سہو کا ذکر ہے جیسا کہ مسلم کی ایک روایت میں آتا ہے کہ:

((ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يُسَلِّمَ.))

"کہ پھر سلام سے قبل دو سہو کے سجدے کرے"۔

جس کا طریقہ یہ ہے کہ آخری قعدہ میں تشہد درود اور دُعا کے بعد اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں جائے پھر اٹھ کر بیٹھ جائے پھر سجدہ کرے سلام پھیر دے سلام سے قبل سجدہ سہو کا جو طریقہ ہے وہ متفق علیہ اور جو سجدہ سہو سلام کے بعد مذکورہ ہے وہ متفق علیہ تو نہیں لیکن صحیح حدیث سے ثابت ہے اور جائز عمل ہے۔

احناف کے ہاں جو سجدہ کا طریقہ معروف ہے کہ التحیات عبدہٗ و رسولہٗ تک پڑھ کر ایک طرف سلام پھیرا جائے پھر پورا تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے یہ طریقہ کسی صحیح حدیث میں موجود نہیں ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔

(مجلۃ الدعوۃ' مئی / سنہ ۱۹۹۲ء)

سجدہ میں پاؤں کی حالت

س حالتِ سجدہ میں پاؤں کس طرح رکھنے چاہئیں۔ کیا ایڑیوں کو ملانا ہے یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔ (عبدالباسط، نوشہرہ)

ج سجدہ کی حالت میں دونوں پاؤں کو ملا کر کھڑا رکھنا چاہیے اور پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رو کرنا چاہیے اور دونوں ایڑیاں ملا کر رکھنی چاہئیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ میرے بستر پر تھے اور رات کو میں نے آپ کو بستر پر نہ پایا تو میں نے آپ کو تلاش کرنا شروع کیا:

((فَوَقَعَتْ يَدِي عَلَى بَطْنِ قَدَمِهِ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمَا مَنْصُوْبَتَانِ.))

میرا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے قدموں کے تلووں پر لگا۔ آپ سجدہ کی حالت میں تھے اور آپ کے قدم مبارک کھڑے تھے۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں آتا ہے:

((فَوَجَدْتُهُ سَاجِدًا رَّاصًّا عَقِبَيْهِ مُسْتَقْبِلًا بِأَطْرَافِ أَصَابِعِهِ الْقِبْلَةَ.))

میں نے آپ کو سجدے کی حالت میں اس طرح پایا کہ آپ اپنی ایڑیوں کو ملانے والے اور اپنی انگلیوں کے سروں کو قبلہ رُخ کرنے والے تھے"۔ (صحیح ابن خزیمہ ۱/۱۲۸، سنن کبریٰ بیہقی ۱/۱۱۶، مستدرک حاکم ۱/۱۲۸) (مجلۃ الدعوۃ، فروری ۱۹۹۱ء)

پہلے تشہد میں درود

س کیا نماز کے اندر پہلے تشہد میں درود پڑھنا سنت ہے؟ قرآن وسنت کی رُو سے وضاحت کریں۔

ج قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا

عَلَیۡهِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا﴾ (الاحزاب : ۵۶)

"بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی آپ پر صلاۃ و سلام بھیجو"۔

اس آیت کریمہ کا حکم عام ہے اور یہ نماز کو بھی شامل ہے۔ کیونکہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے آکر سوال کیا کہ ہم نے سلام کہنا تو سیکھ لیا ہے' آپ ہمیں بتائیں کہ ہم صلاۃ کیسے پڑھیں اور بعض روایات میں نماز کی صراحت بھی آتی ہے جیسا کہ سنن دار قطنی میں حدیث ہے :

((عَنۡ اَبِیۡ مَسۡعُوۡدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ اَقۡبَلَ رَجُلٌ حَتّٰی جَلَسَ بَیۡنَ یَدَیۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ وَنَحۡنُ عِنۡدَهٗ فَقَالَ یَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ اَمَّا السَّلَامُ فَقَدۡ عَرَفۡنَاهُ فَکَیۡفَ نُصَلِّیۡ عَلَیۡكَ اِذَا نَحۡنُ صَلَّیۡنَا فِیۡ صَلَاتِنَا فَقَالَ قُوۡلُوۡا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی ....))

"ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' ایک آدمی آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور ہم آپ کے پاس تھے۔ اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ سلام تو ہم نے جان لیا ہے پس ہم آپ پر صلاۃ کیسے بھیجیں جب ہم نماز پڑھ رہے ہوں۔ تو آپ نے فرمایا تم اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی الخ کہو"۔

(سنن دار قطنی ۱/۳۵۵)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں رسول اللہ ﷺ پر سلام تو پہلے ہی پڑھتے تھے لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس کے بعد انہوں نے سلام کے ساتھ صلاۃ بھی آپ سے سیکھی۔

مذکورہ بالا آیت سورۂ احزاب کی ہے جو ۵ھ کو نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو رسول اللہ ﷺ پر صلاۃ و سلام پڑھنے کا حکم دیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو تشہد میں سلام پہلے ہی پڑھتے تھے۔ اب انہوں نے اس کے ساتھ صلاۃ کا بھی اضافہ کر لیا' یعنی جہاں سلام پڑھنا ہے' اس کے ساتھ ہی صلاۃ پڑھنی ہے یہ

دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ہم پہلے تشہد میں صرف سلام پڑھیں' صلاۃ نہ پڑھیں تو وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا پر تو عمل ہو گا لیکن صلوا علیہ پر عمل نہیں ہو گا۔

رسول اللہ ﷺ سے آخری تشہد سے پہلے تشہد میں صلاۃ پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ سعد بن ہشام سیدہ عائشہ ؓ سے رسول اللہ ﷺ کے قیام اللیل کے متعلق روایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

((فَقُلْتُ یَا اُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْبِئِیْنِی عَنْ وِتْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ کُنَّا نُعِدُّ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سِوَاکَہٗ وَطَھُوْرَہٗ فَیَبْعَثُہُ اللّٰہُ فِیْمَا شَآءَ اَنْ یَّبْعَثَہٗ مِنَ اللَّیْلِ فَیَتَسَوَّکُ وَیَتَوَضَّأُ ثُمَّ یُصَلِّیْ تِسْعَ رَکْعَاتٍ لَا یَجْلِسُ فِیْھِنَّ اِلَّا عِنْدَ الثَّامِنَۃِ فَیَدْعُوْا رَبَّہٗ وَیُصَلِّیْ عَلٰی نَبِیِّہٖ ثُمَّ یَنْھَضُ وَلَا یُسَلِّمُ ثُمَّ یُصَلِّی التَّاسِعَۃَ فَیَقْعُدُ ثُمَّ یَحْمَدُ رَبَّہٗ وَیُصَلِّیْ عَلٰی نَبِیِّہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَیَدْعُوْا ثُمَّ یُسَلِّمُ تَسْلِیْمًا.))

"میں نے کہا اے ام المؤمنین' آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کے وتر کے متعلق بتائیں تو انہوں نے کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے لیے مسواک اور طہارت کے لیے پانی تیار کر دیتے۔ رات کے وقت جب اللہ تعالیٰ چاہتا' آپ کو اٹھا دیتا۔ آپ مسواک کرتے اور وضو کرتے پھر نو رکعتیں ادا کرتے آٹھویں کے سوا کسی رکعت میں نہیں بیٹھتے تھے پھر آپ اس میں اپنے رب سے دعا کرتے اور اس کے نبی ﷺ پر درود بھیجتے پھر کھڑے ہو جاتے اور سلام نہیں پھیرتے تھے۔ پھر نویں رکعت ادا کر کے بیٹھتے اور اللہ کی حمد اس کے نبی پر درود بھیجتے اور دعا کرتے پھر سلام پھیر دیتے۔

(مسند ابی عوانہ ۲/ ۳۲۴' بیہقی ۲/ ۵۰۰' سنن نسائی)

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے آخری قعدہ سے پہلے والے قعدہ میں درود پڑھا۔ لہٰذا ہمیں آپ کی سنت کے مطابق آخری قعدہ سے پہلے والے قعدہ میں درود پڑھنا چاہئے۔ (مجلۃ الدعوۃ' جنوری/ ۱۹۹۳ء)

نوٹ : اس مسئلہ پر دوسرے فریق کے دلائل بھی موجود ہیں ان شاء اللہ اگلی جلد میں اس پر مفصل بحث کریں گے بہرحال یہ ایک فریق کا موقف ہے۔

تشہد میں انگلی کو حرکت کس وقت دیں؟

س تشہد میں انگلی کو حرکت دینے کے بارہ میں دو طرح کی احادیث آتی ہیں ایک میں نبی کریم ﷺ انگلی کو حرکت دیتے تھے۔ دوسری میں ہے' نہیں دیتے تھے۔ ان احادیث کی وضاحت کریں اور یہ بھی بتلائیں کہ تشہد میں انگلی کو حرکت کس وقت دینی ہے؟

ج تشہد میں سبابہ انگلی کو حرکت دینا نبی کریم ﷺ کی سنت ثابتہ ہے جیسا کہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ لفظ ہیں :

((ثُمَّ رَفَعَ اِصْبَعَهٗ فَرَاَیْتُهٗ یُحَرِّکُهَا یَدْعُوْبِهَا.))

"کہ میں نے دیکھا نبی کریم ﷺ نے اپنی انگلی کو اٹھایا پھر اس کو حرکت دیتے رہے اور دُعا کرتے رہے"۔ (صحیح سنن النسائی' ج۱' ص ۱۹۴)

مولوی سلام اللہ حنفی شرح موطا میں لکھتے ہیں :

وَفِیْهِ تَحْرِیْکُهَا دَائِمًا اِذَا الدُّعَاءُ بَعْدَ التَّشَهُّدِ

"کہ اس حدیث میں ہے کہ انگلی کو تشہد میں ہمیشہ حرکت دیتے رہنا ہے کیونکہ دُعا تشہد کے بعد ہوتی ہے"۔

علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

فَفِیْهِ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ السُّنَّةَ اَنْ یَسْتَمِرَّ فِی الْاِشَارَةِ وَفِیْ تَحْرِیْکِهَا اِلَی السَّلَامِ لِاَنَّ الدُّعَاءَ قَبْلَهٗ

"اس حدیث میں دلیل ہے کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ انگلی کا اشارہ اور حرکت سلام تک جاری رہے کیونکہ دُعا سلام سے متصل ہے"۔ صفۃ صلوٰۃ النبی/۱۵۸

اس کے علاوہ صرف ایک مرتبہ انگلی اٹھا کر رکھ دینا یا اَشْهَدُ ان لا الہ الا اللہ پر

اٹھانا' اس کے بارے میں صحیح احادیث سے کوئی دلیل نہیں ملتی جبکہ یہ عمل مذکورہ حدیث کے منافی ہے۔ جس روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ تشہد میں انگلی کو حرکت نہیں دیتے تھے وہ حدیث بھی ضعیف ہے۔ کیونکہ اسمیں محمد بن عجلان عامر بن عبداللہ بن الزبیر سے بیان کرتا ہے اور محمد بن عجلان متکلم فیہ راوی ہے۔ اس کے علاوہ چار ثقہ راویوں نے عامر بن عبداللہ سے اسی روایت کو بیان کیا ہے لیکن اس میں لَا یُحَرِّکُھَا کا لفظ نہیں ہے۔ معلوم ہوا یہ لفظ شاذ ہے۔ امام مسلم نے بھی محمد بن عجلان کے طریق سے اسی روایت کو ذکر کیا ہے اس میں بھی "لَا یُحَرِّکُھَا" کا لفظ نہیں ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں وائل بن حجر والی روایت کو ابنِ الملقن' ابنِ القیم' امام نووی کے علاوہ علامہ ناصر الدین البانی نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ صرف الھدایہ فی تخریج احادیث البدایہ کے مولف نے اس حدیث کو شاذ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یُحَرِّکُھَا والے لفظ صرف زائدہ بن قدامہ عاصم سے بیان کرتا ہے۔ زائد کے علاوہ عاصم کے دوسرے شاگرد یُشِیْرُ بِیَدِہٖ کا لفظ ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات تحقیق اور انصاف سے عاری ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سب محدثین نے اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اشارہ والی حدیث کے ثبوت سے حرکت دینے کی نفی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے اور صحابہ پیچھے کھڑے تھے فَاَشَارَ اِلَیْھِمْ اَنِ اجْلِسُوْا ان کی طرف اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔ متفق علیہ

اس حدیث سے ہر عقلمند آدمی یہ سمجھے گا کہ آپ کا اشارہ صرف ہاتھ کو اٹھا دینا نہیں تھا جیسا کہ سلام کے جواب میں کرتے تھے۔ بلکہ یہ اشارہ تھا جس سے سمجھ آتی تھی کہ آپ بیٹھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہ اشارہ حرکت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اشارہ والی احادیث کو تحریک والی احادیث کے مخالف قرار دینا درست نہیں ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی روایت

کہ:

((لَهِيَ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنَ الْحَدِيْدِ.))

"یہ انگلی شیطان کے لیے لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے"۔ (احمد)

اس حدیث کو حرکت نہ دینے کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ اس میں حرکت دینے یا نہ دینے کی صراحت موجود ہی نہیں ہے جبکہ حرکت دینا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہو چکا ہے۔ اگر اس کو تسلیم کر لیں کہ اس میں حرکت نہ دینے کی صراحت ہے تو پھر صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ دونوں امر جائز ہیں جیسا کہ علامہ صنعانی نے سبل السلام میں اسے ترجیح دی ہے۔ لیکن پہلی بات زیادہ پختہ ہے کیونکہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ایک خاص اہتمام کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بیان کر رہے ہیں اور خاص کر تشہد کی حالت کا اور تشہد میں ایسی چیزیں انہوں نے بیان کی ہیں جو کسی نے بھی بیان نہیں کیں۔ اس لیے ان کی روایت کو ترجیح ہو گی۔ واللہ اعلم

زیادہ تفصیل کے لیے علامہ ناصر الدین البانی کی کتاب "تمام المنہ" کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ (از: ع۔ ع' (مجلۃ الدعوۃ' مارچ / ۱۹۹۵ء

نماز کے بعد اجتماعی دُعا کا مسئلہ

س ہمارے یہاں راولپنڈی کی مرکزی مسجد میں مدینہ یونیورسٹی کے ایک فاضل عالم دین ہیں وہ فرض نماز کے بعد اجتماعی دُعا کا اہتمام ضرور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں لوگوں کو آہستہ آہستہ قریب لانے کے لیے کر لیتا ہوں۔ اس بارے میں شرعی وضاحت فرمائیں کہ یہ اجتماعی دُعا جو فرضوں کے بعد مانگی جاتی ہے اس کا کیا ثبوت ہے؟

ج اجتماعی دُعا جو فرضوں کے بعد کی جاتی ہے' اس کا پابندی سے اہتمام کرنا بدعت ہے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی ثبوت نہیں۔ آپ نے مدینہ طیبہ میں دس سال پانچوں نمازیں پڑھائیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد نے

آپ کے پیچھے پڑھیں مگران میں سے کسی ایک نے بھی اس اجتماعی دُعا کے اہتمام کا ذکر نہیں کیا۔ اس مسئلہ کے بارے میں مصنف ابنِ ابی شیبہ سے یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ یزید عامری کہتے ہیں کہ :

((صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْفَجْرَ فَلَمَّا سَلَّمَ انْصَرَفَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَدَعَا.))

"رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میں نے فجر کی نماز پڑھی۔ آپ نے جب سلام پھیرا تو صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر دُعا کی"۔

اگرچہ اس کی سند حسن ہے مگر ابنِ ابی شیبہ میں وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَدَعَا (ہاتھ اٹھائے اور دُعا کی) کے الفاظ نہیں ہیں۔

یہ روایت جس طویل روایت کا اختصار ہے وہ اسی سند کے ساتھ مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، دارقطنی، مستدرک حاکم، بیہقی، ابنِ حبان، ابنِ سکن مصنف عبدالرزاق میں موجود ہے مگر اس میں مندرجہ بالا الفاظ نہیں ہیں۔ اسی طرح باقی روایات کا حال ہے یہی وجہ ہے کہ کبار علماء محدثین نے اسے بدعت کہا ہے چنانچہ شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ الفتاوی الکبری ۱/۱۸۴ پر ایک سائل کے جواب میں لکھتے ہیں۔

س جب امام اور مقتدی فرضی نماز کے بعد دُعا کریں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

ج نماز کے بعد امام اور مقتدیوں کا مل کر دُعا کرنا بدعت ہے نبی کریم ﷺ کے زمانے میں یہ طریقہ نہ تھا سوائے اس طریقہ کے کہ آپ دُعا نماز کے اندر مانگتے تھے کیونکہ نمازی اپنے رب کے ساتھ مناجات کرتا ہے پس مناجات کے وقت دُعا کرنا اس کے لیے مناسب ہے اور نماز کے بعد سنت کے مطابق ذکر کرنا جو نبی کریم ﷺ سے منقول ہے یعنی لا اِلٰہ اِلاّ اللہ واللہ اکبر کہنا۔ (مجموعہ الفتاوی ۲۲/۵۱۹)

امام شاطبی کتاب الاعتصام ۱/۲۵۲ میں بدعات اضافیہ کی مفصل بحث کے نتیجے میں ایک جگہ راقم ہیں وَمِنْ اَمْثِلَةِ هٰذَا الْاَصْلِ الْتِزَامُ الدُّعَاءِ بَعْدَ الصَّلَوٰتِ بِالْهَيْئَةِ الْاِجْتِمَاعِ مقصود

اس سے یہ ہے کہ ایک چیز اصل میں صحیح اور جائز ہوتی ہے مگر تخصیص کی وجہ سے بدعت ہو جاتی ہے نماز کے بعد اجتماعی صورت میں دُعا کو ضروری سمجھنا اور پابندی کرنا اسی قسم سے ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :

وَقَدْ جَآءَ عَنِ السَّلَفِ النَّهْيُ عَنِ الْاِجْتِمَاعِ عَلَى الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ بِالْهَيْئَةِ الَّتِيْ يَجْتَمِعُ عَلَيْهَا هٰؤُلَاءِ الْمُبْتَدِعُوْنَ

"اجتماعی شکل میں دُعا مانگنے اور ذکر کرنے میں جس کے لیے اہل بدعت جمع ہو کر مانگتے ہیں سلف صالحین سے منع وارد ہے۔" البتہ اگر کوئی شخص دُعا کے لیے اپیل کرے تو پھر ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگی جا سکتی ہے۔

(تحفۃ الاحوذی) (مجلۃ الدعوۃ' مارچ / ۱۹۹۲ء)

امامت کے احکامات

س نماز پنج گانہ میں امامت کون کروا سکتا ہے؟ امام کے لیے کیا احکام ہیں؟

(محمد فیصل امتیاز' کوٹ ادو)

ج امام کے احکامات کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے۔ سیدنا ابو مسعود انصاری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((يَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ كَانُوْا فِي الْقِرَأَةِ سِوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَاِنْ كَانُوْا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً اَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَاِنْ كَانُوْا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ سِلْمًا وَلَا يَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِيْ سُلْطَانِهٖ وَلَا يَقْعُدُ فِيْ بَيْتِهٖ عَلٰى تَكْرِمَتِهٖ اِلَّا بِاِذْنِهٖ))

"لوگوں کا امام وہ ہونا چاہیے جو ان میں اچھی طرح قرآن کی قرأت جانتا ہو۔ اگر وہ قرأت میں برابر ہوں تو پھر وہ امامت کرائے جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو' اگر سنت میں برابر ہوں تو جو ان میں سے ہجرت میں مقدم ہو' اگر ہجرت میں بھی برابر ہوں تو سب سے پہلے اسلام لانے والا ہو' کوئی آدمی دوسرے آدمی کی جگہ امامت نہ کرائے اور نہ اس کے گھر میں اس کے اپنے بیٹھنے والی جگہ پر بیٹھے مگر اس کی

اجازت لے کر"۔ (مسلم ۱/۴۶۵(۶۷۳)

حدیث کے بعض طرق میں اسلام کی جگہ عمر کا بھی ذکر آتا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ قاری قرآن پھر سنت کا عالم علی الترتیب امامت کا انتخاب ہونا چاہیے اور جو امام منتخب ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے مقتدیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے امامت کرائے کیونکہ اس کے پیچھے بچے' ضعیف' بیمار' مسافر اور مختلف قسم کے افراد ہوتے ہیں' لہٰذا نہ ہی زیادہ لمبی نماز پڑھائے اور نہ ہی اس قدر مختصر ہو کہ قیام' رکوع و سجود وغیرہ کا بھی خیال نہ رکھے۔

نوٹ : یاد رہے کہ حنفی حضرات نے امامت کے متعلق کچھ لایعنی فضول اور مضحکہ خیز شرائط ذکر کی ہیں جیسا کہ در مختار میں امامت کے بیان میں امام کی مختلف شرائط ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھ مارا کہ امام کی بیوی سب سے حسین ہو' امام کا سر بڑا ہو' امام کا آلہ تناسل چھوٹا ہو وغیرہ یہ شرائط انتہائی مضحکہ خیز اور باعث عار ہیں جن کا کتاب و سنت میں کہیں بھی وجود نہیں پایا جاتا نہ کسی صحیح سند سے اور نہ ہی کسی ضعیف سند سے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کتاب و سنت جیسی عظیم شاہراہ پر ہی قائم رکھے۔ آمین (مجلۃ الدعوۃ' دسمبر/ ۱۹۹۲ء

عورت کی امامت کا مسئلہ

س کیا ایک عورت دوسری عورت کی جماعت کرا سکتی ہے اور اگر کرا سکتی ہے تو اس کا طریق کار کیا ہے؟ (نوید۔ لاہور)

ج ایک عورت دوسری عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ باقی عورتوں کے وسط میں کھڑی ہو مردوں کی طرح آگے بڑھ کر کھڑی نہ ہو' امام ابوداؤد نے سنن ابوداؤد مع عون ۲/۲۱۱ پر باب امامتہ النساء میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اُم ورقہ بنت عبداللہ بن حارث کے گھر تشریف لاتے تھے اور آپ نے ان کے لیے ایک موذن مقرر کیا جو اذان دیتا تھا اور آپ نے حکم فرمایا کہ :

((وَاَمَرَهَا اَنْ تَؤُمَّ اَهْلَ دَارِهَا.))

"تو اپنے گھر والوں کی امامت کیا کر۔"

صاحب عون نے لکھا ہے کہ:

ثَبَتَ مِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ اَنَّ اِمَامَةَ النِّسَآءِ وَجَمَاعَتَهُنَّ صَحِيْحَةٌ ثَابِتَةٌ مِنْ اَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ اَمَّتِ النِّسَآءَ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَاُمُّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا فِي الْفَرْضِ وَالتَّرَاوِيْحِ

"اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کا امامت اور جماعت کرانا صحیح ہے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ثابت ہے۔ سیدہ عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی فرائض اور تراویح میں امامت کراتی تھیں۔ ابوبکر بن ابی شیبہ اور حاکم نے سیدنا عطا سے بیان کیا ہے کہ:

((عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا كَانَتْ اَمَّتِ النِّسَآءَ فَتَقُوْمُ مِنْهُنَّ فِي الصَّفِّ.))

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی امامت کراتی تھیں اور ان کے ساتھ ہی صف میں کھڑی ہوتی اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں:

((اِنَّهَا اَمَّتِ النِّسَآءَ فَقَامَتْ وَسْطَهُنَّ.))

"انہوں نے عورتوں کی امامت کرائی اور ان کے وسط میں کھڑی ہوئیں"۔

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت عورتوں کی درمیان میں کھڑے ہو کر امامت کرا سکتی ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ، مئی / ۱۹۹۲ء)

مرد کا عورت کی جماعت کرانا

س کیا مرد اپنی عورت کی جماعت کروا سکتا ہے۔ اگر کروا سکتا ہے تو اس کی صورت کیا ہے؟ (محمد اسلم، کوہاٹ)

ج مرد اپنی عورت کو جماعت کروا سکتا ہے اور جماعت کی صورت میں اپنی

بیوی کو اپنے ساتھ برابر کھڑا نہ کرے بلکہ اسے پیچھے کھڑا کرے کیونکہ عورت اکیلی صف کے حکم میں شمار ہوتی ہے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بَابُ الْمَرْاَةِ وَحْدَهَا تَكُوْنُ صَفًّا کا عنوان قائم کر کے واضح کیا ہے اور اس ضمن میں ایک حدیث یہ نقل کی ہے:

((عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: صَلَّيْتُ اَنَا وَيَتِيْمٌ فِي بَيْتِنَا خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاُمِّي اُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا.))

"انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا' ہمارے گھر میں ایک یتیم لڑکے اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی اور میری ماں اُم سلیم ہمارے پیچھے تھی۔ اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ استدلال کرتے ہیں کہ عورت اکیلی ایک صف کے حکم میں ہوتی ہے جیسا کہ اُم سلیم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز پڑھی لہٰذا جب عورت اکیلی ایک صف کا حکم رکھتی ہے تو مرد اپنی عورت کو پیچھے کھڑا کر کے نماز پڑھا سکتا ہے۔ سلف صالحین سے ازواج کو پیچھے کھڑا کر کے نماز پڑھانے کے واقعات ابوبکر بن ابی شیبہ' عبدالرزاق' طبرانی' اخبار اصفہان' ابنِ عساکر وغیرہ میں مذکور ہیں۔ (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۳ء)

مشرک امام کی اقتداء کا حکم

س ایک آدمی کا عقیدہ ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر' مشکل کشا اور نفع و نقصان کے مالک ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانی غوث اعظم اور علی ہجویری داتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ بدعات کا مرتکب ہے کیا ایسے آدمی کی اقتدا میں نماز ہو جاتی ہے یا نہیں۔ مجلہ الدعوۃ میں قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(سیف الرحمٰن توحیدی' گوجرانوالہ)

ج قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر ناظر مشکل کشا اور نفع نقصان کا مالک سمجھنا شیخ عبدالقادر جیلانی کو غوث اعظم کہنا اور علی ہجویری کو داتا ماننا' شرک ہے اور ان امور پر اعتقاد رکھنے والا بلاشک

مشرک ہے۔ کیونکہ کسی کو نفع و نقصان سے دوچار کرنا یا کسی کی پریشانی دور کرنا' فریاد رسی کرنا' اولاد دینا یہ تمام صفات اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہیں جو اس نے کسی اور کو عطا نہیں کیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب سیّد الانبیاء محمد ﷺ کو بھی فرمایا کہ :

﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ﴾

(الاعراف : ۱۱۸)

"اے نبی آپ کہہ دیں کہ میں اپنی جان کے لیے بھی نفع و نقصان کا مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے"۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا :

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا' قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴾ (الجن : ۲۱'۲۰)

"کہہ دیجیے میں تو صرف اپنے ربّ کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا کہہ دیجیے میں تمہارے لیے نقصان اور ہدایت کا مالک نہیں ہوں"۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کے غیر میں نہیں پائی جاتی وہ اپنی ذات و صفات میں یکتا وحدہ لا شریک ہے۔ اور جو لوگ اللہ خالق کی صفات اس کی مخلوق میں مانتے ہیں وہ اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور مشرک آدمی کے اعمال تباہ و برباد ہو جاتے ہیں وہ اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہوتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

﴿ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (الانعام : ۸۸)

"اور اگر یہ لوگ بھی شرک کرتے تو ان کے اعمال بھی ضائع ہو جاتے"۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا :

﴿ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ ﴾ (الزمر : ۶۵)

"اور تحقیق وحی کی گئی آپ کی طرف اور ان لوگوں کی طرف جو آپ سے پہلے تھے اگر تو نے شرک کیا تو تیرے عمل ضائع ہو جائیں گے اور البتہ تو خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائے گا"۔

ان ہر دو آیات سے واضح ہو گیا کہ مشرک آدمی کے اعمال اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں' خواہ وہ نماز ہو یا روزہ' حج ہو یا زکوٰۃ غرض کسی قسم کا عمل بھی مشرک کا قبول نہیں بلکہ وہ سارے اعمال اکارت اور ضائع ہوں گے۔ تو جب امام مشرک ہو گا اور اس کا اپنا عمل اللہ کے ہاں مقبول نہیں تو اس کی اقتدا میں ادا کی جانے والی نماز بھی کیونکر قبول ہو گی۔ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحیح العقیدہ ہو۔ جس شخص کا عقیدہ صحیح نہیں وہ امامت کے لائق کیسے ہو سکتا ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' جولائی / ۱۹۹۲ء)

امام سے پہل کرنے کی سزا اور امام کی پیروی کا صحیح طریقہ

امیر کی اطاعت تو مدت ہوئی مسلمانوں سے چھن چکی۔ نہ انکا کوئی امیر المومنین ہے جس کی اطاعت کو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اس کی نافرمانی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سمجھیں نہ انہیں اسے حاصل کرنے کی کوئی فکر ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ لے دے کے نماز کے امام کی صورت میں انہیں پانچ وقت اطاعت کا سبق یاد دلایا جاتا ہے اور ان سے دنیا کے تمام کام چھڑوا کر اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر امام کی اقتداء میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ اب تمہاری ہر حرکت امام کی حرکت کے بعد ہونی چاہیے۔ اس سے پہلے کوئی حرکت تمہارے لیے جائز نہیں مگر اکثر مسلمان نافرمانی کے ایسے خوگر ہو چکے ہیں کہ نہ انہیں اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے کی فکر ہے نہ عقل کے تقاضوں کے خلاف ورزی۔ وہ ہر رکن میں امام سے پہلے حرکت کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے

ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر سخت سزا سے ڈرایا ہے:

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا یَخْشٰی الَّذِیْ یَرْفَعُ رَأْسَهٗ قَبْلَ الْاِمَامِ اَنْ یُّحَوِّلَ اللّٰهُ رَاْسَهٗ رَاْسَ حِمَارٍ.))

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص امام سے پہلے اپنا سر اٹھاتا ہے کیا وہ اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کے سر میں بدل دے"۔ (متفق علیہ' مشکوۃ ۱۰۲)

نماز کی حالت میں امام سے پہل کرنا عقل کے تقاضوں کے بھی سراسر خلاف ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ایک نکتہ نقل فرمایا ہے کہ اگر غور کریں تو امام سے آگے بڑھنے کی کوئی وجہ بھی اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ نماز سے جلدی فراغت حاصل ہو جائے۔ اس جلدی بازی کا علاج یہ ہے کہ آدمی سوچے کہ وہ امام کے فارغ ہونے سے پہلے تو نماز سے نکل ہی نہیں سکتا پھر یہ جلد بازی کیوں؟

امام کی پیروی کی تاکید

امام کی پیروی اور اس سے پہل نہ کرنے کی چند اور احادیث ملاحظہ فرمائیں:

((عَنْ اَنَسٍ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهٗ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ اِمَامُكُمْ وَلَا تَسْبِقُوْنِیْ بِالرُّكُوْعِ وَلَا بِالسُّجُوْدِ وَلَا بِالْقِيَامِ وَلَا بِالْاِنْصِرَافِ فَاِنِّیْ اَرَاكُمْ اَمَامِیْ وَمِنْ خَلْفِیْ.))

"انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ہمیں نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنا چہرہ ہماری طرف پھیر کر فرمایا: لوگو! میں تمہارا امام ہوں۔ تم مجھ سے نہ رکوع میں پہل کرو نہ سجدہ میں نہ قیام میں اور نہ منہ پھیرنے میں کیونکہ میں تمہیں اپنے سامنے سے اور پیچھے سے دیکھتا ہوں"۔

(رواہ مسلم' مشکوۃ ص ۱۰۱)

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُبَادِرُوا الْاِمَامَ اِذَا کَبَّرَ فَکَبِّرُوْا وَاِذَا قَالَ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِیْنَ وَاِذَا رَکَعَ فَارْکَعُوْا وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ اِلَّا اَنَّ الْبُخَارِیَّ لَمْ یَذْکُرْ وَاِذَا قَالَ وَلَا الضَّآلِّیْنَ.))

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' امام سے جلدی نہ کرو جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو جب وہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہے تو تم آمین کہو۔ جب رکوع کرے تو تم رکوع کرو جب سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہے تو تم اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ کہو۔ بخاری و مسلم نے اس پر اتفاق کیا ہے مگر بخاری نے وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے لفظ ذکر نہیں کیے۔

ابوداؤد میں یہ حدیث مفصل مذکور ہے کہ امام اس لیے ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔

((فَاِذَا کَبَّرَ فَکَبِّرُوْا وَلَا تُکَبِّرُوْا حَتّٰی یُکَبِّرَ وَاِذَا رَکَعَ فَارْکَعُوْا وَلَا تَرْکَعُوْا حَتّٰی یَرْکَعَ وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا وَلَا تَسْجُدُوْا حَتّٰی یَسْجُدَ.))

"فرمایا جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور تکبیر نہ کہو یہاں تک کہ وہ تکبیر کہے اور جب رکوع کرے تو رکوع کرو اور رکوع نہ کرو حتیٰ کہ وہ رکوع کرے اور جب وہ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہے تو تم اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ کہو اور جب سجدہ کرے تو تم سجدہ کرو اور جب وہ سجدہ نہ کرے تو تم سجدہ نہ کرو"۔

(بلوغ المرام باب صلوۃ الجماعۃ والامامہ)

امام کی پیروی کا مطلب نہ امام سے پہلے

نہ امام کے برابر حرکت کرے

مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے رسول اکرم ﷺ کی نماز میں لکھا ہے :

"حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب امام تکبیر کہہ چکے تو مقتدی اس کے بعد تکبیر کہے۔ جب امام سجدے میں چلا جائے تو تم سجدے میں جاؤ۔ جب امام سر اٹھا چکے تو تم سر اٹھاؤ۔ جب وہ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہہ چکے تو تم رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ کہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ مقتدی کو ہر فعل اس وقت کرنا چاہئے جب امام وہ کام کر چکے۔ نہ امام سے پہلے جانا چاہیے نہ اس کے ساتھ بلکہ امام کے بعد وہ رکن ادا کرے۔ متابعت کرے یعنی پیچھے لگے"۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ ارکان ادا کرنے میں امام سے سبقت کر رہا تھا۔ فرمایا :

"نہ تم نے تنہا نماز پڑھی نہ ہی امام کی اقتداء میں"۔

(بحوالہ رسالۃ الصلوۃ امام احمد)

نیز عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ :

"انہوں نے ایک شخص کو امام سے سبقت کرتے دیکھا تو فرمایا نہ تم نے اکیلے نماز ادا کی نہ امام کی اقتداء کی۔ اسے مارا اور کہا نماز لوٹاؤ"۔

(رسالۃ الصلوۃ ص ۳۵۲ مجموعہ الحدیث)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایسی نماز کو ناجائز سمجھتے ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں (ترجمہ)

نبی ﷺ کے فرمان اِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا کا یہ مطلب ہے کہ امام کی تکبیر ختم ہو جائے پھر مقتدی تکبیر کہے۔ لوگ جہالت کی وجہ سے غلطی کرتے ہیں اور نماز کے معاملہ کو ہلکا سمجھتے ہیں امام کے ساتھ ہی تکبیر کہنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ غلطی ہے۔ (رسالہ الصلوۃ لاحمد ص ۲۵۲)

امام احمد نے اس مقام پر بڑے بسط (تفصیل) سے لکھا ہے کہ امام سے پہلے یا

امام کے ساتھ تمام ارکان ادا کرنا غلط ہے۔ امام جب رکوع و سجود میں چلا جائے اور اس کی تکبیر کی آواز ختم ہو جائے تو مقتدی کو اس وقت رکوع و سجود وغیرہ امور شروع کرنے چاہئیں۔ ہمارے ملک میں یہ غلطی عام ہے' تمام طبقات یہ غلطی کرتے ہیں۔ اگر سبقت نہ کریں تو امام کے ساتھ ضرور ادا کرتے ہیں حالانکہ یہ صاف حدیث کے خلاف ہے۔ خطرہ ہے کہ نماز ضائع ہو جائے گی۔ امام کی اطاعت کا شرعاً یہی مطلب ہے کہ تمام ارکان وغیرہ امام پہلے ادا کرے۔ مقتدی اس وقت شروع کرے جب امام رکن میں مشغول ہو جائے۔ حدیث کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ امام سے سبقت درست ہے۔ نہ امام کی معیت بلکہ امام جب رکن میں مشغول ہو جائے اس کے بعد مقتدی امام کے ساتھ شریک ہو۔

تعجب ہے کہ تمام مکاتب فکر اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ بریلوی حضرات تو بدعات میں اس قدر محو ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو سنت کی محبت سے خالی کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت نئی سے نئی بدعتوں کی تلاش میں پریشان ہیں۔ اہلحدیث حضرات اور دوسرے موحد گروہ بھی اس غلطی میں از اول تا آخر مبتلا ہیں اِلاَّ مَنْ رَحِمَہٗ امام احمد کا ارشاد کس قدر درست ہے:

لَوْ صَلَّيْتَ فِيْ مِائَةِ مَسْجِدٍ مَّا رَأَيْتَ اَهْلَ مَسْجِدٍ وَّاحِدٍ يُّقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ عَلٰى مَا جَاءَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَنْ اَصْحَابِهٖ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ

"آپ سو مسجدوں میں نماز ادا فرمائیں۔ کسی میں بھی آنحضرت ﷺ کی سنت اور صحابہ کے طریق پر آپ کو نماز نہیں ملے گی"۔ (رسالہ الصلوٰۃ لاحمد ص ۱۵۴)

مولانا محمد اسماعیل سلفی کا کلام ختم ہوا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فہم اور عمل

امام احمد بن حنبل اور مولانا محمد اسماعیل سلفی نے ان احادیث کا جو مطلب بیان

کیا ہے' تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی رسول اللہ ﷺ کے فرامین کا یہی مطلب سمجھا ہے اور اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔

((عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّيْ خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ لَمْ يَحْنِ أَحَدٌ مِّنَّا ظَهْرَهٗ حَتّٰى يَضَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَبْهَتَهٗ عَلَى الْأَرْضِ.))

"براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے جب آپ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہتے تو ہم میں سے کوئی بھی اپنی پشت نہیں جھکاتا تھا یہاں تک کہ نبی ﷺ اپنی پیشانی زمین پر رکھ لیتے"۔ (بخاری و مسلم)

رسول اللہ ﷺ کا کوئی صحابی بھی آپ کے زمین پر پیشانی رکھنے سے پہلے اپنی پیٹھ نہیں جھکاتا تھا۔ کیا اب بھی کوئی ایسی مسجد ملتی ہے جس میں تمام لوگ اتنے حوصلے والے ہوں کہ ایک شخص بھی امام کے زمین پر پیشانی رکھنے تک اپنی پیٹھ کو نہ جھکائے کم از کم مجھے تو نہیں ملی۔ ہاں اللہ کی رحمت سے امید ضرور ہے کہ اگر ہم پوری کوشش کریں اور اپنے بھائیوں کو بار بار سمجھائیں تو اس عمل پر پابندی شروع ہو جائے گی۔

سعید بن مسیب کا حجاج کو جلد بازی سے روکنا

یہ اس وقت کی بات ہے جب حجاج بن یوسف کو مسلمانوں کی حکومت میں کوئی عہدہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ایک دفعہ اس نے سعید بن مسیب کے پہلو میں نماز ادا کی اور امام سے پہلے سر اٹھاتا اور اس سے پہلے سجدہ میں گرنا شروع کر دیا۔ جب اس نے سلام پھیرا تو سعید بن مسیب نے اس کی چادر کا کنارہ پکڑ لیا اور نماز کے بعد اذکار پڑھتے رہے۔ حجاج چھڑانے کی کوشش کرتا رہا تاآنکہ سعید نے اپنا ذکر مکمل کر لیا پھر حجاج کی طرف متوجہ ہو کر اسے اس کی جلد بازی پر خوب تنبیہ کی اور ساتھ ہی نماز کے آداب سکھائے۔ حجاج نے ساری بات خاموشی سے سنی اور جواب میں کچھ نہ

کہا۔ آخر ایک وقت آیا وہ حجاز کا حاکم بن گیا۔ جب مدینہ میں آیا اور مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوا تو سعید بن مسیب کی مجلس کا رُخ کیا اور ان کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا ایک دن وہ باتیں تم ہی نے کی تھیں؟ سعید نے اس کے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ہاں میں نے ہی کہی تھیں۔ حجاج نے کہا آپ جیسے معلم اور ادب سکھانے والے کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ کے بعد میں نے جو نماز بھی پڑھی آپ کی بات مجھے ضرور یاد آتی رہی پھر اٹھ کر چلا گیا۔ (البدایہ والنھایہ ص ۱۹۹' ج ۹)

اسی تادیب کا اثر تھا کہ گو حجاج کے ہاتھ سے بھلے بھلے لوگ محفوظ نہیں رہے مگر اس نے سعید کے ادب سکھانے کا ہمیشہ خیال رکھا اور انہیں کبھی نہ پریشان کیا نہ کوئی تکلیف پہنچائی۔

ہمیں بھی کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے ساتھ نماز پڑھنے والا اگر اس قسم کی جلد بازی کرے تو اسے سمجھائیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح فرما دے اور اس کی درست نمازوں اور نیک دعاؤں میں ہمارا حصہ بھی شامل ہو جائے اگر وہ قبول نہ بھی کرے تو ہم ادائے فرض سے تو سبکدوش ہو جائیں گے۔

مقیم امام کے پیچھے مسافر کی نماز

س: مسافر مقیم امام کے پیچھے باجماعت نماز ادا کرے تو کیا صرف دو رکعت پڑھ سکتا ہے؟ کیونکہ مسافر پر صرف دو رکعت فرض ہے خصوصاً جبکہ وہ امام کے ساتھ آخری دو رکعت میں ملا ہو۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب دیں"۔ (ناصر ریاض' لاہور)

ج: مسافر پر مقیم امام کے ساتھ پوری نماز پڑھنا واجب ہے خواہ وہ مقیم امام کے ساتھ شروع نماز میں داخل ہو یا درمیان میں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِیُؤْتَمَّ بِہٖ.))

"امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ (متفق علیہ)

دوسری حدیث میں ہے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((فَمَا اَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَكُمْ فَاَتِمُّوْا.))

"جو نماز تم امام کے ساتھ پالو وہ پڑھو اور جو تم سے رہ گئی تھی اس کو پورا کرلو"۔

(صحیح بخاری)

یہ دونوں احادیث مسافر اور مقیم دونوں کے لیے عام ہیں۔ جس طرح مقیم امام کی اقتداء کرتا ہے اسی طرح مسافر بھی امام کی اقتداء کرے گا۔ اسی طرح جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہوئے جو رکعات فوت ہو گئی تھیں ان کو پورا کیا جائے گا۔ مقتدی مسافر ہو یا مقیم کیونکہ یہ حکم عام ہے اور سب کے لیے ہے۔

موسیٰ بن سلمہ کہتے ہیں:

((كُنَّا مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ بِمَكَّةَ فَقُلْتُ اَنَا اِذَا كُنَّا مَعَكُمْ صَلَّيْنَا اَرْبَعًا وَاِذَا رَجَعْنَا اِلٰى رِحَالِنَا صَلَّيْنَا رَكْعَتَيْنِ؟ قَالَ تِلْكَ سُنَّةُ اَبِى الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.))

"ہم مکہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ میں نے پوچھا جب ہم تمہارے ساتھ ہوتے ہیں تو چار رکعات نماز ادا کرتے ہیں اور جب اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹتے ہیں تو دو رکعت ادا کرتے ہیں۔ (ایسا کیوں ہے؟) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا یہ ابو القاسم محمد ﷺ کی سنت ہے"۔

(مسند الامام احمد ج ۱، ص ۲۱۶، حدیث نمبر ۱۸۶۵)

علامہ ناصر الدین البانی اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"اس کی سند صحیح ہے اور اس کے رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں"۔ (ارواء الغلیل)

ایک روایت کے یہ لفظ ہیں، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ مسافر جب اکیلا ہو تو دو رکعت پڑھتا ہے اور جب مقیم کے پیچھے نماز ادا کرے تو پوری پڑھتا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ انہوں نے کہا تِلْكَ السُّنَّةُ یہی سنت ہے۔ (مسند احمد)

یہ حدیث اس مسئلہ میں صریح نص ہے کہ مسافر کے لیے مقیم امام کے پیچھے

پوری نماز پڑھنا ہی واجب ہے کیونکہ ایک صحابیِ رسول کا مِنَ السُّنَّةِ یا تِلْكَ هِيَ السُّنَّةِ کہنا مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتا ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں نماز دو رکعت ادا کی۔ آپ کے بعد ابوبکر' عمر رضی اللہ عنہما اس پر عمل کرتے رہے۔ اس حدیث کے آخر میں ہے:

((فَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا صَلَّى مَعَ الْإِمَامِ صَلَّى أَرْبَعًا وَّإِذَا صَلَّاهَا وَحْدَهُ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ.))

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب امام کے ساتھ نماز پڑھتے تو چار رکعت پڑھتے تھے اور جب اکیلے ہوتے تو دو رکعت پڑھتے"۔ (مشکوۃ المصابیح' کتاب الصلوۃ' باب صلوۃ المسافر' متفق علیہ)

یہ تھا ایک صحابیٔ رسول کا سنت پر عمل اور یہی عمل کرنے کا وہ دوسروں کو حکم دیتے تھے"۔ ابو مجلز کہتے ہیں:

((قُلْتُ لِابْنِ عُمَرَ: اَلْمُسَافِرُ يُدْرِكُ رَكْعَتَيْنِ مِنْ صَلٰوةِ الْقَوْمِ يَعْنِي الْمُقِيْمِيْنَ أَتُجْزِيْهِ الرَّكْعَتَانِ أَوْ يُصَلِّيْ بِصَلٰوتِهِمْ قَالَ فَضَحِكَ وَقَالَ يُصَلِّيْ بِصَلٰوتِهِمْ.)) (سنن الکبری للبیہقی ۳/۱۵۷)

علامہ البانی حفظہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں سَنَدُهُ صَحِيْحٌ اس کی سند صحیح ہے۔ (ارواء الغلیل)

میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا کہ مسافر مقیم امام کے ساتھ دو رکعت پالیتا ہے' کیا اسے دو رکعت کفایت کر جائیں گی یا جتنی مقیم لوگوں نے نماز ادا کی ہے اتنی کرے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یہ بات سن کر ہنس پڑے اور کہا جتنی نماز مقیم لوگوں نے پڑھی ہے' اتنی ہی مسافر پڑھے گا۔

یہ ایک صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور فتویٰ بھی ہے کہ مسافر مقیم امام کے پیچھے پوری نمازیں ادا کرے گا۔ خواہ وہ شروع میں امام کے ساتھ ملا ہو یا آخری دو رکعتوں

میں۔ اس کے برعکس اگر مقیم آدمی مسافر امام کے پیچھے نماز ادا کرتا ہے تو اسے پوری نماز پڑھنا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال نماز پڑھائی اور مقیم لوگوں کو کہا تم اپنی نماز پوری کرلو۔ ہم مسافر ہیں۔

از : (ع ۔ ع' مجلۃ الدعوۃ' دسمبر/ ۱۹۹۵ء)

امام کے پیچھے قنوتِ نازلہ میں آمین کہی جائے یا دُعا پڑھی جائے؟

س نماز میں جب قنوتِ نازلہ پڑھی جاتی ہے تو مقتدی بھی اسی طرح دُعا پڑھیں یا آمین کہیں؟ اس کا ثبوت قرآن اور حدیث سے بیان کریں؟ (محمد ندیم)

ج جب امام رکوع کے بعد نماز میں قنوتِ نازلہ پڑھتا ہے تو مقتدی اس پر آمین کہیں گے جیسا کہ سنن ابوداؤد میں صحیح حدیث ہے۔ سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

((قَنَتَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَهْرًا مُتَتَابِعًا فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ وَصَلٰوةِ الصُّبْحِ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلٰوةٍ إِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ مِنَ الرَّكْعَةِ الْاٰخِرَةِ يَدْعُوْ عَلٰى اَحْيَاءٍ مِنْ بَنِي سُلَيْمٍ عَلٰى رِعْلٍ وَّذَكْوَانَ وَعُصَيَّةَ وَيُؤَمِّنُ مَنْ خَلْفَهُ۔ قَالَ الْاَلْبَانِيُّ حَسَنٌ.)) (ابواب الوتر باب القنوت في الصلوة)

"رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینہ مسلسل پانچوں نمازوں کی آخری رکعت میں سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ کہنے کے بعد بنی سلیم کے قبیلے رِعل' ذکوان' عصیہ کے خلاف دُعا کی تھی اور جو آپ کے پیچھے تھے' وہ آمین کہتے تھے"

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقتدی صرف آمین کہے گا۔ از : (ع ۔ ع)

جماعت میں اکیلے کھڑے ہونے کا حکم

س: نماز کی جماعت ہو رہی ہو اور کوئی آدمی بعد میں آئے اور وہ پیچھے اکیلا کھڑا ہو کر نماز پڑھ لے تو کیا اس کی نماز ہو جائے گی یا اسے لوٹانی پڑے گی؟ کیا اگلی صف سے کسی آدمی کو کھینچ کر پیچھے لانا حدیث سے ثابت ہے۔

(غلام شبیر۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ)

ج: اگلی صف میں اگر جگہ ہو تو پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کرنی چاہیے اگر کوئی آدمی اس صورت میں نماز ادا کرے تو اسے نماز دہرانی چاہیے' حدیث میں آتا ہے کہ :

((اَنَّ النَّبِیَّ صَلَی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَاٰی رَجُلاً یُصَلِّی خَلْفَ الصَّفِّ وَحْدَہٗ فَاَمَرَہٗ اَنْ یُّعِیْدَ)) (مسند شافعی ۱۷۶' مصنف عبدالرزاق ۲۴۸۲' مصنف ابنِ ابی شیبہ ۱۹۲/۲' ابوداؤد ۶۸۳' ترمذی ۲۳۱' ابنِ ماجہ ۱۰۰۴)

"نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اس کو نماز لوٹانے کا حکم دیا"

صف میں سے کسی کو پیچھے کھینچ لانے کے متعلق حدیث صحیح ثابت نہیں۔

ابنِ عباس سے طبرانی اوسط میں جو روایت پیچھے کھینچ کر لانے کے متعلق ہے اس کی سند میں بشر بن ابراہیم راوی نہایت ضعیف ہے جیسا کہ علامہ ابنِ حجر نے تلخیص الجبیر ۳۷/۲ میں اور امام ہیثمی نے مجمع الزوائد ۹۶/۲ میں ذکر کیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں عام طور پر جو یہ بات معروف ہو رہی ہے کہ جماعت ہو رہی ہو اور صف میں جگہ نہ ہو تو اگلی صف میں سے ایک آدمی نماز کے لیے پیچھے کھینچ کر ساتھ ملا لیں۔ اس کا ثبوت صحیح حدیث میں نہیں اور صف کا منقطع کرنا درست نہیں کیونکہ حدیث صحیح میں ہے کہ :

((مَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَہُ اللّٰہُ وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَہُ اللّٰہُ))

"جس نے صف کو ملایا اللہ اس کو ملائے گا اور جس نے اسے منقطع کیا اللہ اسے توڑ دے گا"۔ (ابوداؤد)

اور اعادہ صلوۃ والی حدیث اس معنی پر ہی محمول ہے کہ اگلی صف میں جگہ نہ

ملے تو پیچھے انفرادی نماز ادا کرے۔ ان شاء اللہ نماز صحیح ہو گی اور اگر اگلی صف میں جگہ موجود ہو اور پیچھے کھڑا ہو جائے تو نماز کا اعادہ کرے۔ شیخ ابنِ باز اور علامہ البانی حفظہما اللہ نے یہی موقف اپنایا ہے اور امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی موقف نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری ۲/۲۱۳' سلسلة الاحادیث الضعیفه والموضوعه ۲/۳۲۲' امام مالک' احمد' اوزاعی' اسحاق' ابوحنیفہ اور داؤد ظاہری کا یہی مذہب ہے کہ صف سے آدمی نہ کھینچا جائے۔ المجموع ۴/۲۹۹ (مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۳ء)

ایک مسجد میں دوبارہ جماعت کا حکم

س کیا ایک مسجد میں دو جماعتیں ہو سکتی ہیں یا صرف ایک ہی جماعت کا حکم ہے؟ (محمد ریاض شاہد' چک نمبر ۲۰۲ بہاولنگر)

ج ایک ہی مسجد میں دوبار جماعت کرانے کا جواز صحیح احادیث میں موجود ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' تابعین عظام اور فقہاء محدثین رحمہم اللہ کا اس پر عمل رہا ہے۔ سنن ابوداؤد میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبْصَرَ رَجُلاً يُصَلِّي وَحْدَهُ فَقَالَ اَلَا رَجُلٌ يَتَصَدَّقُ عَلٰى هٰذَا فَيُصَلِّيَ مَعَهُ))

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ اکیلا نماز پڑھ رہا ہے تو آپ نے فرمایا: کیا ایسا کوئی آدمی نہیں جو اس پر صدقہ کرے اور اس کے ساتھ نماز پڑھے۔" (سنن ابوداؤد ۱/۱۵۷' ترمذی ۱/۴۲۷)

ترمذی میں یہ الفاظ مروی ہیں:

((اَيُّكُمْ يَتَّجِرُ عَلٰى هٰذَا فَقَامَ رَجُلٌ فَصَلّٰى مَعَهُ))

"تم میں سے کون شخص ہے جو اس کے ساتھ اُجرت میں شریک ہو؟ ایک آدمی کھڑا ہوا اور اُس نے اِس کے ساتھ مل کر نماز پڑھی"۔

یہ روایت کئی طرق سے مروی ہے اور مسند احمد ۳/۵' ۴۵' ۸۵۔ سنن دارمی ۱/۳۱۸' مستدرک حاکم' محلی ابنِ حزم ۴/۲۳۸۔ امام حاکم نے مستدرک حاکم میں اس

روایت کو صحیح کہا ہے اور تلخیص میں امام ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔ علامہ زیلعی حنفی نے نصب رایہ میں اور علامہ سیوطی نے قوت المغتذی میں لکھا ہے کہ جس آدمی نے ساتھ کھڑے ہو کر نماز ادا کی تھی وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جماعت ثانیہ مسجد میں جائز ہے اور اگر کوئی شخص اس وقت مسجد میں آئے جب جماعت ہو چکی ہو تو وہ دوبارہ کسی کے ساتھ مل کر جماعت کی صورت میں نماز ادا کرے تو یہ صحیح مشروع اور جائز ہے اور آپ کے الفاظ ((اَيُّكُمْ يَتَّجِرُ عَلٰى هٰذَا اَلَا رَجُلٌ يَتَصَدَّقُ عَلٰى هٰذَا)) اس پر شاہد ہیں۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بھی اس حدیث کا یہی مفہوم سمجھا اور وہ دوسری جماعت کے قائل و فاعل تھے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ:

((جَاءَ اَنَسٌ اِلَى الْمَسْجِدِ قَدْ صُلِّيَ فِيْهِ فَاَذَّنَ وَاَقَامَ وَصَلّٰى جَمَاعَةً.))

"سیدنا انس رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے جماعت فوت ہو چکی تھی تو انہوں نے اذان و اقامت کہی اور جماعت سے نماز پڑھی۔" ان کا یہ اثر ابنِ ابی شیبہ ۱/۴۸۱ابو یعلیٰ اور بیہقی میں موصولاً مروی ہے اس کی سند صحیح ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' جولائی / ۱۹۹۲ء)

ایک مسجد میں دوسری جماعت

س جب ایک مسجد میں نماز باجماعت ادا ہو جائے' پھر اس کے بعد کچھ اور لوگ آ جائیں تو کیا دوبارہ جماعت کروا سکتے ہیں کتاب و سنت کی رُو سے واضح کریں؟

ج ایک مسجد میں دوسری جماعت کروانے کے متعلق سلف صالحین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض ائمہ مثل امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام اسحاق بن راہویہ وغیرہ اس بات کی طرف گئے ہیں کہ دوسری جماعت کرانا جائز ہے جبکہ امام مالک رحمہ اللہ ' امام شافعی رحمہ اللہ ' اور اصحاب الرائے وغیرہ کا موقف یہ ہے کہ دوسری جماعت مکروہ ہے۔ امام شافعی کا کہنا ہے کہ جس مسجد میں امام اور موذن مقرر ہوں

وہاں دوسری جماعت کرانا مکروہ ہے۔ اگر جماعت کرالیں تو کفایت کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب الام للشافعی (۱۳۶/۱، ۱۳۷) جبکہ اصحاب الرائے احناف کا کہنا ہے کہ مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ فتاویٰ شامی وغیرہ میں مذکور ہے۔

فریق اول کے دلائل درج ذیل ہیں:

((عَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَاٰی رَجُلاً یُصَلِّی فِی الْمَسْجِدِ فَقَالَ اَلاَ رَجُلٌ یَتَّجِرُ عَلٰی هٰذَا فَیُصَلِّیَ مَعَهٗ))

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو مسجد میں اکیلا نماز پڑھ رہا تھا تو آپ نے فرمایا کون اس کے ساتھ تجارت میں شریک ہو گا کہ اس کے ہمراہ نماز ادا کرے۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک آدمی مسجد میں اس وقت داخل ہوا جب جماعت ہو چکی تھی تو آپ نے فرمایا:

((مَنْ یَّتَصَدَّقُ عَلٰی هٰذَا فَیُصَلِّیَ مَعَهٗ فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ فَصَلّٰی مَعَهٗ))

"کون اس پر صدقہ کرے گا کہ اس کے ساتھ نماز ادا کرے؟ لوگوں میں سے ایک آدمی نے کھڑے ہو کر اس کے ساتھ نماز ادا کی"

بیہقی میں ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ نماز ادا کی۔ (ملاحظہ ہو المنتقی لابن جارود (۳۳۰) ابوداؤد (۵۷۴) ترمذی (۲۲۰) دارمی ۲۵۸/۱، مسند احمد ۶۴/۳، ۸۵، ۴۵/۵، مسند ابی یعلی ۳۲۱/۲، ابنِ حبان (۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸)، طبرانی صغیر ۲۱۸/۱، ۲۳۸) بیہقی ۶۹/۳، المحلی ۲۳۸/۴، حاکم ۲۰۹/۱، شرح السنة ۴۳۶/۳، ابنِ ابی شیبہ ۳۲۲/۲، ابنِ خزیمہ (۱۶۳۲)، نصب الرایة ۵۷/۲) التدوین فی اخبار قزوین للرافعی ۲۵۸/۲)

یہی حدیث انس بن مالک سے سنن دارقطنی ۲۷۷/۱ میں مروی ہے جس کے بارے میں علامہ نیموی حنفی نے آثار السنن ۲۶۷/۱ پر لکھا "اِسْنَادُهٗ صَحِیْحٌ" علامہ

زیلعی نے نصب الرایہ میں ۲/۵۸ پر لکھا (وَسَنَدُہٗ جَیِّدٌ) اسی طرح حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے الدرایہ ۱/۱۷۳ پر اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام ترمذی نے حسن' امام حاکم و امام ذہبی اور امام ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہم نے صحیح کہا ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ شرح السنہ میں اس حدیث کے بعد فرماتے ہیں :

"وَفِیْهِ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّهٗ یَجُوْزُ لِمَنْ صَلّٰی فِیْ جَمَاعَةٍ اَنْ یُّصَلِّیَهَا ثَانِیًا مَعَ جَمَاعَةٍ آخَرِیْنَ وَاَنَّهٗ یَجُوْزُ اِقَامَةُ الْجَمَاعَةِ فِیْ مَسْجِدٍ مَرَّتَیْنِ وَهُوَ قَوْلُ غَیْرِ وَاحِدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِیْنَ"

"یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے ایک دفعہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لی ہو' اس کے لیے جائز ہے کہ وہ دوسری مرتبہ دوسرے لوگوں کے ساتھ نماز ادا کرلے۔ اسی طرح مسجد میں دوبارہ جماعت قائم کرنا بھی جائز ہے۔ یہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے"

امام ابنِ قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"وَلَا یُکْرَهُ اِعَادَةُ الْجَمَاعَةِ فِی الْمَسْجِدِ وَمَعْنَاهُ اَنَّهٗ اِذَا صَلّٰی اِمَامُ الْحَیِّ وَحَضَرَهَا جَمَاعَةٌ اُخْرٰی اسْتُحِبَّ لَهُمْ اَنْ یُّصَلُّوْا جَمَاعَةً وَهٰذَا قَوْلُ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَّ عَطَاءٍ وَّ الْحَسَنِ وَالنَّخْعِیِّ وَقَتَادَةَ وَاِسْحَاقَ۔"

"ایک مسجد میں جماعت کا اعادہ کرنا مکروہ نہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب محلے کے امام نے نماز پڑھ لی اور دوسری جماعت حاضر ہو گئی تو ان کے لیے مستحب ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ یہ قول عبداللہ بن مسعود' عطاء' نخعی' حسن' قتادہ' اور اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہم کا ہے"۔ (المغنی ۳/۱۰)

پھر امام ابنِ قدامہ رحمہ اللہ نے اس کے بعد حدیث ابی سعید بھی ذکر کی :

دوسری دلیل :

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ "فَضْلُ صَلاَةِ الْجَمْعِ عَلٰی صَلاَةِ الْوَاحِدِ خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ دَرَجَةً))

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جماعت کی نماز کی فضیلت اکیلے آدمی کی نماز پر ۲۵ درجے زیادہ ہے"۔ (بخاری مع فتح الباری ۳۹۹/۲' مسلم ۱۵۱/۵' مع نووی موطا ۲۹/۱' نسائی ۲۴۱/۱' ۱۰۳/۲' ترمذی (۲۱۶)' ابنِ ماجہ (۷۸۷)' دارمی ۲۳۵/۱' ابوعوانہ ۲/۲' ابنِ خزیمہ ۳۶۴/۲' ابنِ حبان ۳۸۱/۳' ۳۸۲' بیہقی ۶۰/۳' شرح السنہ ۳۴۰/۳)

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ۲۷ درجے فضیلت کا ذکر ہے۔ (ملاحظہ ہو بخاری مع فتح الباری ۱۳۱/۲)

یہ حدیث اپنے عموم کے اعتبار سے پہلی اور دوسری دونوں جماعتوں کو شامل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آدمی کی پہلی جماعت فوت ہوجائے تو وہ دوسری جماعت کے ساتھ نماز ادا کرلے تو مذکورہ فضیلت پالے گا۔

تیسری دلیل

((عَنِ الْجَعْدِ اَبِیْ عُثْمَانَ قَالَ مَرَّ بِنَا اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ فِیْ مَسْجِدِ بَنِیْ ثَعْلَبَةَ فَقَالَ اَصَلَّیْتُمْ قَالَ : قُلْنَا نَعَمْ وَذَاكَ صَلاَةُ الصُّبْحِ فَاَمَرَ رَجُلاً فَاَذَّنَ وَاَقَامَ ثُمَّ صَلّٰی بِاَصْحَابِهٖ))

"ابو عثمان الجعد سے مروی ہے کہ بنو ثعلبہ کی مسجد میں انس بن مالک ہمارے پاس سے گزرے تو کہا کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے؟ تو کہتے ہیں کہ میں نے کہا ہاں اور وہ صبح کی نماز تھی۔ آپ نے ایک آدمی کو حکم کیا' اس نے اذان و اقامت کہی' پھر اپنے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی" (یہ خبر بخاری میں تعلیقاً ۱۳۱/۲ مع فتح الباری اور مسند ابی یعلیٰ (۴۳۵۵) ۳۱۵/۷' ابنِ ابی شیبہ ۳۲۱/۲' بیہقی ۷۰/۳' مجمع الزوائد ۴/۲' المطالب العالیہ ۱۱۸/۱ (۴۲۶) تغلیق التعلیق ۲۷۶/۲' عبدالرزاق ۲۹۱/۲ طبقات المحدثین لابی الشیخ ۴۰۲/۱' ۴۰۳ میں موصولاً مروی ہے۔)

چوتھی دلیل ابنِ ابی شیبہ میں ہے کہ :

((اِبْنُ مَسْعُوْدٍ دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَقَدْ صَلَّوْا فَجَمَعَ بِعَلْقَمَةَ وَمَسْرُوْقٍ وَالْاَسْوَدَ))

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو لوگوں نے نماز پڑھ لی تھی تو آپ نے علقمہ، مسروق اور اسود کو جماعت کرائی۔" (ابکار المنن ص ۲۵۴، اس کی سند صحیح ہے۔ مرعاۃ شرح مشکوۃ ۴/۱۰۴)

مذکورہ بالا احادیث و آثار صریحہ سے معلوم ہوا کہ مسجد میں دوسری جماعت کرا لینا بلا کراہت جائز و درست ہے اور یہ موقف اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔

مکروہ سمجھنے والوں کے دلائل

ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْبَلَ مِنْ بَعْضِ نَوَاحِي الْمَدِيْنَةِ يُرِيْدُ الصَّلٰوةَ فَوَجَدَ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا فَانْصَرَفَ اِلٰى مَنْزِلِهٖ فَجَمَعَ اَهْلَهٗ ثُمَّ صَلّٰى بِهِمْ))

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے اطراف سے آئے، آپ نماز ادا کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟ تو آپ اپنے گھر چلے گئے، آپ نے گھر والوں کو جمع کیا، پھر ان کے ساتھ نماز پڑھی" (الکامل لابن عدی ۶/۲۳۹۸، مجمع الزوائد ۲/۴۸، طبرانی اوسط (۴۷۳۹) علامہ البانی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے تمام المنۃ ۱/۱۵۵)

اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کو طبرانی نے معجم کبیر و اوسط میں بیان کیا ہے۔ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ اس سے یہ دلیل لی جاتی ہے کہ اگر دوسری جماعت بلا کراہت جائز ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی فضیلت کو ترک نہ کرتے یعنی مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی فضیلت عام مسجد میں نماز ادا کرنے سے بہت زیادہ ہے۔

ج = اوّلاً: مولانا عبیداللہ مبارک پوری رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں "اس حدیث سے دوسری جماعت کی مکروہیت پر دلیل پکڑنا محل نظر ہے۔ اس لیے

کہ یہ حدیث اس بارے میں نص نہیں کہ آپ نے ان کو گھر میں نماز پڑھائی ہو بلکہ اس بات کا بھی احتمال موجود ہے کہ آپ نے انہیں نماز مسجد میں پڑھائی ہو۔ آپ کا گھر کی طرف جانا گھر والوں کے جمع کرنے کے لیے تھا' نہ کہ گھر میں جماعت کروانے کے لئے' تو اس صورت میں یہ حدیث اس مسجد میں جس کا موذن و امام متعین ہو' دوسری جماعت کے استحباب کی دلیل ہو گی۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ نے اپنے گھر والوں کو گھر میں ہی جماعت کرائی تو اس سے مسجد میں دوبارہ جماعت کی کراہت ثابت نہیں ہوتی بلکہ انتہائی آخری بات جو ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایک آدمی ایسی مسجد میں آئے جس میں جماعت ہو چکی ہو تو اس کو چاہیے کہ اس مسجد میں نماز نہ پڑھے بلکہ اس سے نکل کر گھر چلا جائے تو گھر میں اپنے اہل کے ساتھ نماز پڑھے۔

بہرحال اس کے لیے مسجد میں دوسری جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کو مکروہ کہنا اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ یہ حدیث بعد میں آنے والے اکیلے آدمی کی اس مسجد میں نماز کی کراہت پر دلالت نہیں کرتی۔ اگر اس حدیث سے مسجد میں دوبار جماعت کے مکروہ ہونے پر دلیل لی جائے تو پھر اس سے یہ بھی ثابت ہو گا کہ اکیلے بھی اس مسجد میں نماز نہ پڑھے۔ (مرعاۃ ۱۰۵/۴)

دوسری دلیل :

ثانیاً : اگرچہ علامہ البانی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے مگر یہ محل نظر ہے کیونکہ اس کی سند ہے کیونکہ اس کی سند میں بقیۃ بن الولید مدلس راوی ہیں اور یہ تدلیس التسویہ کرتا ہے جو کہ انتہائی بڑی تدلیس ہے اور اس کی تصریح بالسماع مسلسل نہیں ہے۔

((عَنْ اِبْرَاهِيمَ اَنَّ عَلْقَمَةَ وَالْاَسْوَدَ اَقْبَلَا مَعَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اِلَى مَسْجِدٍ فَاسْتَقْبَلَهُمُ النَّاسُ قَدْ صَلَّوْا فَرَجَعَ بِهِمْ اِلَى الْبَيْتِ فَجَعَلَ اَحَدَهُمَا عَنْ يَمِيْنِهِ وَالْاٰخَرَ عَنْ شِمَالِهِ ثُمَّ صَلّٰى بِهِمَا.))

"ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ علقمہ اور اسود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد کی طرف آئے تو لوگ انہیں اس حالت میں ملے کہ انہوں نے نماز پڑھ لی تھی تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان دونوں کے ساتھ گھر کی طرف چلے گئے' انہوں نے ایک کو دائیں جانب اور دوسرے کو بائیں جانب کیا پھر ان کو نماز پڑھائی" (عبدالرزاق (۳۸۸۳)۲/۴۰۹' طبرانی کبیر(۹۳۸۰)

اس روایت کی سند میں حماد بن ابی سلیمان ہیں جو مختلط اور مدلس تھے۔ ملاحظہ ہو طبقات المدلسین ۳۰ اور یہ روایت معنعن ہے اور مدلس کی عن عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔ نیز حماد کے اختلاط سے قبل تین راویوں کی روایت حجت ہوتی ہے۔ علامہ ہیثمی فرماتے ہیں:

وَلاَ يُقْبَلُ مِنْ حَدِيْثِ حَمَّادٍ اِلاَّ مَا رَوَاهُ عَنْهُ الْقُدَمَاءُ شُعْبَةُ وَسُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ وَالدَّسْتَوَائِي وَمَنْ عَدَا هٰؤُلاَءِ رَوَوْا عَنْهُ بَعْدَ الْاِخْتِلاَطِ (مجمع الزوائد ۱/۱۲۵)

"حماد بن ابی سلیمان کی وہ روایت قبول کی جائے جو اس سے قدماء یعنی اختلاط سے پہلے والے راویوں کی روایت ہو گی جیسے شعبہ' سفیان ثوری اور ہشام دستوائی اور جو ان کے علاوہ اس سے روایت کریں وہ بعد از اختلاط ہے۔"

تقریباً یہی بات امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے منقول ہے۔ ملاحظہ ہو شرح علل ترمذی للابن رجب ص ۳۲۶ وغیرہ اور یہ روایت حماد سے معمر نے بیان کی ہے لہٰذا یہ بھی قابل حجت نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے دونوں شاگردوں کو دائیں بائیں کھڑا کر کے جماعت کروائی اور یہ بات احناف کو مسلم نہیں جیسا کہ محمد بن حسن شیبانی شاگرد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الآثار ص ۷۹ مترجم میں ذکر کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اوپر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مسجد میں دوبارہ جماعت کروانا صحیح سند کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا توضیحات سے معلوم ہوا کہ دوسری

جماعت کی کراہت کے بارے میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں بلکہ صحیح روایات سے دوسری جماعت کا جواز نکلتا ہے اور یہی جواز والا مذہب اقرب الی الصواب ہے۔ مولانا عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فَارْجَحُ الْاَقْوَالِ عِنْدَنَا هُوَ اَنَّهُ يَجُوْزُ وَيُبَاحُ مَنْ اَتٰى مَسْجِدًا قَدْ صُلِّيَ فِيْهِ بِاِمَامٍ رَاتِبٍ وَهُوَ لَمْ يَكُنْ صَلَّاهَا وَقَدْ فَاتَتْهُ الْجَمَاعَةُ لِعُذْرٍ اَنْ يُّصَلِّيَ بِالْجَمَاعَةِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

(مرعاۃ شرح مشکوۃ ۴/۱۰۷)

"ہمارے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ جو آدمی مسجد میں اس حال میں پہنچا کہ امام معین کے ساتھ نماز ادا ہو چکی ہو اور اُس نے وہ نماز نہیں پڑھی اور عذر کی بنا پر اس کی جماعت فوت ہو گئی تو اس کے لیے جائز و مباح ہے کہ وہ جماعت ثانیہ کے ساتھ نماز ادا کر لے"۔

بہرصورت یہ یاد رہے کہ بغیر عذر کے جماعت سے پیچھے رہنا اور خواہ مخواہ سستی و کاہلی کا شکار ہو کر دوسری جماعت کا رواج ڈالنا درست نہیں کیونکہ دوسری جانب جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی بہت تاکید وارد ہوئی ہے اور رسول اللہ ﷺ پسند کرتے تھے کہ مومنوں کی نماز اکٹھی ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَقَدْ اَعْجَبَنِيْ اَنْ تَكُوْنَ صَلَاةُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاحِدَةً حَتّٰى لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اَبُثَّ رِجَالًا فِي الدُّوْرِ فَيُؤْذِنُوْنَ النَّاسَ بِحِيْنِ الصَّلٰوةِ))

(ابنِ خزیمہ ۱/۱۹۹، ابوداؤد (۵۰۶) ۱/۱۳۸)

"مجھے یہ بات پسند ہے کہ مومنوں کی نماز ایک ہو یہاں تک کہ میں نے ارادہ کیا کہ کچھ آدمیوں کو محلوں میں پھیلا دوں اور وہ لوگوں کو نماز کے وقت کی اطلاع دیں"۔

اس کے علاوہ بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی تاکید میں کئی ایک احادیث صحیحہ صریحہ وارد ہوئی ہیں جن سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہمیں جماعت

کے ساتھ نماز ادا کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ سوائے عذر شرعی کے جماعت سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اگر ہم گھر سے نماز باجماعت کے ارادے سے نکلتے ہیں اور ہمارے آتے آتے نماز فوت ہو جاتی ہے تو مسجد میں آکر ادا کرنے سے جماعت کا ثواب مل جائے گا' جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

((مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ رَاحَ فَوَجَدَ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا أَعْطَاهُ اللّٰهُ مِثْلَ أَجْرِ مَنْ صَلَّاهَا وَحَضَرَهَا لَا يَنْقُصُ ذَالِكَ مِنْ أَجْرِهِمْ شَيْئًا))

"جس نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا' پھر چل پڑا (مسجد کی طرف) اُس نے لوگوں کو پایا کہ انہوں نے نماز پڑھ لی ہے تو اللہ تعالیٰ اس آدمی کو نماز باجماعت ادا کرنے اور اس میں حاضر ہونے والے کی طرح اجر دے گا۔ ان کے اجروں سے کچھ کمی نہیں کرے گا"۔ (سنن ابوداود (۵۶۴) 'نسائی ۱۱۱/۲' شرح السنۃ ۳۴۲/۳' مستدرک ۲۰۸/۱' امام حاکم نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ مسند احمد ۳۸۰/۲ تاریخ کبیر للبخاری ق ۲' ج ۸' ص ۳۶)

یہ روایت حسن ہے۔ نیل المقصود (۵۶۴) اور اس کا ابوداود میں ایک شاہد بھی ہے۔ ملاحظہ ہو (۵۶۳) لہٰذا بغیر عذر شرعی کے جماعت سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے اور اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت سے رہ گیا تو اور افراد کے ساتھ مل کر دوسری جماعت کرا لی تو بلا کراہت جائز ہے۔

قنوتِ نازلہ کیا اور کیوں؟

س قنوتِ نازلہ کیا ہے اور یہ کیوں کی جاتی ہے۔ یہ قنوت کچھ مدت کے لیے تھی یا ہمیشہ جاری رہی اور اسی طرح اب ضرورت کے تحت قنوت ہو گی یا ہمیشہ جاری رکھی جائے گی؟ قنوت کے لیے کوئی مسنون دعا ہے یا حالات کے تحت کمی بیشی ممکن ہے۔ اس کی دلیل کیا ہے بعض لوگ دعا میں اپنی ذاتی دعائیں بھی شامل کر لیتے ہیں

آخر میں صلی اللہ علی النبی پڑھتے ہیں اس کی کوئی دلیل ہے؟

(ابو الحبیب ۔ لاہور)

ج: قنوت دُعا کو کہتے ہیں اور نازلہ کا معنی مصیبت میں گرفتار ہونا ہے۔ زمانے کی حوادثات میں پھنس جانے کے وقت نماز میں اللہ تعالیٰ سے گریہ و زاری کر کے ان حوادثات و وقائع کے دفعیہ کے لیے التجا کرنا اور بہ عجز و انکساری ان واقعات سے نجات پانے کے لیے دُعائیں مانگنا قنوتِ نازلہ کہلاتا ہے۔

دُنیا میں مصائب و آلام کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً دُنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں پر کفار و مشرکین یا یہودی یا عیسائی ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ دن رات ان کو پریشانیوں میں مبتلا کر رہے ہیں۔ ان کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں اور کمزور و لاغر مُسلمان ان کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں وغیرہ تو ان تمام حالات میں قنوتِ نازلہ کی جاتی ہے اور یہ نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام' فقہاء محدثین اور سلف صالحین رحمہم اللہ کا طریقہ رہا ہے۔ اس دُعا کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مُسلمان اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے انتہائی تذلل اور عجز و انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ یااللہ ہمیں ان مصائب و آلام سے محفوظ فرما۔ ہمارے گناہوں کو بخش دے۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں قنوت اس لیے کرتا ہوں تاکہ تم اپنے پروردگار کو پکارو اور اس سے اپنی ضروریات کے بارے میں سوال کرو۔ (مجمع الزوائد ۱۳۸/۲)

نبی کریم ﷺ نے مصیبت پریشانی اور رنج و غم کے پیش نظر کبھی پانچوں نمازوں میں قنوت کی اور کبھی بعض نمازوں میں۔ چنانچہ صحیح مسلم ۲۳۷/۱ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں:

((وَاللّٰهِ لَاُقَرِّبَنَّ بِكُمْ صَلَاةَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اَبُوْهُرَيْرَةَ يَقْنُتُ فِي الظُّهْرِ وَالْعِشَاءِ الْاٰخِرِ وَصَلٰوةِ الصُّبْحِ

آخر میں صلی اللہ علی النبی پڑھتے ہیں اس کی کوئی دلیل ہے؟

(ابوالحبیب۔ لاہور)

ج قنوت دُعا کو کہتے ہیں اور نازلہ کا معنی مصیبت میں گرفتار ہونا ہے۔ زمانے کی حوادثات میں پھنس جانے کے وقت نماز میں اللہ تعالیٰ سے گریہ و زاری کر کے ان حوادثات و وقائع کے دفعیہ کے لیے التجا کرنا اور بہ عجز و انکساری ان واقعات سے نجات پانے کے لیے دُعائیں مانگنا قنوتِ نازلہ کہلاتا ہے۔

دُنیا میں مصائب و آلام کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً دُنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں پر کفار و مشرکین یا یہودی یا عیسائی ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ دن رات ان کو پریشانیوں میں مبتلا کر رہے ہیں۔ ان کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں اور کمزور و لاغر مسلمان ان کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں وغیرہ تو ان تمام حالات میں قنوتِ نازلہ کی جاتی ہے اور یہ نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام' فقہاء محدثین اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کا طریقہ رہا ہے۔ اس دُعا کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مُسلمان اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے انتہائی تذلل اور عجز و انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ یا اللہ ہمیں ان مصائب و آلام سے محفوظ فرما۔ ہمارے گناہوں کو بخش دے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں قنوت اس لیے کرتا ہوں تاکہ تم اپنے پروردگار کو پکارو اور اس سے اپنی ضروریات کے بارے میں سوال کرو۔ (مجمع الزوائد ۱۳۸/۲)

نبی کریم ﷺ نے مصیبت پریشانی اور رنج و غم کے پیش نظر کبھی پانچوں نمازوں میں قنوت کی اور کبھی بعض نمازوں میں۔ چنانچہ صحیح مسلم ۲۳۷/۱ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں:

((وَاللّٰهِ لَاُقَرِّبَنَّ بِكُمْ صَلَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اَبُوْهُرَيْرَةَ يَقْنُتُ فِي الظُّهْرِ وَالْعِشَاءِ الْاٰخِرِ وَصَلٰوةِ الصُّبْحِ

وَيَدْعُوْا لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَلْعَنُ الْكُفَّارَ.))

"اللہ کی قسم! میں تمہارے قریب وہ نماز ادا کروں جو رسول اللہ ﷺ کی نماز ہے۔
پس سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ظہر، عشاء اور فجر کی نماز میں قنوت کرتے تھے اور مومنوں کے لیے دُعا کرتے اور کافروں پر لعنت کرتے تھے۔"

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صبح اور مغرب کی نماز میں قنوت کرتے تھے۔ (مسلم ۱/۲۳۷)

((عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي صَلَاةِ الْعَتَمَةِ شَهْرًا.)) الحديث (صحیح ابو داؤد ۱/۲۷۰)

رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز میں ایک ماہ قنوت کیا۔

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَهْرًا مُتَتَابِعًا فِي الظُّهْرِ۔ وَالْعَصْرِ وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ وَصَلَاةِ الصُّبْحِ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ اِذَا قَالَ "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" مِنْ بَنِيْ سُلَيْمٍ عَلٰى رِعْلٍ وَّذَكْوَانَ وَعُصَيَّةَ وَيُؤَمِّنُ مَنْ خَلْفَهٗ))

(صحیح ابو داؤد ۱/ ۲۷۰، ۲۷۱)

"ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے متواتر ایک مہینہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی ہر نماز میں جب اخیر رکعت میں سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہتے تو قنوت کرتے اور بنو سلیم کے چند قبیلوں رعل، ذکوان اور عصیہ پر بددُعا کرتے اور مقتدی آمین کہتے"۔

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ آپ مختلف حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کبھی ایک نماز میں، کبھی دو تین اور کبھی اکٹھی پانچ نمازوں میں قنوت کرتے تھے۔ تو ہمیں بھی حالات و واقعات کے تقاضے کے مطابق ایسا کرنا چاہیے اور یہ معاملہ اس وقت تک جاری رہے جب تک دُشمنوں کی مکمل سرکوبی نہیں ہوتی اور مُسلمانوں کے مصائب و آلام میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

مروی ہے کہ:

((اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَنَتَ بَعْدَ الرَّکْعَۃِ فِی صَلَاۃٍ شَھْرًا اِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ یَقُوْلُ فِی قُنُوْتِہٖ اَللّٰھُمَّ نَجِّ الْوَلِیْدَ بْنَ الْوَلِیْدَ اَللّٰھُمَّ نَجِّ سَلَمَۃَ بْنَ ھِشَامٍ اَللّٰھُمَّ نَجِّ عَیَّاشَ بْنَ اَبِی رَبِیْعَۃَ اَللّٰھُمَّ نَجِّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَللّٰھُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَکَ عَلٰی مُضَرَ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا عَلَیْھِمْ سِنِیْنَ کَسِنِیْ یُوْسُفَ قَالَ اَبُوْھُرَیْرَۃَ ثُمَّ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ تَرَکَ الدُّعَاءَ بَعْدُ فَقُلْتُ اُرٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ تَرَکَ الدُّعَاءَ لَھُمْ قَالَ فَقِیْلَ وَمَا تَرَاھُمْ قَدِمُوْا.)) (۱/۲۷۰)

"نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ تک رکوع کے بعد قنوت کیا۔ جب آپ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہتے تو اپنی قنوت میں کہتے۔ اے اللہ ولید بن ولید کو نجات دے۔ اے اللہ سلمہ بن ہشام کو نجات دے۔ اے اللہ عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات دے۔ اے اللہ ضعیف مومنوں کو نجات دے۔ اے اللہ اپنا عذاب قبیلہ مضر پر سخت کر۔ اے اللہ ان پر یوسف ؑ کے زمانے جیسا قحط ڈال دے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں پھر میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے دُعا کرنا چھوڑ دی تو لوگوں نے کہا تم دیکھتے نہیں جن کے لیے رسول اللہ ﷺ دُعا کرتے تھے وہ آ گئے ہیں۔ یعنی کفار کے غلبہ سے انہیں نجات مل گئی ہے۔"

موجودہ حالات میں چونکہ مُسلمان کئی ممالک میں (بوسنیا فلسطین، کشمیر، الجزائر وغیرہ) سفاک و خونخوار دُشمن کے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور کئی ممالک میں مُسلمان سالہا سال سے جور و جفا کی چکی میں پس رہے ہیں تو ان کی نصرت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جب ہم جہاد بالسیف وغیرہ جیسی تدابیر کے ساتھ صف آراستہ ہیں تو ہمیں قنوتِ نازلہ جیسے مجرب ہتھیار سے بھی کام لینا چاہیے۔ تمام مُسلمان اپنی نمازوں میں رکوع کے بعد سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہہ کر سجدہ میں

جانے سے قبل ان کے لیے دُعا کریں۔ دُعا کرتے وقت امام مختلف ادعیہ جب پڑھے تو پیچھے مقتدی آمین کہتے جائیں جیسا کہ اوپر ابوداؤد کے حوالے سے صحیح حدیث گزر چکی ہے۔ قنوتِ نازلہ سے مقصود مظلوم و مقہور مُسلمانوں کی نصرت و کامیابی اور سفاک و جابر دُشمن کی ہلاکت و بربادی ہے اس لیے اس مقصد کو جو دُعا بھی پورا کرے وہ مانگی جا سکتی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم ۲۳۷/۱ میں لکھا ہے کہ:

"وَالصَّحِيحُ اَنَّهُ لَا يَتَعَيَّنُ فِيهِ دُعَاءٌ مَخْصُوصٌ بَلْ يُحْصَلُ بِكُلِّ دُعَاءٍ وَفِيهِ وَجْه اَنَّهُ لَا يُحْصَلُ اِلَّا بِالدُّعَاءِ الْمَشْهُورِ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ اِلَى اٰخِرِهِ وَالصَّحِيحُ اَنَّ هٰذَا مُسْتَحَبٌّ لَا شَرْطٌ۔"

"صحیح بات یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی مخصوص دُعا متعین نہیں بلکہ ہر اس دُعا کو پڑھا جا سکتا ہے جس سے یہ مقصود حاصل ہوتا ہو اور اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ آخر تک پڑھنا مستحب ہے شرط نہیں"

یاد رہے: اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ یہ مذکورہ دُعا بھی پڑھی جائے اور اس کے بعد وہ دُعائیں بھی پڑھی جائیں جو اسی معنیٰ کی قرآن مجید اور حدیث نبوی میں موجود ہیں۔ مختلف دُعائیں مانگنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمہم اللہ سے ثابت ہیں جیسا کہ سیّدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ جب رمضان المبارک میں تراویح پڑھاتے تو ہنگامی حالات کے پیش نظر مخالفین اسلام کے لیے بد دُعا کرتے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور مُسلمانوں کے لیے استغفار کرتے تھے۔ امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ کی صحیح ابنِ خزیمہ ۱۵۵/۲-۱۵۶ کے حوالہ سے علامہ البانی حفظہ اللہ نے قیام رمضان ۳۲/ پر لکھا ہے کہ:

((وَكَانَ يَلْعَنُ الْكَفَرَةَ فِي النِّصْفِ اَللّٰهُمَّ قَاتِلِ الْكَفَرَةَ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِكَ وَيُكَذِّبُونَ رُسُلَكَ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِوَعْدِكَ وَخَالِفْ بَيْنَ كَلِمَتِهِمْ وَاَلْقِ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ وَاَلْقِ عَلَيْهِمْ رِجْزَكَ وَعَذَابَكَ اِلٰهَ الْحَقِّ" ثُمَّ يُصَلِّي عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ وَ يَدْعُوْ لِلْمُسْلِمِيْنَ بِمَا اسْتَطَاعَ مِنْ خَيْرٍ ثُمَّ يَسْتَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ))

"نصف رمضان میں کافروں پر لعنت کرتے اور کہتے اے اللہ ان کافروں کو جو تیرے راستے سے روکتے ہیں اور تیرے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں اور تیرے وعدوں پر ایمان نہیں لاتے تباہ کر دے اور ان کے کلمات میں مخالفت ڈال دے اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دے اور ان پر عذاب و سزا ڈال دے"

پھر نبی کریم ﷺ پر درود پڑھتے اور مسلمانوں کے لیے اپنی استطاعت سے بھلائی کی دعا کرتے اور مومنوں کے لیے استغفار کرتے۔

چند دعائیں قرآن و حدیث سے درج کی جاتی ہیں :

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْلَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَاَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِهِمْ وَانْصُرْهُمْ عَلٰى عَدُوِّكَ

وَعَدُوِّهِمْ اَللّٰهُمَّ الْعَنْ كَفَرَةَ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ رُسُلَكَ وَيُقَاتِلُوْنَ اَوْلِيَاءَكَ اَللّٰهُمَّ خَالِفْ بَيْنَ كَلِمَتِهِمْ وَزَلْزِلْ اَقْدَامَهُمْ وَاَنْزِلْ بِهِمْ بَاْسَكَ الَّذِيْ لَا تَرُدُّهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُثْنِيْ عَلَيْكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْكَ نَسْتَعِيْنُ وَنَعْبُدُ وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخَافُ عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ۔

(مصنف عبدالرزاق (۴۹۲۹) ۳/ ۱۱۱ مصنف ابن ابی شیبہ ۲/ ۲۱۴۔ ۳۱۵)

اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهٖ جَنَّتَكَ وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَيْنَا مُصِيْبَاتِ الدُّنْيَا وَمَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا، وَلَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّا يَرْحَمُنَا

(الترمذی (۳۴۷۹)

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ عَضُدِيْ وَاَنْتَ نَصِيْرِيْ وَبِكَ اُقَاتِلُ

(ترمذی (۳۸۳۶) صحیح ابوداؤد (۲۳۶۶)

اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَوْعَاتِنَا (رواہ احمد مشکوۃ ص ۲۱۴)

نوٹ: ائمہ مساجد اور قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ کافروں سے برسرپیکار دُنیا بھر کے مجاہدین کی نصرت و کامیابی اور ان کے مصائب میں کمی کے لیے اپنی نمازوں میں قنوتِ نازلہ کا اہتمام کریں جو لوگ جہاد میں شریک نہیں، مجاہدین کی

یہ اعانت ان پر فرض ہے۔(مجلّۃ الدعوۃ' دسمبر/ ۱۹۹۳ء)

قنوتِ نازلہ شریعت اسلامیہ اور فقہ حنفیہ کی نظر میں

س اہل حدیث حضرات کے ہاں قنوتِ نازلہ کی جاتی ہے۔ جہری نمازوں کے ساتھ ساتھ سری نمازوں میں بھی۔ اس پر تفصیلاً اور دلائل کے ساتھ بحث فرمائیں؟ کیا یہ طریقہ رسول اللہ سے ثابت ہے اور آپ ﷺ نے یہ قنوت کیوں کی اور کیسے کی؟ کیا آپؐ نے ہمیشہ اس پر عمل کیا؟ آپؐ کی رحلت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر عمل پیرا تھے؟ اس کا طریقہ کار کیا ہے۔ اگر ثابت ہے تو احناف کیوں نہیں کرتے؟ (محمد اختر ظہور' حیات کالونی بھلوال سرگودھا)

ج جب مُسلمان کسی مصیبت میں گرفتار ہوں' دُنیا کے کسی خطے میں مسلمانوں پر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ ظلم و ستم ڈھا رہے ہوں' شب و روز انہیں پریشانیوں سے دوچار کر رہے ہوں' انہیں قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر رہے ہوں تو ان حالات میں جہاں ان مُسلمانوں کے لیے دیگر مادی اسباب کے تحت مدد کی جاتی ہے' اسی طرح ان کے لیے جور و ستم اور ظلم و تشدد سے بچاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا قنوتِ نازلہ ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کی سُنت ہے۔ آپؐ کبھی صُبح کی نماز میں' ظہر اور عشاء میں اور کبھی پانچوں نمازوں میں' اپنے مومن ساتھیوں کے لیے بڑے عجز و انکساری' اور خشوع و خضوع کے ساتھ رکوع کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا فرماتے تھے۔ یہی عمل آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' فقہاء' محدثین' تابعین' تبع تابعین اور سلف صالحین رحمہم اللہ کرتے رہے۔ اسی مسئلہ کے متعلق چند ایک احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ایک دفعہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے تلامذہ کو نماز پڑھ کر دکھائی اور فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنِّیْ لَاَقْرَبُکُمْ شَبَھًا بِصَلَاۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنْ کَانَتْ ھٰذِہٖ لَصَلَاتَہٗ حَتّٰی فَارَقَ الدُّنْیَا قَالَا وَقَالَ اَبُوْھُرَیْرَۃَ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ یَرْفَعُ رَأْسَہٗ یَقُوْلُ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ یَدْعُوْ لِلرِّجَالِ فَیُسَمِّیْھِمْ بِاَسْمَائِھِمْ فَیَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اَنْجِ الْوَلِیْدَ بْنَ الْوَلِیْدِ وَسَلَمَۃَ بْنَ ھِشَامٍ وَ عَیَّاشَ بْنَ اَبِیْ رَبِیْعَۃَ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَللّٰھُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَکَ عَلٰی مُضَرَ وَاجْعَلْھَا عَلَیْھِمْ سِنِیْنَ کَسِنِیْ یُوْسُفَ)) (صحیح بخاری ۱/۱۱۰)

"اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یقیناً میں تم سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کے ساتھ مشابہ ہوں۔ آپ کی یہ نماز دُنیا چھوڑنے تک اسی طرح رہی۔ سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے دونوں شاگرد ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث اور ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے سر اُٹھاتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ ربنا ولک الحمد کہتے تو آدمیوں کے نام لے کر ان کے لیے دُعا کرتے۔ آپ کہتے اے اللہ ولید بن ولید' سلمہ بن ہشام اور عیاش بن ابی ربیعہ اور کمزور مسلمانوں کو نجات دے دے اور کفار پر اپنی پکڑ سخت کر دے اور ان پر اس طرح قحط سالی فرما جیسے تو نے یوسف علیہ السلام کے دور میں کی تھی"۔

۲) ((عَنْ عَاصِمٍ قَالَ سَاَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِکٍ عَنِ الْقُنُوْتِ فَقَالَ قَدْ کَانَ الْقُنُوْتُ قُلْتُ : قَبْلَ الرُّکُوْعِ اَوْ بَعْدَہٗ قَالَ : قَبْلَہٗ قَالَ فَاِنَّ فُلَانًا اَخْبَرَنِیْ عَنْکَ اَنَّکَ قُلْتَ بَعْدَ الرُّکُوْعِ فَقَالَ کَذَبَ' اِنَّمَا قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الرُّکُوْعِ شَھْرًا' أُرَاہُ کَانَ بَعَثَ قَوْمًا یُقَالُ لَھُمُ الْقُرَّاءُ زُھَاءَ سَبْعِیْنَ رَجُلًا اِلٰی قَوْمٍ مُشْرِکِیْنَ دُوْنَ اُولٰٓئِکَ وَکَانَ بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَهْدٌ فَقَنَتَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَهْرًا يَدْعُوْ عَلَيْهِمْ.)) (بخاری ۱/۱۳۶ مسلم ۱/۲۳۷)

"عاصم احول رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے قنوت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا! قنوت تو تھی۔ میں نے کہا کیا رکوع سے پہلے یا بعد میں؟ آپ نے کہا پہلے میں نے کہاں فلاں شخص نے مجھے آپ کی جانب سے خبر دی ہے کہ آپ نے فرمایا رکوع کے بعد ہے۔ آپ نے فرمایا اُس نے غلط کہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کے بعد (صرف) ایک مہینہ قنوت پڑھی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے ستر کے قریب افراد کی ایک جماعت جنہیں قراء کہا جاتا تھا مشرکین کی طرف بھیجا تھا۔ یہ مشرکین ان کے علاوہ تھے جن کے لیے آپ نے بددعا کی تھی ان کے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ تھا پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینے تک (رکوع کے بعد) قنوت کی آپ ان مشرکین کے لیے بددعا کرتے رہے"۔

(۳) صحیح مسلم ۱/۲۳۷ میں یہ بھی ہے کہ آپ ولید بن ولید وغیرہ کے واپس آنے تک دعا کرتے رہے۔

(۴) سیدنا ابو ہریرہ نے فرمایا:

((لَاُقَرِّبَنَّ صَلٰوةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اَبُوْهُرَيْرَةَ يَقْنُتُ فِي الرَّكْعَةِ الْاٰخِرَةِ مِنْ صَلٰوةِ الظُّهْرِ وَصَلَاةِ الْعِشَاءِ وَصَلَاةِ الصُّبْحِ بَعْدَ مَا يَقُوْلُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَيَدْعُوْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَلْعَنُ الْكُفَّارَ.)) بخاری ۱/۱۳۶ مسلم ۱/۲۳۷ وَاللّٰهِ لَاُقَرِّبَنَّ بِكُمْ صَلَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہے۔ (ابوداؤد ۲/۶۷ (۱۴۴۰)

اللہ کی قسم میں تمہارے قریب وہ نماز ادا کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہے۔ سو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نماز ظہر، نماز عشاء، اور فجر میں رکوع کے بعد قنوت کرتے اور مومنین کے لیے دعا اور کفار کے لیے لعنت کرتے۔

(۵) ((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَنَتَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَهْرًا مُتَتَابِعًا فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ وَصَلَاةِ الصُّبْحِ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ إِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ مِنَ الرَّكْعَةِ الْاٰخِيرَةِ يَدْعُوْ عَلٰى اَحْيَاءٍ مِنْ بَنِيْ سُلَيْمٍ عَلٰى رِعْلٍ وَّ ذَكْوَانَ وَعُصَيَّةَ وَيُؤَمِّنُ مَنْ خَلْفَهُ)) (ابوداود ۶۸/۲ (۱۴۴۳))۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہینہ مسلسل ظہر، عصر، مغرب عشاء اور فجر کی نمازوں میں سے ہر نماز میں جب آخری رکعت میں سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو قنوت کرتے۔ بنو سلیم کے چند قبائل رعل، ذکوان اور عصیہ پر بددُعا کرتے رہے اور آپ کے پیچھے مقتدی آمین کہتے۔

(۶) صحیح بخاری ۶۵۵/۲ میں یہ الفاظ بھی ہیں: ((إِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ اَللّٰهُمَّ اَنْجِ الْوَلِيْدَ بْنَ الْوَلِيْدِ ...... يَجْهَرُ بِذٰلِكَ)) جب آپ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہتے تو دُعا کرتے اے اللہ ولید بن ولید وغیرہ کو نجات دے اور یہ دُعا اونچی کرتے۔

(۷) سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ((فَلَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي صَلَاةِ الْغَدَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ فَدَعَا عَلَيْهِمْ.)) مسند احمد ۱۳۷/۳ اور بیہقی ۲۱۱/۲ میں ہے ((كُلَّمَا صَلَّى الْغَدَاةَ رَفَعَ يَدَيْهِ يَدْعُوْ عَلَيْهِمْ.))

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح کی نماز میں دیکھا، آپ نے ہاتھ اُٹھائے اور ان (کفار) پر بددُعا کی۔

مندرجہ بالا احادیث سے درج ذیل امور حاصل ہوئے:

۱) جب بھی مسلمانوں پر مصائب و آلام، کفر کا جور و ستم اور ظلم و تشدد ہو تو اس وقت فرض نمازوں میں دُعا کرنا جسے قنوتِ نازلہ کہتے ہیں، مشروع و جائز ہے۔

۲) یہ دُعا مختلف حالات کے مطابق کبھی ایک نماز میں، کبھی دو تین نمازوں میں اور کبھی پانچوں نمازوں میں کی جاتی ہے کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف

نمازوں میں یہ دُعا کی ہے۔

۳) اس دُعا کا مقصد مسلمانوں کے لیے مصائب سے نجات اور کفار کے لیے عذابِ الٰہی کا مطالبہ ہوتا ہے۔

۴) یہ دُعا اگر اپنے ان ساتھیوں کے لیے کی جائے جو کفار کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں یا کسی مصیبت میں گرفتار ہیں تو ان کے نام لے کے بھی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح کفار کے قبائل کے نام لے کے بھی بددُعا کی جا سکتی ہے۔

۵) اس دُعا کے لیے ضروری نہیں کہ ہمیشہ ہی کی جائے بلکہ مطلوبہ مصیبت کی دوری کے بعد ترک کر دی جائے۔ یہ دُعا آپ نے اپنے ساتھیوں کی رہائی تک کی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرکز والے اِن دنوں مسلسل قنوت کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے نبی ﷺ نے تو قنوت چھوڑ دی تھی۔ تو گزارش یہ ہے کہ ہم بھی رسول اللہ ﷺ کی طرح اس وقت تک دُعا کرتے رہیں گے۔ جب تک ہمارے ساتھی جو کشمیر میں ہندو کی جیل میں ہیں رہائی نہیں پاتے۔ جب رہائی پا لیں گے تو ترک کر دیں گے۔

۶) دُعا کے لیے کوئی خاص الفاظ متعین نہیں۔ ہر وہ دُعا کی جا سکتی ہے جو مطلوب ہو۔ امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں: وَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ لَا يَتَعَيَّنُ فِيْهِ دُعَاءٌ مَخْصُوْصٌ بَلْ يُحْصَلُ بِكُلِّ دُعَاءٍ فِيْهِ وَجْهٌ اَنَّهٗ لَا يُحْصَلُ اِلَّا بِالدُّعَاءِ (شرح مسلم للنوی ۱/۲۳۷)

"صحیح بات یہ ہے کہ اس بارے کوئی مخصوص دُعا نہیں بلکہ ہر اس دُعا کو پڑھا جا سکتا ہے جس سے یہ مقصود حاصل ہوتا ہو۔ البتہ بہتر اور اولیٰ یہی ہے کہ جو دُعائیں قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں موجود ہیں وہ پڑھے۔ علاوہ ازیں اپنی اپنی حاجات کے لیے مختلف ادعیہ کی جا سکتی ہیں"۔

امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ اپنی صحیح میں یہ بات لائے ہیں:

وَكَانَ يَلْعَنُ الْكَفَرَةَ فِي النِّصْفِ اَللّٰهُمَّ قَاتِلِ الْكَفَرَةَ الَّذِيْنَ

يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِكَ وَيُكَذِّبُوْنَ رُسُلَكَ وَلاَ يُؤْمِنُوْنَ بِوَعْدِكَ وَخَالِفْ بَيْنَ كَلِمَتِهِمْ وَاَلْقِ فِي قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ وَاَلْقِ عَلَيْهِمْ رِجْزَكَ وَعَذَابَكَ اِلٰهَ الْحَقِّ ثُمَّ يُصَلِّيْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَدْعُوْ لِلْمُسْلِمِيْنَ بِمَا اسْتَطَاعَ مِنْ خَيْرٍ ثُمَّ يَسْتَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (ابنِ خزیمہ ۲/۱۵۵٬۱۵۶ (۱۱۰۰)

"سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جب رمضان المبارک میں تراویح پڑھاتے تو ہنگامی حالات کے پیشِ نظر کفار و مشرکین کے لیے بددعا کرتے۔ نصف رمضان میں کفار پر لعنت کرتے اور کہتے' اے اللہ ان کافروں کو جو تیرے راستے سے روکتے ہیں' تیرے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں اور تیرے وعدے پر ایمان نہیں لاتے' برباد کر دے اور ان کی باتوں میں مخالفت ڈال دے اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دے اور ان پر اپنا عذاب و عتاب مسلط کر دے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے اور مسلمانوں کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق بھلائی کی دعا کرتے۔ پھر مومنوں کے لیے استغفار کرتے"

۷) قنوتِ نازلہ رکوع کے بعد ہاتھ اٹھا کر کی جاتی ہے۔

۸) آپ قنوت جہراً پڑھتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پیچھے آمین کہتے۔

لہٰذا اہل حدیث حضرات کا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سُنت پر عمل ہے۔ اس کے مطابق موجودہ زمانے میں وہ مسلمان جو کشمیر' بوسنیا' فلپائن' اریٹیریا' الجزائر وغیرہ ممالک میں یہود و نصاریٰ' ہنود و اسرائیل کے ظلم و استبداد میں پس رہے ہیں۔ جہاں ان کی جانی و مالی امداد کرتے ہیں وہاں ساتھ ہی اپنی نمازوں میں ان کی نصرت و مدد کے لیے اللہ کے حضور دعاگو ہوتے ہیں۔

علماء احناف میں سے جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ صبح کی نماز میں قنوتِ نازلہ کا پڑھنا درست ہے۔ موجودہ زمانے کے مشہور حنفی عالم صوفی عبدالحمید سواتی اپنی کتاب "نماز مسنون کلاں" کے صفحہ ۶۵۱ پر رقم طراز ہیں:

"جمہور فقہاء احناف کہتے ہیں کہ صبح کی نماز میں قنوتِ نازلہ پڑھنا درست ہے۔
چاہے التزام کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو اور جتنی احادیث اس بارے میں وارد ہوئی ہیں' ان کا صحیح محل یہی ہے۔ مزید ص ۲۵۲ پر لکھتے ہیں "صبح کی نماز میں جب امام قنوت بالجہر پڑھ رہا ہو تو مقتدی کو اختیار ہے کہ وہ بھی قنوت پڑھے یا آمین کہے یا خاموش رہے"۔ (کبیری ص ۴۳۳) پھر اسی صفحہ پر اپنے استاد حسین احمد مدنی کا عمل نقل کیا ہے اور وزیرستان و فلسطین کے مُسلمانوں کے لیے دُعا ذکر کی ہے۔
لہٰذا ہمارے حنفی بھائیوں کو بھی چاہیے کہ وہ موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسئلہ جہاد کو سمجھیں اور عقائد کی تطہیر کے ساتھ اپنی نمازوں میں مظلوم و مقہور مُسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے قنوتِ نازلہ کریں تاکہ اللہ تعالیٰ ہم سب مُسلمانوں کو عزت کی زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے اعمال کی اصلاح کرے۔ (مجلۃ الدعوۃ' نومبر/ ۱۹۹۵ء)

دُعائے قنوت' رکوع سے پہلے یا بعد؟

س دُعائے قنوتِ وتر میں رکوع سے پہلے مانگنی چاہیے یا بعد میں۔ بخاری شریف میں سیدنا انس سے مروی ہے کہ رکوع کے بعد قنوت کرنا غلط ہے کیا یہ درست ہے۔ قرآن و سُنت کی رُو سے صحیح مسئلہ کی وضاحت کریں۔

ج رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے وتر میں دُعا قنوت رکوع سے قبل ثابت ہے اور اکثر روایات رکوع سے قبل ہی قنوتِ وتر پر دلالت کرتی ہیں۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

۱) ((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُوْتِرُ فَيَقْنُتُ قَبْلَ الرُّكُوْعِ))

"رسول اللہ ﷺ (تین) وتر ادا کرتے تو دُعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھتے۔
(سنن ابنِ ماجہ (۱۱۸۲) ۱/۳۷۴' نسائی ۳/۲۳۵' دار قطنی ۲/۳۱)

یہ روایت بطریق سفیان از زبید الیامی مروی ہے اس کے علاوہ دار قطنی ۲/۳۱

اور بیہقی ۳/۴۰ میں بطریق فطر بن خلیفہ از زبیدی مروی ہے اور مسعر بن کدام از زبید بیہقی ۳/۴۰ پر مروی ہے ان دونوں نے بھی زبید سے یہ روایت بیان کرتے ہوئے دُعائے قنوت قبل از رکوع ہی بیان کیا ہے۔

۲) سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَقُوْلَ اِذَا فَرَغْتُ مِنْ قِرَاءَتِیْ فِی الْوِتْرِ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ.)) (الحدیث)

"یعنی مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات وتر میں قرأت سے فارغ ہونے کے بعد پڑھنے کے لیے سکھائے" (کتاب التوحید لابن مندہ ۲/۹۱، ارواء الغلیل ۲/۱۶۸)

یہ روایت اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ وتر میں دُعائے قنوت قرأت سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے کرنی چاہیے۔

۳) علقمہ سے روایت ہے:

((اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ وَاَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا يَقْنُتُوْنَ فِی الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ.))

"کہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتر میں رکوع سے قبل قنوت پڑھا کرتے تھے۔"

علامہ ابنِ ترکمانی نے الجوہر النقی میں اور علامہ البانی حفظہ اللہ نے ارواء الغلیل میں اس کی سند کو مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے لہٰذا صحابہ کے عمل سے بھی وتر میں قنوت رکوع سے قبل ہی ثابت ہوئی۔ امام ابنِ ابی شیبہ آثار صحابہ کے بعد فرماتے ہیں ھٰذَا الْقَوْلُ عِنْدَنَا ہمارا قول یہی ہے۔ (مصنف ابنِ ابی شیبہ ۲/۳۰۶)

۴) عاصم کہتے ہیں میں نے اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قنوت کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا رکوع سے پہلے ہے پھر میں نے کہا فلاں شخص آپ کے حوالہ سے بیان کرتا ہے کہ رکوع کے بعد ہے۔ تو اَنس رضی اللہ عنہ نے کہا وہ غلط کہتا ہے نبی اکرم ﷺ نے رکوع کے بعد صرف ایک ماہ قنوت کیا۔ یہ اس وقت ہوا جب آپ نے ۷۰

قراء صحابہ کو مشرکوں کی ایک قوم (بنی عامر) کی طرف تعلیم دینے کے لیے بھیجا تھا ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان وعدہ تھا (انہوں نے وعدہ شکنی کرتے ہوئے ان قراء کو شہید کر ڈالا) تو آپ نے ایک مہینہ تک رکوع کے بعد قنوت کیا اور ان پر بددُعا فرمائی۔ (بخاری ۱/ ۱۳۶، ص ۱۹۷ مطبوعہ مکتبہ دارالسلام)

اس روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جو دُعا ہنگامی حالات میں مسلمانوں کی خیر خواہی، کفار و مشرکین اور دُشمنانِ اسلام کے لیے بدعا کے طور پر کی جاتی ہے وہ رکوع کے بعد ہے جسے قنوتِ نازلہ کہا جاتا ہے اور جو دُعا رکوع سے قبل مانگی جاتی ہے وہ قنوتِ وتر ہے اور قنوتِ وتر میں ہاتھوں کا اُٹھانا نبی اکرم ﷺ کی کسی صحیح حدیث میں ثابت نہیں۔ رکوع سے قبل قرأت سے فارغ ہونے کے بعد اسی طرح بغیر ہاتھ اُٹھائے دُعا مانگنی چاہیے جو لوگ قنوتِ وتر میں ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرتے ہیں وہ اسے قنوتِ نازلہ پر قیاس کرتے ہیں۔ (مجلّۃ الدعوۃ، اپریل/ ۱۹۹۳ء)

قنوتِ نازلہ میں ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا

س کیا قنوتِ نازلہ میں ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے اکثر اہلحدیث مساجد میں دیکھا گیا ہے کہ لوگ رکوع کے بعد ہاتھ اُٹھا کر عام نمازوں میں دُعا مانگتے ہیں۔ اس کی وضاحت مطلوب ہے۔

ج مصیبت اور رنج و الم کی شدت اور ضعف کے وقت آپ نے کبھی بعض نمازوں میں اور کبھی پانچوں نمازوں میں رکوع کے بعد قنوت کیا جس کو قنوتِ نازلہ کہتے ہیں۔ اس میں آپ رکوع کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگتے تھے۔ اور سیدنا اَنس رضی اللہ عنہ سے مسند احمد ۳/ ۱۳۷ پر جو روایت قنوتِ نازلہ کے متعلق مروی ہے اس میں آتا ہے کہ:

((فَلَقَدْ رَاَیْتُ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی صَلَاۃِ الْغَدَاۃِ رَفَعَ یَدَیْہِ فَدَعَا عَلَیْہِمْ))

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو صبح کی نماز میں دیکھا کہ آپ نے ہاتھ اُٹھائے اور دُشمنانِ اسلام پر بددُعا کی"

یہ حدیث صحیح ہے علامہ البانی نے اس کو ارواء الغلیل میں مسند احمد کے علاوہ طبرانی کے حوالہ سے بھی بیان کیا ہے۔ یاد رہے کہ دُعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے متعلق کوئی صحیح حدیث موجود نہیں اس بارے میں جتنی روایات مروی ہیں وہ سب کی سب ضعیف ہیں جو قابل حجت نہیں۔ امام بیہقی نے السنن الصغریٰ میں لکھا ہے کہ فَاِنَّھَا مِنَ الْمُحْدَثَاتِ یہ بدعات میں سے ایک بدعت ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۳ء)

عورت اور مرد کی نماز میں کوئی فرق نہیں

س قرآن و سنت کی روشنی میں عورت کی نماز کے بارے میں بتائیں کیونکہ عموماً کہا جاتا ہے کہ عورت کی نماز مرد کی نماز سے مختلف ہے۔ مثلاً عورت کو مرد کی طرح سجدہ نہیں کرنا چاہیے وغیرہ؟

(بنت سیف اللہ' ملتان و ابوحامد فضل کریم راولپنڈی)

ج نبی کریم ﷺ نے جو نماز کی کیفیت و ہیئت بیان فرمائی ہے اس کی ادائیگی میں مرد و عورت برابر ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) "تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو"۔

(بخاری مع فتح الباری ۲/۱۱۱' مسند احمد ۵/۵۲' ارواء الغلیل حدیث نمبر ۲۱۳)

یاد رکھیں کہ تکبیر تحریمہ سے سلام تک مردوں اور عورتوں کی نماز کی ہیئت ایک جیسی ہے سب کے لیے تکبیر تحریمہ' قیام' ہاتھوں کا باندھنا' دُعائے استفتاح پڑھنا' سورۂ فاتحہ' آمین' اس کے بعد کوئی اور سورت' پھر رفع الیدین رکوع' قیام ثانی' رفع یدین' سجدہ' جلسۂ استراحت' قعدہ اولیٰ' تشہد' تحریک اصابع' قعدہ اخیرہ' تورک' درود پاک اور اس کے بعد دُعا' سلام اور ہر مقام پر پڑھی جانے والی مخصوص دُعائیں سب ایک جیسی ہی ہیں عام طور پر حنفی علماء کی کتابوں میں جو مردوں اور عورتوں کی نماز کا

فرق بیان کیا جاتا ہے کہ مَرد کانوں تک ہاتھ اُٹھائیں اور عورتیں صرف کندھوں تک' مَرد حالت قیام میں زیر ناف ہاتھ باندھیں اور عورتیں سینہ پر' حالتِ سجدہ میں مَرد اپنی رانیں پیٹ سے دُور رکھیں اور عورتیں اپنی رانیں پیٹ سے چپکا لیں یہ کسی بھی صحیح و صریح حدیث میں مذکور نہیں۔ چنانچہ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

((وَاعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ السُّنَّةَ تَشْتَرِكُ فِيْهَا الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ وَلَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنَهُمَا فِيْهَا وَكَذَا لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْاَةِ فِيْ مِقْدَارِ الرَّفْعِ رُوِيَ عَنِ الْحَنَفِيَّةِ اَنَّ الرَّجُلَ يَرْفَعُ اِلَى الْاُذُنَيْنِ وَالْمَرْاَةُ اِلَى الْمَنْكِبَيْنِ لِاَنَّهُ اَسْتَرُلَهَا وَلَا دَلِيْلَ عَلٰى ذٰلِكَ كَمَا عَرَفْتَ.))

۱) "اور جان لیجئے کہ یہ رفع یدین ایسی سنت ہے جس میں مَرد اور عورتیں دونوں شریک ہیں اور ایسی کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی جو ان دونوں کے درمیان اس کے بارے میں فرق پر دلالت کرتی ہو۔ اور نہ ہی کوئی ایسی حدیث وارد ہے جو مَرد اور عورت کے درمیان ہاتھ اُٹھانے کی مقدار پر دلالت کرتی ہو اور احناف سے مروی ہے کہ مَرد کانوں تک ہاتھ اُٹھائے اور عورت کندھوں تک کیونکہ یہ اس کے لیے زیادہ ساتر ہے لیکن اس کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل شرعی موجود نہیں۔"

(نیل الاوطار ۱۹۸/۲)

شارح بخاری امام حافظ ابنِ حجر عسقلانی اور علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہما اللہ فرماتے ہیں :

"لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى التَّفْرِقَةِ فِي الرَّفْعِ بَيْنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْاَةِ۔"

"مَرد اور عورت کے درمیان تکبیر کے لیے ہاتھ اُٹھانے کے فرق کے بارے کوئی حدیث وارد نہیں۔" (فتح الباری ۲۲۲/۲' عون المعبود ۲۶۳/۱)

۲) مَردوں اور عورتوں کے حالت قیام میں یکساں طور پر حکم ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو سینے پر باندھیں خاص طور پر عورتوں کے لیے علیحدہ حکم دینا کہ وہ ہی صرف

سینے پر ہاتھ باندھیں اور مرد ناف کے نیچے باندھیں اس کے لیے حنفیوں کے پاس کوئی صریح و صحیح حدیث موجود نہیں۔ علامہ عبدالرحمن مبارکپوری ترمذی کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

"فَاعْلَمْ اَنَّ مَذْهَبَ الْاِمَامِ اَبِی حَنِیْفَةَ اَنَّ الرَّجُلَ یَضَعُ الْیَدَیْنِ فِی الصَّلٰوةِ تَحْتَ السُّرَّةِ وَالْمَرْاَةُ تَضَعُهُمَا عَلَی الصَّدْرِ وَلَمْ یُرْوَ عَنْهُ وَلَا عَنْ اَصْحَابِهٖ شَیْءٌ خِلَافَ ذٰلِكَ۔"

"پس جان لو کہ امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ مرد نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھے اور عورت سینہ پر امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب سے اس کے خلاف کوئی اور قول مروی نہیں ہے۔" (تحفہ الاحوذی ۱/۲۱۳)

محدث عصر علامہ البانی حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَضْعُهُمَا عَلَی الصَّدْرِ الَّذِیْ ثَبَتَ فِی السُّنَّةِ وَخِلَافُهٗ اِمَّا ضَعِیْفٌ اَوْ لَا اَصْلَ لَهٗ۔"

"اور سینہ پر ہاتھ باندھنا سنت سے ثابت ہے اور اس کے خلاف جو عمل ہے وہ یا تو ضعیف ہے یا پھر بے اصل ہے" (صفۃ صلاۃ النبی ﷺ/۸۸)

۳) حالتِ سجدہ میں مردوں کا اپنی رانوں کو پیٹ سے دور رکھنا اور عورتوں کا سمٹ کر سجدہ کرنا یہ حنفی علماء کے نزدیک ایک مرسل حدیث کی بنیاد پر ہے جس میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں آپ نے فرمایا جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کا کچھ حصہ زمین سے ملا لیا کرو کیونکہ عورتوں کا حکم اس بارے میں مردوں جیسا نہیں۔ علامہ البانی حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

مُرْسَلٌ لَا حُجَّةَ فِیْهِ رَوَاهُ اَبُوْ دَاوٗدَ فِی "الْمَرَاسِیْلِ"

(عن یزید بن ابی حبیب' صفۃ صلاۃ النبی ﷺ / ۸۹)

"روایت مرسل ہے جو قابل حجت نہیں۔ امام ابوداؤد نے اسے مراسیل میں یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے مگر یہ روایت منقطع ہے اور اس کی سند میں

موجود ایک راوی سالم محدثین کے نزدیک متروک بھی ہے علامہ ابنِ الترکمانی حنفی نے اَلْجَوْهَرُ النَّقِيَّ عَلَى السُّنَنِ الْكُبْرٰى لِلْبَيْهَقِيِّ ۲/ ۲۲۳ پر تفصیل سے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے"۔

۴) اس بارے میں حنفی علماء ایک اور روایت پیش کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں سے چپکا لے اس طرح کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ پردے کا موجب ہو۔ یہ روایت السنن الکبری للبیہقی ۲/ ۲۲۲۔ ۲۲۳ میں موجود ہے لیکن اس روایت کے متعلق خود امام بیہقی نے صراحت کر دی ہے کہ اس جیسی ضعیف روایت سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک اثر یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ:

" اِنَّهٗ كَانَ يَاْمُرُ نِسَاءَهٗ يَتَرَبَّعْنَ فِي الصَّلَاةِ ۔"

(مسائل احمد لابنه عبداللہ / ۷۱)

"وہ اپنی عورتوں کو حکم دیتے کہ وہ نماز میں چار زانوں بیٹھیں"

مگر اس کی سند میں عبداللہ بن عمر العمری ضعیف راوی ہے۔ (تقریب ۱۸۲)

پس معلوم ہوا کہ احناف کے ہاں عورتوں کے سجدہ کرنے کا مروج طریقہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں مگر اس طریقہ کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشاد مروی ہیں چند ایک یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

۱۔ ((لَا يَبْسُطْ اَحَدُكُمْ ذِرَاعَيْهِ انْبِسَاطَ الْكَلْبِ))

"تم میں سے کوئی بھی حالت سجدہ میں اپنے دونوں بازو کتے کی طرح نہ بچھائے"

۲۔ ((اِعْتَدِلُوْا فِي السُّجُوْدِ وَلَا يَفْتَرِشْ اَحَدُكُمْ ذِرَاعَيْهِ افْتِرَاشَ الْكَلْبِ.))

"سجدہ اطمینان سے کرو اور تم میں سے کوئی بھی حالت سجدہ میں اپنے بازو کتے کی طرح نہ بچھائے۔"

غرض نماز کے اندر ایسے کاموں سے روکا گیا ہے جو جانوروں کی طرح کے ہوں۔ امام ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"نبی ﷺ نے نماز میں حیوانات سے مشابہت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ اس طرح بیٹھنا جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے یا لومڑ کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنا یا جنگلی جانوروں کی طرح افتراش یا کتے کی طرح اقعاء یا کوے کی طرح ٹھونگیں مارنا یا سلام کے وقت شریر گھوڑوں کی دُموں کی طرح ہاتھ اُٹھانا یہ سب افعال منع ہیں"۔

(زاد المعاد ۱/۱۱۶)

پس ثابت ہوا کہ سجدہ کا اصل مسنون طریقہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کا اپنا تھا اور کُتب احادیث میں یوں مروی ہے :

((اِذَا سَجَدَ وَضَعَ یَدَیْهِ غَیْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا))

"جب آپ سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھوں کو زمین پر نہ بچھاتے اور نہ ہی اپنے پہلوؤں سے ملاتے تھے۔" (بخاری مع فتح الباری ۲/۳۰۱، سنن ابوداؤد مع عون ۱/۳۳۹، السنن الکبری للبیہقی ۲/۱۱۶، شرح السنہ للبغوی (۵۵۷)

قرآن مجید میں جس مقام پر نماز کا حکم وارد ہوا ہے اس میں سے کسی ایک مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے مَردوں اور عورتوں کے طریقہ نماز میں فرق بیان نہیں فرمایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بھی کسی صحیح حدیث سے ہیئت نماز کا فرق مروی نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہدِ رسالت سے جملہ اُمہات المؤمنین، صحابیات رضی اللہ عنہن اور احادیثِ نبویہ پر عمل کرنے والی خواتین کا طریقہ نماز وہی رہا ہے جو رسول اللہ ﷺ کا ہوتا تھا۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بسند صحیح اُم درداء رضی اللہ عنہا کے متعلق نقل کیا ہے :

((اِنَّهَا كَانَتْ تَجْلِسُ فِي صَلَاتِهَا جِلْسَةَ الرَّجُلِ وَكَانَتْ فَقِيْهَةً))

"وہ نماز میں مَردوں کی طرح بیٹھتی تھیں اور وہ فقیہ تھیں"

(تاریخ صغیر للبخاری ۹۰)

چوتھی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم عام ہے :

((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ)) (بخاری)

"تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔"

اس حکم کے عموم میں عورتیں بھی شامل ہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ سلف صالحین یعنی خلفائے راشدین' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' تابعین' تبع تابعین محدثین اور صلحائے اُمت رحمہم اللہ میں سے کوئی بھی ایسا مرد نہیں جو دلیل کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں اور عورتوں کی نماز میں فرق کیا ہو بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے استاذ امام ابراہیم نخعی سے بسند صحیح مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

((تَفْعَلُ الْمَرْأَةُ فِي الصَّلَاةِ كَمَا يَفْعَلُ الرَّجُلُ.))

"نماز میں عورت بھی بالکل ویسے ہی کرے جیسے مرد کرتا ہے"

(مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۷۵/ ۲)

جن علماء نے عورتوں کا نماز میں تکبیر کے لیے کندھوں تک ہاتھ اٹھانا قیام میں ہاتھ سینہ پر باندھنا اور سجدہ میں زمین کے ساتھ چپک جانا موجب ستر بتایا ہے۔ وہ دراصل قیاس فاسد کی بنا پر ہے کیونکہ جب اس کے متعلق قرآن و سنت خاموش ہیں تو کسی عالم کو یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ وہ اپنی من مانی کر کے از خود دین میں اضافہ کرے۔ البتہ نماز کی کیفیت و ہیئت کے علاوہ چند چیزیں مرد و عورت کی نماز میں مختلف ہیں۔

۱) عورتوں کے لیے اوڑھنی اوپر لے کر نماز پڑھنا حتیٰ کہ اپنی ایڑیوں کو بھی ڈھانکنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر بالغہ عورت کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ.))

"اللہ تعالیٰ کسی بھی بالغہ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کرتا"۔

(ابن ماجہ (۶۵۵) ۱/ ۲۱۵' ابوداؤد (۶۴۱)' مسند احمد ۶/ ۱۵۰' ۲۱۸' ۲۵۹)

لیکن مردوں کے لیے کپڑا ٹخنوں سے اوپر ہونا چاہیے کیونکہ بخاری شریف میں آتا ہے کہ:

((مَا أَسْفَلَ مِنَ الْإِزَارِ مِنَ الْكَعْبَيْنِ فِي النَّارِ.))

"کپڑے کا ٹخنے سے نیچے ہونا باعث آگ ہے"۔

۲) عورت جب عورتوں کی امامت کرائے تو ان کے ساتھ پہلی صف کے وسط میں کھڑی ہو جائے مردوں کی طرح آگے بڑھ کر کھڑی نہ ہو۔ امام ابوبکر ابنِ ابی شیبہ نے مصنف میں اور امام حاکم نے سیدنا عطاء سے بیان کیا ہے کہ:

((عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا كَانَتْ تَؤُمُّ النِّسَاءَ فَتَقُوْمُ مَعَهُنَّ فِي الصَّفِّ.))

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی امامت کراتی تھیں اور ان کے ساتھ صف میں کھڑی ہوتی تھیں"۔

اور اُم سلمہ کی روایت میں آتا ہے کہ:

((أَنَّهَا أَمَّتِ النِّسَاءَ فَقَامَتْ وَسْطَهُنَّ.))

"انہوں نے عورتوں کی امامت کرائی اور ان کے درمیان میں کھڑی ہوئیں"۔

(مزید تفصیل کے لیے عون المعبود ۲/ ۲۱۲ ملاحظہ فرمائیں)

۳) امام جب نماز میں بھول جائے تو اسے متنبہ کرنے کے لیے مرد سُبْحَانَ اللّٰهِ کہے اور عورت تالی بجائے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے:

((اَلتَّسْبِيْحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِيْقُ لِلنِّسَاءِ.))

"مردوں کے لیے سبحان اللہ اور عورتوں کے لیے تالی ہے"

(بخاری ۲/ ۶۰، مسلم ۲/ ۲۷، ابوداؤد (۹۳۹)، ابنِ ماجہ ۱/ ۳۲۹، نسائی ۳/ ۱۱، مسند احمد ۲/ ۲۶۱، ۳۱۷، ۳/ ۳۴۸)

۴) مرد کو نماز کسی صورت میں بھی معاف نہیں لیکن عورت کو حالتِ حیض میں فوت شدہ نماز کی قضا نہیں ہوتی۔ جیسا کہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، دارمی اور مسند احمد میں موجود ہے۔

۵) اسی طرح عورتوں کی سب سے آخری صف ان کی پہلی صف سے بہتر ہوئی ہے۔ مسلم کتاب الصلوٰۃ' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابنِ ماجہ اور مسند احمد ۲/۴۸۵' ۲۴۷' ۳/۳' ۱۶ میں حدیث موجود ہے۔

یہ مسائل اپنی جگہ پر درست اور قطعی ہیں مگر ان میں تمام تصریفات منصوصہ کو مروجہ تفریقات غیر منصوصہ کے لیے ہرگز دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ تفریقات علماء احناف کی خود ساختہ ہیں جن کا قرآن و سنت سے کوئی تعلق نہیں۔

(مجلۃ الدعوۃ' اکتوبر / ۱۹۹۲ء)

عورت اور مَرد کی نماز

س: عورت اور مَرد کی نماز میں کیا فرق ہے عورت کو سجدہ کرتے وقت اپنا پیٹ رانوں سے لگانا چاہیے یا الگ رکھنا چاہیے قرآن و سنت کی رو سے وضاحت کریں۔ (سائلات ناصرہ ناظرہ' رقیہ)

ج: نبی اکرم ﷺ نے نماز کی جو کیفیت بیان فرمائی ہے' اس میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں' آپ ﷺ کا حکم ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) "نماز اس طرح پڑھو جس طرح نماز پڑھتے ہوئے مجھے دیکھتے ہو"۔ (بخاری) مَردوں اور عورتوں سب کے لیے برابر ہے۔ آپ نے نماز کا جو طریقہ بیان فرمایا اس کی ادائیگی میں مَرد و زن کے لیے کوئی فرق بیان نہیں فرمایا عورت کے لیے سجدے کی جو کیفیت حنفی علماء بیان کرتے ہیں' اس کی بنیاد سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی اس روایت پر ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا' عورت جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں سے چپکا لے۔ اس لیے کہ یہ اس کے لیے زیادہ پردے کا موجب ہے۔ یہ روایت سنن کبریٰ بیہقی ۲/۲۲۲' ۲۲۳ میں موجود ہے لیکن امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس روایت کے بارے میں خود صراحت کر دی ہے کہ اس جیسی روایت سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ یعنی یہ روایت اس قدر ضعیف ہے کہ قابل حجت ہی نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ احناف کے پاس اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۴ء)

تین وتر ادا کرنے کی صورتیں

س: تین رکعات ادا کرنے کی کیا صورت ہے۔ کیا دو رکعت وتر پڑھ کر تشہد بیٹھنا درست ہے؟ بعض حنفی کہتے ہیں کہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِتْرُ اللَّيْلِ ثَلٰثٌ كَوِتْرِ النَّهَارِ صَلٰوةُ الْمَغْرِبِ)) (دار قطنی)

"رات کے وقت وتر دن کے وتر یعنی مغرب کی نماز کی طرح ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے" (عبدالجید، گجرات)

ج: تین رکعت ادا کرنے کی احادیث میں دو صورتیں موجود ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ تین وتر اس طرح ادا کیے جائیں کہ دو رکعت ادا کر کے سلام پھیرا جائے اور پھر ایک رکعت علیحدہ پڑھی جائے۔ جیسا کہ صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/۵۵۷ پر ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

((اَنَّ رَجُلاً سَاَلَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَلاَةِ اللَّيْلِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلاَةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى فَاِذَا خَشِيَ اَحَدُكُمُ الصُّبْحَ صَلّٰى رَكْعَةً وَّاحِدَةً تُوْتِرُ لَهٗ مَا قَدْ صَلّٰى۔ وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يُسَلِّمُ بَيْنَ الرَّكْعَةِ وَالرَّكْعَتَيْنِ فِي الْوِتْرِ حَتّٰى يَاْمُرَ بِبَعْضِ حَاجَتِهٖ.))

"ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے رات کی نماز کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا رات کی نماز دو دو رکعتیں ہیں پھر کوئی تم میں سے صبح ہونے سے ڈرے تو وہ ایک رکعت پڑھ لے وہ اس کی ساری نماز کو طاق بنا دے گی"۔

اور اسی سند کے ساتھ نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وتر کی جب تین رکعتیں ادا کرتے تو دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرتے یہاں تک کہ کسی ضرورت سے بات بھی کرتے۔

مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص تین رکعت وتر ادا کرنا چاہے تو وہ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے پھر ایک رکعت علیحدہ ادا کر لے جو اس کی نماز کو وتر کر دے گی یعنی تین رکعت وتر دو سلام کے ساتھ ادا کرے۔

اسی طرح امام طحاوی حنفی نے شرح معانی الآثار ۲۷۹/۱ پر سیدنا سالم رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما شفع اور وتر کے درمیان سلام کے ذریعے فاصلہ کرتے تھے اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ : "اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَفْعَلُ ذٰلِكَ" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

انور شاہ کاشمیری نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث درج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت وتر اس طرح ادا کرتے کہ ((لا کان یتکلم بین الرکعتین والرکعة)) دو اور ایک رکعت کے درمیان کلام کرتے تھے۔ لیکن افسوس کہ اسے قوی قرار مان کر لکھا کہ میں چودہ سال تک اس حدیث کا جواب سوچتا رہا ہوں۔

ملاحظہ ہو العدف الشذی ۲۲۱/۱' معارف السنن ۲۶۴/۴' درسِ ترمذی ۲ / ۲۲۴۔

نماز وتر کی تین رکعت ادا کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے ایک تشہد اور ایک سلام کے ساتھ ادا کیا جائے کیونکہ تشہد ادا کرنے سے نماز مغرب کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے جس سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ :

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُوْتِرُوْا بِثَلَاثٍ تَشَبَّهُوْا بِصَلَاةِ الْمَغْرِبِ))

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین وتر اس طرح ادا نہ کرو کہ وہ مغرب کی نماز سے مشابہ ہوں"۔ (مستدرک حاکم ۳۰۴/۱' بیہقی ۳۱/۳' نصب الرایہ ۸۶/۲' فتح الباری ۵۵۸/۲' نیل الاوطار ۴۱/۳' دارقطنی ۱۷۱/۱' شرح معانی الآثار ۲۹۲/۱)

اگر دوسری رکعت میں تشہد بیٹھا جائے تو یہ مغرب کی نماز سے مشابہت ہوتی ہے جس کی ممانعت مذکورہ بالا حدیث میں موجود ہے۔ اس طرح اس کی تائید میں

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے کہ:

((كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ لَا يَقْعُدُ اِلَّا فِي اٰخِرِهِنَّ.))

"رسول اللہ ﷺ تین وتر پڑھتے اور آخری رکعت کے علاوہ کسی میں بھی تشہد نہیں بیٹھتے تھے"

(تلخيص الحبير ۱۵/۲' فتح الباری ۵۵۸/۲' تلخيص مستدرك للذهبی ۳۰۷/۱)

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت بھی مروی ہے کہ:

((كَانَتْ صَلَاةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً يُوْتِرُ مِنْ ذٰلِكَ بِخَمْسٍ لَا يَجْلِسُ فِي شَيْءٍ مِنْهُنَّ اِلَّا فِي اٰخِرِهِنَّ))

"رسول اللہ ﷺ کی نماز تیرہ رکعتیں ہوتی اور اس میں پانچ وتر اس طرح ادا کرتے کہ آخری رکعت کے علاوہ کسی رکعت میں تشہد نہیں بیٹھتے تھے"

(ترمذی ۳۲۱/۲' ابوداؤد ۸۶/۲' مسلم ۵۰۸/۱)

جب پانچ وتروں کے درمیان تشہد نہیں تو تین وتروں کے درمیان بھی نہیں ہو گا اور سوال میں مذکورہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ضعیف ہے۔ امام دارقطنی نے اپنی سنن میں اس روایت کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ لَمْ يَرْوِهٖ عَنِ الْاَعْمَشِ مَرْفُوْعًا غَيْرُ يَحْيٰى بْنِ زَكَرِيَّا وَهُوَ ضَعِيْفٌ" (دارقطنی ۱۷۳)

امام اعمش سے یحییٰ بن زکریا کے علاوہ اس روایت کو کسی نے مرفوع بیان نہیں کیا اور یحییٰ بن زکریا ضعیف ہے۔

لہٰذا اس ضعیف روایت کو صحیح حدیث کے مقابلے میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۲ء)

فجر کی جماعت کے دوران سنتیں

س: بعض لوگ فجر کی جماعت کے دوران سنتیں پڑھتے رہتے ہیں۔ منع کرنے پر کہتے ہیں کہ فجر کی سنتیں ہر صورت جماعت سے پہلے ادا کرنی چاہئیں۔

قرآن و سنت کے رو سے اس کا کیا حکم ہے؟

ج جب جماعت کھڑی ہو جائے گی اس وقت سوائے فرض نماز کے اور کوئی نماز نہیں ہوتی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((اِذَا أُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلٰوةَ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةُ.))

"جب جماعت کی نماز کھڑی ہو جائے تو اس وقت سوائے فرض نماز کے اور کوئی نماز نہیں ہوتی"

اس حدیث کو مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، احمد بن حنبل اور ابنِ حبان نے بیان کیا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اسے ترجمہ باب میں لائے ہیں۔ امام ابنِ عدی بسند حسن یہ روایت بھی لائے ہیں کہ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ فجر کی سنت بھی؟ تو آپ نے فرمایا جب اقامت کہی جائے تو سنت فجر بھی نہ پڑھی جائے۔ عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ میں یوں مروی ہے کہ :

((دَخَلَ رَجُلُ الْمَسْجِدَ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ فِيْ جَانِبِ الْمَسْجِدِ ثُمَّ دَخَلَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا سَلَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا فُلَانُ بِاَيِّ صَلَاتَيْنِ اِعْتَدَدْتَّ اَبِصَلَاتِكَ وَحْدَكَ اَمْ بِصَلٰوتِكَ مَعَنَا.))

"عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک آدمی مسجد میں اس وقت داخل ہوا جب رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز میں تھے۔ اس آدمی نے دو رکعت (سنت فجر) کی مسجد کے ایک کونے میں ادا کی پھر آپ کے ساتھ جماعت میں شامل ہو گیا جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا اے فلاں ان دو نمازوں میں سے کونسی نماز کو تو نے فرض میں شمار کیا۔ جو نماز تو نے تنہا ادا کی یا ہمارے ساتھ والی۔"

اس حدیث سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جب فجر کی جماعت کھڑی ہو جائے تو اس وقت فجر کی سنت پڑھنا مکروہ و ممنوع ہے اس پر رسول اللہ ﷺ نے سرزنش

فرمائی ہے۔

جب فجر کی جماعت کھڑی ہو جائے اور کسی آدمی نے فجر کی سنتیں ابھی تک نہ پڑھی ہوں تو جماعت سے فارغ ہونے کے بعد ادا کرلے جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے : آپ نے صبح کی فرض نماز کے بعد ایک شخص کو دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا : ((صَلٰوۃُ الصُّبۡحِ رَکۡعَتَیۡنِ رَکۡعَتَیۡنِ)) صبح کی نماز (فرض) کی دو رکعت ہیں۔ دو رکعت ہیں تو اُس نے جواب دیا "اِنِّیۡ لَمۡ اَکُنۡ صَلَّیۡتُ الرَّکۡعَتَیۡنِ اللَّتَیۡنِ قَبۡلَھُمَا فَصَلَّیۡتُھُمَا الۡاٰنَ" میں نے دو رکعتیں سنت جو فرض سے پہلے نہیں پڑھی تھیں ان کو اب پڑھا ہے' فَسَکَتَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ تو اس کا جواب سن کر آپ خاموش ہو گئے۔ (ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ' دارقطنی' ابنِ خزیمہ' مستدرک حاکم' ابنِ حبان' بیہقی)

خاموشی آپ کی رضامندی کی دلیل ہے جسے محدثین کی اصطلاح میں تقریری حدیث کہتے ہیں۔ لہٰذا جب فجر کی جماعت کھڑی ہو اس وقت سنت پڑھنا ممنوع ہے انہیں فرض نماز کے بعد ادا کرلینا چاہیے۔ (مجلۃ الدعوۃ' مارچ / ۱۹۹۲ء)

نمازِ فجر کی جماعت کے دوران سنتیں پڑھنا؟

س اگر فجر کی جماعت کھڑی ہو تو کیا مقتدی دو سنتیں ادا کر سکتا ہے اگر وہ نہیں ادا کر سکتا تو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے فوراً بعد سنتیں پڑھ سکتا ہے؟

ج جب فرض نماز کی جماعت کھڑی ہو جائے تو اس وقت فرض کے علاوہ کوئی نماز ادا نہیں ہوتی۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا :

((اِذَا أُقِیۡمَتِ الصَّلَاۃُ فَلَا صَلٰوۃَ اِلَّا الۡمَکۡتُوۡبَۃُ.))

"جب جماعت کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں ہوتی"۔ (مسلم وغیرہ)

لہٰذا اگر کوئی شخص مسجد میں اس وقت آتا ہے جب فجر کی نماز کھڑی ہو جائے تو

اسے سنتیں ادا نہیں کرنی چاہئیں بلکہ فرض کی جماعت میں شریک ہو جانا چاہیے اور سنتیں بعد میں ادا کرے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک شخص کو فجر کی نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ((اِصَلٰوۃُ الصُّبْحِ رَکْعَتَیْنِ رَکْعَتَیْنِ)) "صبح کی نماز (فرض) دو رکعت ہے۔ دو رکعت ہے تو اُس شخص نے جواب دیا اِنِّیْ لَمْ اَکُنْ صَلَّیْتُ الرَّکْعَتَیْنِ اللَّتَیْنِ قَبْلَهُمَا فَصَلَّیْتُهُمَا الْاٰنَ میں نے دو رکعت جو فرضوں سے پہلے ہوتی ہیں، نہیں پڑھی تھیں۔ ان کو اب پڑھا ہے تو رسول اللہ ﷺ اس پر خاموش ہو گئے۔ (ابن خزیمہ (۱۱۱٦) ابنِ حبان (٦٢٤) بیہقی ۴۸۳/۲، ابنِ ماجہ (۱۱۵۴)، ابوداؤد (۱۲٦۷)، دار قطنی ۳۸۴/۱) اللہ کے رسول ﷺ کا کسی امر پر خاموشی اختیار کرنا آپ کی رضامندی کی دلیل ہے۔ اسے محدثین کی اصطلاح میں تقریری حدیث کہتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرضوں کے بعد سنتیں ادا کرنا درست ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی فجر کی سنتیں رہ جائیں تو فرض ادا کرنے کے بعد انہیں ادا کرے۔ (مجلۃ الدعوۃ، مارچ / ۱۹۹٦ء)

فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنا

س فجر کی سنتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا کسی حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

ج فجر کی سنتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ صحیح بخاری میں امام بخاری نے باب "بَابُ الضَّجْعَةِ عَلَى الشِّقِّ الْاَیْمَنِ بَعْدَ رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ" باندھا ہے۔ یعنی فجر کی دو رکعتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنے کا بیان اور اس کے تحت یہ حدیث درج کی ہے:

((عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ اِضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْاَیْمَنِ.))

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب فجر کی دو رکعتیں پڑھتے تو

دائیں کروٹ لیٹ جاتے تھے۔" (بخاری ۴۹/۲)

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

((قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ رَكْعَتِي الْفَجْرِ فَلْيَضْطَجِعْ عَلٰى يَمِيْنِهٖ.))

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو تم میں سے کوئی فجر کی دو رکعت (سنت) پڑھ لے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان قولی اور فعلی احادیث سے معلوم ہوا کہ فجر کی دو رکعت پڑھ کر دائیں پہلو لیٹنا آپ کا پسندیدہ فعل بھی تھا اور آپ اس کا حکم بھی دیا کرتے تھے" (ترمذی ۸۱/۱، ابوداؤد)

لہٰذا ہر نمازی کے لیے دو رکعت کے بعد دائیں پہلو لیٹنا سنت ہے۔ اس پر عمل کرنا چاہیے۔ آپ کی متروکہ سنتوں میں سے یہ سنت بھی ہے جس پر بہت کم عمل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(مجلۃ الدعوۃ، اپریل / ۱۹۹۴ء)

خطبہ جمعہ کے دوران سنتیں پڑھنا

س جب امام خطبہ دے رہا ہو تو اس وقت جب کوئی مسجد میں آئے تو کیا وہ دو رکعت نماز پڑھے یا خطبہ سننے کے لیے چپ ہو کر بیٹھ جائے؟ ہمارے یہاں ایک حنفی مولوی ہیں وہ کہتے ہیں کہ خطبہ جمعہ کے دوران نماز نہیں ہوتی اس کی کتاب و سنت سے وضاحت کریں۔ (عبداللہ اوکاڑہ)

ج جب امام خطبہ جمعہ دے رہا ہو اور اس وقت اگر کوئی آدمی آئے تو اسے دو رکعت پڑھنے کے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے: سلیک غطفانی مسجد میں آئے اور دو رکعت پڑھنے کے بغیر ہی بیٹھ گئے اس وقت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے آپ نے پوچھا ((أَصَلَّيْتَ رَكْعَتَيْنِ؟)) کیا تو نے دو رکعتیں پڑھ لی ہیں؟ تو اس نے جواب دیا نہیں۔ آپ نے فرمایا: ((قُمْ فَصَلِّ

رَکْعَتَیْنِ)) کھڑا ہو اور دو رکعت ادا کر۔
(بخاری ۱/۱۲۷، مسلم ۲/۵۹۷، ابنِ ماجہ (۱۱۱۴) ابنِ خزیمہ (۱۸۳۵)۔)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ سلیک غطفانی کے ساتھ ہی خاص ہے کسی دوسرے شخص کو دو رکعت ادا کرنے کا حکم نہیں ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے اور سراسر صحیح احادیث کے خلاف ہے اللہ کے رسول ﷺ نے عام حکم بھی دیا ہے کہ:

((إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ وَيَتَجَوَّزْ فِيهِمَا.))

"جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے روز اس وقت آئے جب امام خطبہ دے رہا ہے تو اسے ہلکی سی دو رکعتیں پڑھ لینی چاہئیں" (مسلم ۲/۵۹۷)

صحیحین کی ان ہر دو روایات سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہے کہ خطبہ کے دوران دو رکعت تَحِيَّةُ الْمَسْجِدِ پڑھنا سنت ہے۔ یہ دونوں قوی حدیثیں ہیں۔ کیونکہ پہلی روایت میں ایک شخص کو حکم دیا اور دوسری روایت میں ایک عام تشریعی حکم کے ذریعے امت کے لیے سنت قرار دیا ہے۔ امام بغویؒ فرماتے ہیں:

"وَفِيهِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ مَنْ دَخَلَ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ لَا يَجْلِسُ حَتَّى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ وَهُوَ قَوْلُ كَثِيرٍ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ"

"یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص خطبہ کے دوران آئے وہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے یہی مسلک اکثر اہل علم کا ہے"

(شرح السنہ ۴/۲۶۶) (مجلۃ الدعوۃ اپریل / سنہ ۱۹۹۴ء)

جمعہ کے بعد کی سنتیں

س ہمارے بعض اہلحدیث جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد صرف دو سنتیں پڑھتے ہیں چار ادا نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں یہ مسئلہ کافی دیر سے زیر بحث ہے۔ لہٰذا آپ ہمیں صحیح حقائق سے آگاہ کر کے عند اللہ ماجور ہوں۔ (محمد یوسف کھیالہ شیخاں)

ج کتب حدیث کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے

بعد آپ نے دو رکعتیں بھی ادا کی ہیں اور چار کی بھی اجازت ہے۔ صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيُصَلِّ بَعْدَهَا أَرْبَعًا وَفِي رِوَايَةٍ مَّنْ كَانَ مِنْكُمْ مُصَلِّيًا بَعْدَ الْجُمُعَةِ فَلْيُصَلِّ أَرْبَعًا.))

"اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی جمعہ کی نماز پڑھے تو اس کے بعد چار رکعتیں پڑھے۔"

(ابوداؤد ۱۱۳۱، ترمذی ۵۲۳، نسائی ۱۱۳/۳، ابنِ ماجہ ۱۱۳۲)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جو جمعہ کے بعد نماز پڑھنا چاہے وہ چار رکعت پڑھے۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چار رکعت پڑھنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ بخاری شریف میں کتاب الجمعه باب الصلوة بعد الجمعة و قبلها میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي قَبْلَ الظُّهْرِ رَكْعَتَيْنِ وَبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَبَعْدَ الْمَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ فِي بَيْتِهِ وَبَعْدَ الْعِشَاءِ رَكْعَتَيْنِ وَكَانَ لَا يُصَلِّي بَعْدَ الْجُمُعَةِ حَتّٰى يَنْصَرِفَ فَيُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ.))

"رسول اکرم ﷺ ظہر سے پہلے اور ظہر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے۔ مغرب کے بعد دو رکعتیں گھر میں۔ دو رکعتیں عشاء کے بعد اور جمعہ کے بعد آپ دو رکعتیں گھر میں پڑھتے" (بخاری مع فتح الباری ۴۹۳/۲۔ ۹۳، مسلم ۱۶۹/۶، ابوداؤد ۱۲۵۲، ترمذی ۵۲۲، نسائی ۱۹۹/۲)

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے بعد چار رکعتیں بھی پڑھنا درست ہے اور دو بھی۔ لیکن یاد رہے کہ چار پڑھنا افضل ہے کیونکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث قولی ہے اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث فعلی ہے اور قولی حدیث فعلی

حدیث پر مقدم ہوتی ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ سنت خواہ چار رکعتیں پڑھی جائیں یا دو ان کا مسجد کی نسبت گھر میں پڑھنا زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ حدیث صحیح میں آتا ہے:

((اَفْضَلُ صَلٰوةِ الْمَرْءِ فِيْ بَيْتِهٖ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ.))

"آدمی کا فرض نماز کے علاوہ باقی نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے"

(بخاری ۷۳۱، مسلم ۶/۶۹۔۷۰، ابو عوانہ ۲/۲۹۴، ابوداؤد ۱۴۴۷، ترمذی ۴۵۰)

لہٰذا اس طرح کے معاملات جن میں اختیار ہے فضول بحث و تکرار درست نہیں۔ جو چار پڑھنا چاہے وہ چار پڑھ لے اور جو دو پڑھنا چاہے وہ دو پڑھ لے جائز اور درست ہوگا۔ (مجلۃ الدعوۃ، مئی / ۱۹۹۳ء)

ظہر کی سنتیں

س کیا ظہر کی فرض نماز سے پہلے چار رکعات کی بجائے دو رکعت سنتیں پڑھی جا سکتی ہیں؟ (وضاحت فرمائیں) (ایک سائل)

ج ظہر کی فرض نماز سے پہلے رسول اکرم ﷺ چار رکعات پڑھتے اور کبھی دو رکعت پڑھ لیتے۔ دونوں طرح رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے جیسا کہ صحیح بخاری باب الرکعتان قبل الظهر میں ہے۔

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ حَفِظْتُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرَ رَكْعَاتٍ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا.))

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے دس رکعتیں یاد کی ہیں۔ دو رکعات ظہر سے پہلے اور دو رکعات ظہر کے بعد اور دو رکعتیں مغرب کے بعد گھر میں، اور دو رکعتیں عشاء کے بعد گھر میں اور دو رکعتیں صبح کی نماز سے پہلے" (بخاری ۲/۵۲، مسلم ۷۲۹، ۱/۵۰۴)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَا یَدَعُ اَرْبَعًا قَبْلَ الظُّھْرِ.))

"نبی اکرم ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعتیں نہیں چھوڑتے تھے" (بخاری ۲/۵۲)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورۃ الصدر دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں :

" وَالْاَوْلٰی اَنْ یُّحْمَلَ عَلٰی حَالَیْنِ فَکَانَ تَارَۃً یُّصَلِّی اثْنَتَیْنِ وَتَارَۃً یُّصَلِّیْ اَرْبَعًا وَقِیْلَ ھُوَ مَحْمُوْلٌ عَلٰی اَنَّہٗ کَانَ فِی الْمَسْجِدِ یَقْتَصِرُ عَلٰی رَکْعَتَیْنِ وَفِیْ بَیْتِہٖ یُصَلِّیْ اَرْبَعًا۔"

"بہتر یہ ہے کہ ان احادیث کو دونوں حالتوں پر محمول کیا جائے۔ آپ کبھی ظہر سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے اور کبھی چار رکعات۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی ﷺ گھر میں چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور مسجد میں دو رکعتیں"

(بحوالہ فقہ السنۃ ۱/۱۸۷' نیل الاوطار ۳/۱۸)

سیدنا ابنِ عمر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم نے جیسا دیکھا ویسا بیان کر دیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے گھر میں چار رکعتیں پڑھنے کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

((عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ: کَانَ یُصَلِّی فِیْ بَیْتِیْ قَبْلَ الظُّھْرِ اَرْبَعًا.))

"رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں ظہر سے پہلے چار رکعتیں ادا کرتے تھے"

(مسلم ۷۳۰' ۵۰۴۔ ابوداؤد ۱۲۵۱)

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ظہر کی نماز سے قبل دو رکعتیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔ اگر چار پڑھے تب بھی درست ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۴ء)

نماز میں وسوسہ

❖ س ❖ میں جب نماز ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہوں میرے ذہن میں مختلف قسم کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں اور کئی امور جو مجھے بھولے ہوئے ہوتے ہیں' نماز میں یاد آ جاتے ہیں۔ کیا ان وسوسوں پر اللہ کی طرف سے کوئی پکڑ تو نہیں ہو گی اور

ان کے دور کرنے کا طریقہ شریعت میں اگر کوئی ہے تو بتا دیں۔ جزاکم اللہ خیرًا

ج شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے اور اسے راہِ راست سے ہٹانے کے لیے مختلف اقسام کے وساوس اور خطرات اس کے دل میں پیدا کرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَاتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴾ (النساء : ۱۱۸،۱۱۹)

”اللہ تعالیٰ نے اس (شیطان) پر لعنت کی اور وہ کہنے لگا میں تیرے بندوں میں سے ایک معین حصہ ضرور لوں گا اور انہیں ضرور بہکاؤں گا اور امیدیں دلاؤں گا اور ان کو یہ سکھلاؤں گا کہ جانوروں کے کان چیرا کریں اور انہیں حکم دوں گا کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدل دیں اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنائے وہ کھلے نقصان میں سرتاپا ڈوب گیا۔“

ان آیاتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ شیطان انسان کو ورغلانے کے لیے مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے اور انسان کو مختلف قسم کی آرزوئیں اور تمنائیں دلاتا ہے تاکہ انسان اپنے خالق و مالک اللہ وحدہ لا شریک کے بتلائے ہوئے صراط مستقیم سے اعراض کر بیٹھے۔ نماز ایک اہم ترین عبادت ہے۔ جب انسان نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان انسان کو مختلف اقسام کے وسوسے ڈالتا ہے تاکہ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جائے۔ جب بھی انسان کو حالتِ نماز میں کوئی وسوسہ پیدا ہو تو اسے نماز ترک نہیں کرنی چاہیے بلکہ نماز جاری رکھنی چاہیے۔ انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے وسوسے اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیئے ہیں۔ اتنی دیر تک ان پر کوئی پکڑ اور مواخذہ نہیں جب تک کہ انسان ان وساوس پر عمل پیرا نہیں ہو جاتا یا ان وساوس کو زبان سے ادا نہیں کرتا۔

یعنی ذہن میں برے کلمات وغیرہ پیدا ہوئے اور انسان نے ان کلمات کو اپنی زبان پر جاری کر دیا تو مواخذہ ہو گا ورنہ نہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْ تَتَكَلَّمْ.))

"یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری امت سے وہ چیزیں معاف کر دی ہیں جن کے ذریعے ان کے سینوں میں وسوسہ پیدا ہوتا ہے جب تک ان پر عمل یا کلام نہیں کر لیا جاتا"

(متفق علیہ، مشکوۃ ۲۶/۱ تحقیق الالبانی حفظہ اللہ)

لہٰذا جب نماز کی حالت میں وسوسہ پیدا ہو تو اس کی بنا پر نماز توڑنی نہیں چاہیے بلکہ نماز جاری رکھیں۔ اس پر مواخذہ نہیں ہے بلکہ اس کے دور کرنے کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے کہا:

((قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ حَالَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ صَلَاتِيْ وَبَيْنَ قِرَاءَتِيْ يَلْبِسُهَا عَلَيَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاكَ شَيْطَانٌ يُقَالُ لَهٗ خِنْزَبٌ فَاِذَا اَحْسَسْتَهٗ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْهُ وَاتْفُلْ عَلٰى يَسَارِكَ ثَلَاثًا فَفَعَلْتُ ذَالِكَ فَاَذْهَبَ اللّٰهُ عَنِّيْ.))

"میں نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بے شک شیطان میرے اور میری نماز و قرأت کے درمیان حائل ہو گیا ہے اور وہ مجھ پر قراءت کو خلط ملط کرتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شیطان ہے جس کو خنزب کہا جاتا ہے۔ جب تو اس کو محسوس کرے تو اس سے اللہ کی پناہ پکڑ (یعنی اعوذ باللہ پڑھ) میں نے اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے مجھ سے دور کر دیا" (مسلم، مشکوۃ ۲۹/۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں اگر شیطان وسوسوں میں مبتلا کر دے تو اعوذ باللہ پڑھ کر بائیں جانب تین بار تھوک ڈالیں ان شاء اللہ تعالیٰ وسوسہ دور ہو

جائے گا۔ (مجلۃ الدعوۃ' اگست / ۱۹۹۶ء)

نماز میں وسوسے

س: مجھے نماز ادا کرتے وقت اکثر خیالات اور وسوسے آتے رہتے ہیں۔ کیا نماز کے اندر خیالات اور وسوسوں سے نماز باطل ہو جاتی ہے یا نہیں۔ ان خیالات کو دُور کرنے کا مجھے کوئی وظیفہ بتائیں۔ جزاکم اللّٰہ خیرًا

(ناصر' میانوالی)

ج: نماز کے اندر وسوسے اور خیالات کے آنے سے نماز باطل نہیں ہوتی جیسا کہ بخاری شریف میں باب من صلی بالناس فذکر حاجۃ فتخطاھم میں عقبہ بن الحارث سے مروی ہے انہوں نے کہا :

((صَلَّیْتُ وَرَاءَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِیْنَۃِ الْعَصْرَ فَسَلَّمَ ثُمَّ قَامَ مُسْرِعًا فَتَخَطّٰی رِقَابَ النَّاسِ اِلٰی بَعْضِ حُجَرِ نِسَائِہٖ فَفَزِعَ النَّاسُ مِنْ سُرْعَتِہٖ فَخَرَجَ عَلَیْھِمْ فَرَاٰی اَنَّھُمْ عَجِبُوْا مِنْ سُرْعَتِہٖ فَقَالَ ذَکَرْتُ شَیْئًا مِنْ تِبْرٍ عِنْدِنَا فَکَرِھْتُ اَنْ یَحْبِسَنِیْ فَاَمَرْتُ بِقِسْمَتِہٖ.))

"میں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے مدینہ میں عصر کی نماز ادا کی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے اپنی کسی بیوی کے حجرے کی طرف چلے گئے۔ لوگ آپ کی اس جلدی سے گھبرا گئے۔ جب آپ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی جلدی پر متعجب ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھے یاد آ گیا تھا کہ ہمارے گھر میں سونے کی ایک ڈلی ہے۔ میں نے ناپسند کیا کہ وہ مجھے روک کر رکھے۔ میں نے اس کی تقسیم کا حکم دیا ہے۔ اس حدیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ بھی ہیں" (بخاری ۱/۱۴۰)

((ذَکَرْتُ وَاَنَا فِی الصَّلٰوۃِ.))

"مجھے نماز کی حالت میں یہ بات یاد آئی"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کی حالت میں کسی چیز کی یاد آئے یا کوئی خیال آ جائے تو اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اسی طرح مسند احمد صحیح مسلم میں سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((قَالَ عُثْمَانُ بْنُ اَبِی الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ یَا رَسُولَ اللّٰهِ اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ حَالَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ صَلَاتِیْ وَقِرَاءَتِیْ یَلْبِسُهَا عَلَیَّ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذَاكَ شَیْطَانٌ یُّقَالُ لَهٗ خِنْزَبٌ فَاِذَا اَحْسَسْتَهٗ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْهُ وَاتْفُلْ عَلٰی یَسَارِكَ ثَلَاثًا قَالَ فَفَعَلْتُ ذَالِكَ فَاَذْهَبَ اللّٰهُ عَنِّیْ.))

"سیدنا عثمان بن ابی العاص نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ' شیطان میرے اور میری نماز کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا اس شیطان کا نام خنزب ہے۔ جب اس کا اکسانا محسوس کرو تو (دوران نماز) اعوذ باللہ پڑھو اور دائیں طرف تین مرتبہ تھوکو۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے ایسا ہی کیا اور اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مجھ سے دور کر دیا"

(مشکوٰۃ باب الوسوسة ۲۹/۱' بتحقیق شیخ البانی حفظه الله)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں اپنا لشکر روانہ کرتا ہوں حالانکہ میں نماز میں ہوتا ہوں۔ (نیل الاوطار ۳۸۳/۲)

یعنی بعض اوقات نماز کے دوران میرا خیال لشکر کی تیاری کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے:

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْ تَتَكَلَّمْ.))

"سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت سے وہ خیالات و وساوس جو ان کے سینوں میں پیدا ہوتے ہیں' معاف

کر دیے ہیں۔ جب تک ان خیالات کے ساتھ کلام نہ کرلیں یا انہیں عملی جامہ نہ پہنالیں۔" (متفق علیہ' مشکوٰۃ باب الوسوسۃ ۱/۲۶)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ شیطان نماز کے اندر وسوسے ڈالتا ہے اور جب کسی شخص کو نماز میں کوئی خیال آئے یا وسوسہ پیدا ہو تو وہ اعوذ باللہ پڑھ کر بائیں جانب تین مرتبہ تھوکے۔ اللہ تعالیٰ اس سے یہ وسوسہ دُور کر دے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وسوسہ اور خیال آجانے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ انسان کو حالتِ نماز میں ان خیالات کو دُور کر کے اپنی پوری توجہ نماز کی طرف مبذول کر دینی چاہیے تاکہ پورے انہماک اور دھیان سے نماز ادا کی جائے اور اللہ تعالیٰ سے صحیح طور پر مناجات ہو البتہ جتنا دھیان نماز میں کم ہوتا ہے' اتنا ثواب کم ہو جاتا ہے جیسا کہ ابوداؤد اور نسائی اور ابنِ حبان میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

نماز میں کپڑوں اور بالوں سے کھیلنا

س کیا نماز کے اندر بالوں یا کپڑوں کا سنوارنا درست ہے۔ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ نماز کی حالت میں کبھی اپنے سر کے بالوں کو چھیڑ رہے ہوتے ہیں اور کبھی ڈاڑھی کے بالوں کو۔ کئی آستین چڑھاتے اور کئی اُتار رہے ہوتے ہیں۔ کیا نماز میں ایسے افعال کرنا درست ہے۔ (خالد محمود۔ سرگودھا)

ج نماز کے اندر اطمینان و سکون کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے اور نماز کے ارکان کی ادائیگی کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔ عام لوگوں کی جو عادت ہے کہ کبھی سر کے بالوں سے کھیلتے ہیں اور کبھی ڈاڑھی کے بالوں سے۔ نماز کے اندر ایسے افعال سے پرہیز کرنا چاہیے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰى سَبْعَةٍ لَا اَكُفُّ شَعْرًا وَلَا ثَوْبًا.))

"نبی اکرم ﷺ نے فرمایا مجھے سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے (اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے) کہ نماز میں کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹوں" (بخاری ۱/۱۳۵)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں کپڑوں اور بالوں سے کھیلنا اور انہیں سمیٹنا یہ درست نہیں ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۳ء)

حالتِ نماز میں سلام کا جواب دینے کا طریقہ

س اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو اور تمام نمازی باجماعت نماز ادا کر رہے ہوں اور باہر سے آنے والا بلند آواز سے السلام علیکم کہے تو نمازیوں کو اس کا جواب کس طرح دینا چاہیے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(آصف سہیل' حاصل پور)

ج صورتِ مسئولہ میں باہر سے آنے والا شخص جب سلام کہے تو نمازی اس کا جواب الفاظ سے نہ دیں کیونکہ نماز کی حالت میں کلام کرنا منع ہے بلکہ نمازی ہاتھ کے اشارے سے جواب دے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ:

((قُلْتُ لِبِلَالٍ كَيْفَ رَأَيْتَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرُدُّ عَلَيْهِمْ حِيْنَ يُسَلِّمُوْنَ عَلَيْهِ وَهُوَ يُصَلِّي؟ قَالَ يَقُوْلُ هٰكَذَا وَبَسَطَ كَفَّهُ أَخْرَجَهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ.))

"میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی حالت میں جب لوگ سلام کرتے تو آپ نے ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے دیکھا؟ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے کہا آپ ایسے کہتے تھے اور اپنی ہتھیلی کو پھیلایا"

(بلوغ المرام مع سبل السلام ۱/۱۴۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ نماز میں سلام کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دیتے تھے۔ زبان سے کلام نہیں فرماتے تھے۔ امام محمد بن اسماعیل الصنعانی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

"وَالْحَدِيْثُ دَلِيْلٌ أَنَّهُ إِذَا سَلَّمَ أَحَدٌ عَلَى الْمُصَلِّيْ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ بِإِشَارَةٍ دُوْنَ النُّطْقِ۔"

"یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب بھی کوئی آدمی کسی کو حالتِ نماز

میں سلام کہے تو وہ اس کا جواب ہاتھ کے اشارہ سے دے نہ کہ زبان سے بول کر" (سبل السلام ۱/۱۴۰) (مجلۃ الدعوۃ' جولائی/ ۱۹۹۴ء)

نمازیوں کو سلام کرنا

س: جب نماز کی جماعت ہو رہی ہو تو مسجد میں داخل ہونے والا نمازیوں کو السلام علیکم کہہ سکتا ہے یا نہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔
(عبدالقدوس مغلپورہ' لاہور)

ج: نماز کی حالت میں سلام کرنا جائز ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب مسجد میں آتے تو سلام کہتے۔ اللہ کے رسول نماز میں ہوتے تو ہاتھ کے ساتھ اشارہ کر دیتے تھے۔ اس کی دلیل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ کہتے ہیں "میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھ رہے ہوتے اور کوئی سلام کہہ دیتا تو کیسے جواب دیتے تھے؟ بلال رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کَانَ یُشِیْرُ بِیَدِہٖ اپنے ہاتھ سے اشارہ کر دیتے تھے۔ (الترمذی وقال حسن صحیح)

علامہ ناصرالدین الالبانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔
(مشکوۃ جلد ۱' صفحہ ۳۱۴)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ باہر سے مسجد میں داخل ہونے والا سلام کہہ سکتا ہے۔ خواہ جماعت بھی ہو رہی ہو۔ اگر یہ درست نہ ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ خود ہاتھ کے اشارے سے جواب ہی نہ دیتے' بلکہ اس سے روک دیتے۔ جیسا کہ منہ سے جواب دینے سے روک دیا تھا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حبشہ جانے سے پہلے اللہ کے رسول ﷺ کو سلام کہتے تھے تو نبی کریم نماز کے دوران ہی ہمیں جواب دے دیتے تھے۔ جب ہم حبشہ سے واپس آئے تو میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا۔ دیکھا کہ آپ نماز میں مشغول ہیں۔ میں نے سلام کیا آپ نے جواب نہ دیا نماز کے بعد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ مِنْ اَمْرِہٖ مَا یَشَاءُ وَاِنَّ مِمَّا اَحْدَثَ اَنْ لَا تَتَکَلَّمُوْا

فِی الصَّلٰوۃِ.)) (رواہ ابو داؤد و قال البانی حسن)

"کہ اللہ تعالیٰ اپنا جو حکم نیا دینا چاہتا ہے' دے دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو ایک نیا حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ نماز میں کلام نہ کرو"

اِن احادیثِ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا کہ مسجد میں داخل ہونے والا سلام کہے اور نماز میں مشغول آدمی ہاتھ کے اشارے سے جواب دے۔ مُنہ سے جواب دینا اِس حالت میں درست نہیں۔ (مجلۃ الدعوۃ' جولائی / ۱۹۹۵ء)

فرض نماز گھر میں پڑھنا کیسا ہے؟

س تندرست آدمی بغیر کسی شرعی عذر کے فرض نماز گھر میں پڑھ سکتا ہے جبکہ مسجد بھی اس کے گھر سے زیادہ دور نہ ہو؟ قرآن سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

ج تندرست اور غیر معذور آدمی پر فرض نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَارْکَعُوْا مَعَ الرَّاکِعِیْنَ ﴾ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ یعنی نماز باجماعت ادا کرو۔ یہ امر ہے اور یہاں امر(حکم) وجوب کے لیے ہے۔ دار قطنی میں حدیث ہے' اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ یُجِبْ فَلَا صَلٰوۃَ لَہٗ اِلَّا مِنْ عُذْرٍ.))

"جس شخص نے اذان سنی' پھر وہ بغیر کسی عذر کے مسجد میں نہ آیا' اس کی نماز ہی نہیں" (مشکوۃ ۱/۳۳۸)

علامہ ناصر الدین البانی فرماتے ہیں "اسنادہ صحیح" اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

صحیح مسلم میں ہے ایک نابینا شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور اُس نے کہا کوئی مجھے مسجد میں لانے والا نہیں۔ گھر میں نماز ادا کرنے کی رخصت دے دیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے رخصت دے دی۔ جب وہ واپس پلٹا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ تو اذان سنتا ہے؟ اُس نے کہا جی ہاں! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (فَاَجِبْ) تو پھر قبول کر یعنی تیرا مسجد میں آنا لازمی ہے۔ اندازہ لگایئے کہ رسول اللہ نے ایک

نابینا شخص کو اذان سننے کے بعد اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی تو بینائی والے شخص کو بغیر شرعی عذر کے بھلا گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت کس طرح ہو گی۔
صحیحین میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' میں نے ارادہ کیا کہ لکڑیاں اکٹھی کرنے کا حکم دوں۔ پھر اذان کہلاؤں اور ایک شخص کو نماز باجماعت پڑھانے کے لیے کھڑا کر کے ایسے لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز باجماعت کے لیے حاضر نہیں ہوتے اور ان کو ان کے گھر سمیت جلا ڈالوں۔

یہ سخت وعید اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں پر باجماعت نماز ادا کرنا فرض ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے معاشرے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اور اذان سننے کے بعد اپنے کاموں میں ہی مشغول رہتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو اپنے اپنے مقام پر ہی نماز پڑھ لینا کافی سمجھتے ہیں جبکہ بغیر شرعی عذر کے ایسے لوگوں کی نماز ہوتی ہی نہیں جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ننگے سر نماز

س ننگے سر مَرد کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں۔ میں نے مسعودی ایس سی کا ایک پمفلٹ پڑھا' اس میں لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی ننگے سر نماز نہیں پڑھی اور جابر والی روایت ثابت ہی نہیں۔ براہِ مہربانی قرآن اور حدیث کے مکمل دلائل سے وضاحت کریں۔ (نجیب کیانی' ملتان کینٹ۔ نثار احمد' چوکی)

ج نماز میں ستر ڈھانپنا واجب ہے اور کندھوں پر بھی کسی چیز کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کپڑے شریعت میں ضروری طور پر ثابت نہیں ہیں۔
رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک کپڑے میں بھی نماز پڑھی ہے جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ایک دن ایک کپڑے کو جسم پر لپیٹے نماز پڑھ رہے تھے جبکہ دوسرا کپڑا قریب رکھا ہوا تھا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو کسی نے کہا' آپ ایک ہی کپڑے میں نماز ادا کر رہے ہیں جبکہ دوسرا کپڑا آپ کے پاس موجود ہے۔ انہوں نے

کہا ہاں میں چاہتا ہوں کہ تمہارے جیسے جاہل مجھے دیکھ لیں۔ ((رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ ھٰکَذَا)) میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ (بخاری شریف' کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ بغیر رداء)

بخاری شریف میں ہی ایک دوسری روایت میں ایک کپڑے میں نماز کی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے ((قَدْ عَقَدَہٗ مِنْ قِبَلِ قَفَاہُ)) کپڑے کو اپنی گدی پر باندھا ہوا تھا۔ (یعنی سر پر کچھ نہ تھا)

دوسری دلیل : عمر بن ابی سلم بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ((یُصَلِّیْ فِیْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ مُشْتَمِلاً بِہٖ بَیْتَ اُمِّ سَلَمَۃَ وَاضِعًا طَرَفَیْہِ عَلٰی عَاتِقَیْہِ)) اور مسلم شریف کی روایت میں مُتَوَشِّحًا کے الفاظ ہیں۔ آپ ایک کپڑے میں نماز پڑھ رہے تھے اس کے دونوں کنارے اپنے کندھوں پر بندھے ہوئے تھے۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے سر پر وہ کپڑا نہ تھا۔

ہاں! عورت کی نماز ننگے سر نہیں ہوتی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں :

((لَا تُقْبَلُ صَلٰوۃُ حَائِضٍ اِلَّا بِخِمَارٍ.))

(ابوداؤد' ترمذی' صححہ البانی)

"بالغ عورت کی نماز دوپٹہ (اوڑھنی) کے بغیر نہیں ہوتی"

یہ حدیث بھی اس کا بین ثبوت ہے کہ مرد کی ننگے سر نماز ہو جاتی ہے اس کے لیے ایسا کپڑا ضروری نہیں ورنہ نبی کریم ﷺ یہ کہہ دیتے مرد اور عورت کی نماز ننگے سر نہیں ہوتی۔

اب دلائل سے کوئی یہ مت سمجھے کہ ایک کپڑے میں نماز اس وقت درست تھی جب مسلمانوں کے پاس کپڑے کم تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے وسعت دے دی تو سر ڈھانپنا واجب ہو گیا۔ اس بات کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ہم امیر المؤمنین ابن الخطاب رضی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں کیونکہ وہ یقیناً ہم سے بڑھ کر شریعت کو سمجھنے والے تھے ایسے ہی حالات میں کسی شخص نے ان سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے

بارے میں پوچھا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک سے زیادہ کپڑوں کو شمار کر لیا مگر ان میں سر ڈھانپنے والے کپڑے کا نام ہی نہیں۔

(بخاری باب الصلو فی القمیص والسراویل)

امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو تو فراخی وسعت کے وقت بھی یہی سمجھ آئی کہ سر ڈھانپنا واجب نہیں۔ اب ان احادیثِ صحیحہ مرفوعہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فہم کو ترک کر کے اپنی عقل کو سامنے رکھنا ہرگز انصاف نہیں۔ (مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۵ء)

کتاب

الْمَسَاجِدِ

مسجد میں عورتوں کا پروگرام

س کیا مسجد میں عورتوں کا کوئی پروگرام یا جلسہ ہو سکتا ہے؟ قرآن و حدیث کی رُو سے جواب دیں۔

ج عورتیں اپنے پردے اور مسجد کے آدابِ شرعیہ کو ملحوظ رکھ کر مسجد میں آئیں تو ان کو روکنا درست نہیں ہے۔ اس کی دلیل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا اسْتَاْذَنَتِ امْرَاَةُ اَحَدِكُمْ اِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يَمْنَعْهَا))

"کہ جب تمہاری کوئی عورت مسجد میں جانے کی اجازت مانگے تو اسے مت روکو" (متفق علیہ)

دوسری دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَمْنَعُوْا نِسَائَكُمُ الْمَسَاجِدَ وَبُيُوْتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ))

"اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے نہ روکو اور ان کے گھران کے لئے بہتر ہیں" (رواہ ابوداؤد)

علامہ ناصرالدین البانی حفظہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرامین عام ہیں۔ عورتیں خواہ نماز پڑھنے کے لیے آئیں یا تعلیم و تربیت اور وعظ و نصیحت کے لیے ان کو روکنا درست نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ جس میں' عورتیں نماز پڑھنے کے لیے تو مساجد میں آسکتی ہوں مگر وعظ و نصیحت کے لیے انھیں آنے کی اجازت نہ ہو۔ پھر یہ بات بھی یاد رہے کہ جو نص مردوں کے لیے مساجد میں اپنا جلسہ یا تبلیغی پروگرام کرنے کی دلیل ہے' وہی عورتوں کی بھی دلیل ہے بشرطیکہ آداب مسجد کو ملحوظ رکھا جائے کوئی حائضہ یا نفاس والی عورت یا خوشبو لگا کر اور بے پردگی کے ساتھ عورتیں مسجد میں نہ جائیں۔ از : (ع۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ' اکتوبر / ۱۹۹۵ء)

قبروں والی مساجد میں نماز

س وہ مساجد جن میں قبریں ہوں کیا ان مساجد میں نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ قرآن و سنت کی روشنی میں مسجد نبویؐ کا حوالہ دیتے ہوئے وضاحت کریں۔

(اکبر علی' رشید پورہ لاہور)

ج ایسی مساجد میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر مساجد بنانے والوں کو ملعون قرار دیا ہے اور قبروں پر مساجد بنانے سے قبروں پر اور قبروں کی طرف نماز پڑھنے سے روک دیا ہے۔ جندب بن عبداللہ بھی کہتے ہیں میں نے اللہ کے رسول ﷺ کی وفات سے پہلے ان سے سنا۔ انہوں نے کچھ باتیں ذکر کیں:

((وَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ فَاِنِّيْ اَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ))

"کہ جو تم سے پہلے تھے (یہود و نصاریٰ) وہ اپنے انبیاء اور نیک لوگوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیتے تھے خبردار تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔" (رواہ مسلم (۵۳۲) ابوداؤد)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہودیوں اور عیسائیوں پر لعنت کرے انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔

(بخاری (۳۹۰) مسلم (۵۲۹)

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ قبروں پر مسجدیں بنانا حرام ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے روک دیا ہے۔ جب قبروں پر مسجدیں بنانے سے روک دیا گیا ہے تو ایسی مساجد میں نماز پڑھنی بالاولی درست نہیں ہے کیونکہ یہ شریعت کا اصول ہے کہ کسی وسیلہ (ذریعہ) کی حرمت اس چیز کے حرام ہونے کو ملتزم ہوتی ہے جو اس وسیلہ سے مقصود ہو مثلاً شریعت نے شراب کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے اور اس حرمت کے اندر اس کے پینے کی حرمت بھی موجود ہے۔ یہاں شراب کی

خرید و فروخت وسیلہ ہے اور اس کا مقصود شراب نوشی کرنا ہے۔ اور یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ قبروں پر مساجد بنانے کا حرام ہونا یہ صرف مساجد کی ذات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ نماز کی وجہ سے ہے۔ جس طرح گھروں اور محلوں میں مساجد بنانے کا حکم صرف مساجد کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ نماز کے لیے ہے۔ مساجد بنانے کے حکم کا مقصد صرف یہ نہیں کہ ہم مسجدیں بناتے جائیں اور ان میں کوئی بھی نماز پڑھنے کے لیے نہ آئے۔ یہ بات آپ اس مثال سے سمجھیں کہ ایک شخص کسی غیر آباد جنگل میں مسجد بناتا ہے جہاں کوئی نہیں رہتا اور نہ کوئی نماز پڑھنے کے لیے آتا ہے تو ایسے شخص کو اس مسجد کے بنانے کا کوئی ثواب نہیں ہو گا بلکہ ممکن ہے وہ گنہگار ہو کیونکہ اُس نے مال کو ایسی جگہ پر صرف کیا ہے جہاں سے کوئی بھی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس طرح شریعت نے مساجد بنانے کا حکم دیا ہے تو ضمناً ان میں نماز پڑھنے کا حکم بھی دیا ہے (کیونکہ مسجد بنانے کا مقصد نماز ادا کرنا ہی تو ہوتا ہے) اسی طرح جب شریعت نے قبروں پر مسجدیں بنانے سے روکا ہے تو ضمناً ایسی مسجدوں میں نماز پڑھنے سے بھی روکا ہے اور یہ بات کسی بھی عقلمند آدمی سے مخفی نہیں۔ اسی لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ایسی مساجد میں ادا کی گئی نماز کو باطل قرار دیا ہے لیکن مسجد نبوی اس حکم سے مستثنیٰ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام لے کر اس کی فضیلت بیان کی ہے جو دوسری قبروں پر بنی ہوئی مسجدوں میں نہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اس مسجد میں نماز دوسری مساجد کی ہزار نمازوں سے بہتر ہے سوائے مسجد الحرام کے اور مسجد نبوی میں رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ بھی ہے۔ جس طرح بیت اللہ ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا اس کی فضیلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے معلوم تھی بعد میں مشرکین نے بت رکھ دیئے مگر رسول اللہ ﷺ وہاں نماز پڑھتے تھے اگر مسجد نبوی میں نماز کو فاسد اور نادرست قرار دے دیں تو مسجد نبوی کی فضیلت کو ختم کر کے دوسری مساجد کے برابر قرار دینے کے مترادف ہو گا جو کسی لحاظ سے بھی جائز نہیں پھر یہ بھی یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ مسجد اپنے

اور مسلمانوں کے لیے بنائی تھی جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی جبکہ قبریں ولید بن عبدالملک کے دور میں داخل کی گئی ہیں اور اس وقت مدینہ الرسول میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ پھر بھی رسول اللہ ﷺ کی قبر کے پیچھے نماز پڑھنے سے بچنا چاہیے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم) از : (ع۔ع)

محتلم کا مسجد میں جانا

س: کیا محتلم بغیر غسل کیے مسجد میں جا سکتا ہے؟

ج: حالتِ جنابت میں مسجد سے گزرنا پڑے تو اضطراری صورت میں گزر سکتے ہیں لیکن وہاں جنابت کی حالت میں ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا :

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ﴾

(النساء : ۴۳)

"اے ایمان والو! جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ جو بات تم منہ سے نکالتے ہو اس کو سمجھنے لگو۔ اسی طرح حالتِ جنابت میں مگر راہ چلتے ہوئے یہاں تک کہ تم غسل کر لو"

اکثر سلف صالحین جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سعید بن مسیب، الضحاک، حسن بصری، عکرمہ، نخعی اور زہری رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کے نزدیک یہاں الصلوۃ سے مواضع صلوۃ یعنی مساجد مراد ہیں امام ابنِ جریر نے اسے راجح قرار دیا ہے تفسیر ابنِ جریر، معالم التنزیل ۴۳۱/۱ اور یہی جمہور علماء کا مسلک ہے کہ جنبی کے لیے مسجد سے گزرنا جائز ہے ٹھہرنا جائز نہیں۔

مستند روایات میں آتا ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر مسجد کی طرف اس طرح کھلتے تھے کہ بغیر مسجد سے گزرے وہ مسجد سے باہر نہیں جا سکتے تھے اور گھروں میں

غسل کے لیے پانی نہیں ہوتا تھا جنابت کی حالت میں مسجد سے گزرنا ان پر شاق گزرتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی جیسا کہ تفسیر ابنِ کثیر میں موجود ہے۔

(مجلّۃ الدعوۃ' جون / ۱۹۹۳ء)

﴿٦﴾

کتاب

الْجَنَائِزِ

جنازہ اُٹھاتے وقت بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھنا اور ذکر کرنا

س: دورِ حاضر میں جب جنازہ اٹھایا جاتا ہے تو لوگ باآواز بلند کلمۂ شہادت پڑھتے ہیں۔ بعض علاقوں میں جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے نظمیں پڑھتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا قرآن و حدیث سے ثابت ہے؟ بینوا توجروا۔ (ایک سائل' لاہور)

ج: نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسا کرنا کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں بلکہ جنازہ کے ساتھ آواز بلند کرنا ناجائز ہے اور اس کی کراہت منقول ہے۔ سیدنا قیس بن عباد سے مروی ہے کہ:

((كَانَ اَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُوْنَ رَفْعَ الصَّوْتِ عِنْدَ الْجَنَائِزَ))

"صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنازوں کے پاس آواز بلند کرنا ناپسند کرتے تھے"

(بیہقی ۴/ ۷۴)

اسی طرح ایک مرفوع حدیث جو کہ اپنے مختلف شواہد کی بنا پر قوی ہے' میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَتَّبِعِ الْجَنَازَةَ بِصَوْتٍ وَّلَا نَارٍ))

"جنازے کے پیچھے آواز اور آگ کے ساتھ نہ آ"

(ابوداؤد ۲/ ۶۴' مسند احمد ۲/ ۴۲۷' ۵۲۸' ۵۳۲)

ان احادیث سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ جنازہ کے ساتھ آواز بلند کرنا منع ہے اور یہ جو ہمارے ہاں طریقہ رائج ہو چکا ہے کہ جنازہ کو کندھا دیتے وقت باآواز بلند کہا جاتا ہے "کلمۂ شہادت" اس کا کوئی ثبوت نبی ﷺ' آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم اور شریعت اسلامیہ سے نہیں ملتا اور نہ ہی جنازہ کے ساتھ نعت گوئی کا کہیں تذکرہ ملتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کتاب الاذکار/ ۲۰۳ میں فرماتے ہیں کہ:

((وَاعْلَمْ اَنَّ الصَّوَابَ وَالْمُخْتَارَ وَمَا كَانَ عَلَيْهِ السَّلَفُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمُ السُّكُوْتُ فِيْ حَالِ السَّيْرِ مَعَ الْجَنَازَةِ فَلَا يُرْفَعُ صَوْتٌ بِقِرَاءَةٍ وَّلَا ذِكْرٍ وَّلَا غَيْرِ ذٰلِكَ.))

"جان لیجئے کہ صحیح اور مختار بات اور جس پر سلف صالحین رحمہم اللہ تھے وہ یہ ہے کہ جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے خاموشی ہو۔ جنازے کے ساتھ آواز نہ قرآت کے ذریعے بلند کی جائے اور نہ ہی ذکر وغیرہ کے ساتھ"

اور آگے فرماتے ہیں "کثرت کے ساتھ جو لوگ اس بات کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان سے دھوکہ مت کھایئے۔ ابو علی فضیل بن عیاض نے فرمایا: ہدایت کے راستوں کو لازم تھام سالکین کی قلت تجھے نقصان نہیں دے گی اور گمراہی کے راستوں سے بچیے اور ہلاک ہونے والوں کی کثرت سے دھوکہ نہ کھایئے"۔ اور سنن کبریٰ بیہقی سے ہم نے وہ روایت نقل کی ہے جو ہمارے قول کا تقاضا کرتی ہے (یعنی اوپر قیس بن عباد والی روایت جس میں باآواز بلند کرنے کی کراہت منقول ہے) اور دمشق وغیرہ میں جنازے میں شامل جو جاہل لوگ قرآت کے ساتھ آواز کھینچتے ہیں اور کلام کو اس کی جگہوں سے نکال دیتے ہیں' وہ علماء کے اجماع کے ساتھ حرام ہے۔"

امام نووی رحمہ اللہ کی اس صراحت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنازہ کے ساتھ ذکر اذکار یا قرآت وغیرہ کی آواز بلند کرنے کا ثبوت کتاب و سنت سے نہیں ملتا۔ جو کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے نہیں کیا' نہ اسے جائز سمجھا نہ افضل تو ہم کیسے ایسے کام جائز افضل بنا سکتے ہیں۔ (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۶ء)

شہید کی نماز جنازہ

س ہمارے کچھ ساتھی جو کشمیر میں شہید ہوئے ہیں ہم نے ان کی نماز جنازہ کے لیے اپنے مولوی صاحب سے کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ جو شہید ہو

جاتے ہیں' ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ قرآن و سنت کی رُو سے واضح کریں کہ شہید کا اگر جنازہ پڑھ لیا جائے تو کیا درست ہے یا نہیں؟ (عبدالغفور' گوجرانوالہ)

ج شہید کی نمازِ جنازہ نہ ضروری ہے اور نہ ناجائز۔ بلکہ اس کا پڑھنا بھی جائز ہے اور نہ پڑھنا بھی۔ دونوں طرح کی روایات کتب احادیث میں موجود ہیں۔ شہداء کا جنازہ پڑھنے کے متعلق چند ایک احادیث کا ذکر کرتا ہوں:

((عَنْ شَدَّادِ بْنِ الْهَادِ اَنَّ رَجُلاً مِنَ الْاَعْرَابِ جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاٰمَنَ بِهِ وَاتَّبَعَهُ ثُمَّ قَالَ اُهَاجِرُ مَعَكَ فَلَبِثُوْا قَلِيْلاً ثُمَّ نَهَضُوْا فِيْ قِتَالِ الْعَدُوِّ فَاُتِيَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحْمَلُ قَدْ اَصَابَهُ سَهْمٌ.... ثُمَّ كَفَّنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جُبَّتِهِ ثُمَّ قَدَّمَهُ فَصَلّٰى عَلَيْهِ.))

"سیدنا شداد بن الهاد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بدوی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور آپ پر ایمان لے آیا... پھر وہ شخص جنگ میں شہید ہو گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسے اپنے جبہ میں کفن دیا اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھی"

یہ حدیث صحیح ہے اور امام نسائی کی السنن الکبری (۲۰۸۰) ۱/ ۶۳۴ اور امام طحاوی کی شرح معانی الآثار ۱/ ۲۹۱' مستدرک حاکم ۳/ ۵۹۵۔۵۹۶ اور بیہقی ۴/ ۱۵۔۱۶ میں موجود ہے۔

((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ يَوْمَ اُحُدٍ بِحَمْزَةَ فَسُجِّيَ بِبُرْدَةٍ ثُمَّ صَلّٰى عَلَيْهِ فَكَبَّرَ تِسْعَ تَكْبِيْرَاتٍ ثُمَّ اُتِيَ بِالْقَتْلٰى يَصُفُّوْنَ وَيُصَلِّي عَلَيْهِمْ وَعَلَيْهِ مَعَهُمْ))

"سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کے دن سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے متعلق حکم دیا۔ پس انہیں ایک چادر میں چھپا دیا گیا۔ آپ نے حمزہ رضی اللہ عنہ کی نو تکبیروں کے ساتھ نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔ پھر دوسرے شہداء باری باری لائے گئے۔ آپ نے ان کی بھی نماز جنازہ ادا فرمائی اور ان کے ساتھ ساتھ

حمزہ رضی اللہ عنہ کی نماز بھی ادا فرماتے رہے"۔ (طحاوی ۱/۲۹۰)

امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری کتاب الجنائز باب الصلاۃ علی الشھید میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

((اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجَ یَوْمًا فَصَلّٰی عَلٰی اَھْلِ اُحُدٍ صَلَاتَہٗ عَلَی الْمَیِّتِ...))

"ایک دن رسول اللہ ﷺ نکلے پس آپ نے شہداء اُحد پر اس طرح نماز ادا کی جس طرح آپ میت پر نماز ادا کرتے تھے۔" (بخاری ۳/۱۶۴، ۷/۲۷۹، ۲۸۰، ۳۰۲، مسلم ۷/۲۷، احمد ۴/۱۴۹، ۱۵۳ طحاوی ۱/۲۹۰، دار قطنی ۱۹۷، السنن الکبری للنسائی ۱/۲۳۵(۲۰۸۱)

امام ابنِ حزم، امام احمد بن حنبل، امام ابنِ قیم اور علماء اہلحدیث رحمہم اللہ نے اس مسلک کو راجح قرار دیا ہے جس کی تفصیل تحفۃ الاحوذی ۲/۱۴۸، نیل ۴/۴۸، المغنی ۳/۳۴۴ وغیرہ میں ہے۔ امام ابنِ قیم رحمہ اللہ نے تہذیب السنن ۴/۲۹۵ میں فرمایا ہے:

((وَالصَّوَابُ فِی الْمَسْاَلَۃِ اَنَّہٗ مُخَیَّرٌ بَیْنَ الصَّلَاۃِ عَلَیْھِمْ وَتَرْکِھَا لِمَجِیْءِ الْاٰثَارِ بِکُلِّ وَاحِدٍ مِنَ الْاَمْرَیْنِ وَھٰذَا اِحْدَی الرِّوَایَاتِ عَنِ الْاِمَامِ اَحْمَدَ وَھِیَ الْاَلْیَقُ بِاُصُوْلِہٖ وَمَذْھَبِہٖ.))

"مذکورہ بالا مسئلہ میں درست بات یہی ہے کہ شہید کی نمازِ جنازہ پڑھنے اور ترک کرنے میں اختیار ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک کے متعلق آثار مروی ہیں اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت اسی طرح مروی ہے اور ان کے اصول و مذہب کے زیادہ مناسب ہے"۔

دورِ حاضر کے محدث علامہ البانی حفظہ اللہ کی رائے اس مسئلہ میں یہ ہے کہ شہید کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنے سے پڑھنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ جنازہ دُعا اور عبادت ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ، اکتوبر/ ۱۹۹۳ء)

شہید کا نمازِ جنازہ اور جنازۂ غائبانہ

س ۱) کیا شہید کی نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے؟ میں نے کئی علماء سے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی شہید کا جنازہ نہیں پڑھا بلکہ ایک شیخ الحدیث نے تو مجمع عام میں فرمایا کہ میدانِ معرکہ کے شہید کا جنازہ جائز ہی نہیں۔

۲) جو بھائی کشمیر میں شہید ہوتے ہیں' آپ ان کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کرتے ہیں۔ اس کی دلیل کتاب و سنت سے واضح فرمائیں؟ (طارق حسن' وزیر آباد)

ج شہید کی نمازِ جنازہ ضروری نہیں البتہ اگر پڑھے تو جائز ہے۔ مسنون اور باعث ثواب ہے۔ جو لوگ شہید معرکہ کے جنازہ کو ناجائز قرار دیتے ہیں ان کے سامنے صحیح بخاری کی یہ حدیث ہے:

((عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلٰى اُحُدٍ فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ ثُمَّ يَقُوْلُ اَيُّهُمْ اَكْثَرُ اَخْذًا لِلْقُرْاٰنِ فَاِذَا اُشِيْرَ لَهٗ اِلٰى اَحَدِهِمَا قَدَّمَهٗ فِي اللَّحْدِ وَقَالَ اَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاَمَرَ بِدَفْنِهِمْ فِيْ دِمَائِهِمْ وَلَمْ يُغَسَّلُوْا وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِمْ))

"جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ اُحد کے مقتولین میں سے دو دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے پھر فرماتے۔ ان میں سے قرآن کسے زیادہ یاد تھا؟ جب ان میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کر کے آپ کو بتایا جاتا تو آپ اسے لحد میں آگے کر دیتے اور آپ نے ان کے خونوں میں ہی دفن کر دینے کا حکم دیا نہ انہیں غسل دیا گیا اور نہ ان کا جنازہ پڑھا۔"

(صحیح البخاری اصح المطابع ص ۱۷۹' باب الصلوۃ علی الشہید)

ان علماء کا کہنا ہے کہ صحیح بخاری کی یہ حدیث اس بات کی صریح دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اُحد کے شہداء کا جنازہ نہیں پڑھا۔ یہ حضرات ان احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اُحد کے موقع پر

شہیدوں کا جنازہ پڑھا۔ کیونکہ وہ صحیح بخاری کی حدیث کے خلاف ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ شہداء کا جنازہ رسول اللہ ﷺ سے صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ یہ احادیث تین مختلف اوقات سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن میں سے دو موقعوں کی احادیث کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور اگر کسی نے اختلاف کیا ہے تو محض وہم کی بنا پر کیا ہے۔ پہلا موقعہ غزوۂ اُحد کے علاوہ دوسرے موقع پر شہید ہونے والوں کا جنازہ۔

امام نسائی فرماتے ہیں:

((اَخْبَرَنَا سُوَیْدُ بْنُ نَصْرٍ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُاللّٰهِ عَنِ ابْنِ جُرَیْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عِكْرَمَةُ بْنُ خَالِدٍ اَنَّ ابْنَ اَبِی عَمَّارٍ اَخْبَرَهُ عَنْ شَدَّادِ بْنِ الْهَادِ اَنَّ رَجُلاً مِّنَ الْاَعْرَابِ جَاءَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاٰمَنَ بِهٖ وَاتَّبَعَهُ ثُمَّ قَالَ اُهَاجِرُ مَعَكَ فَاَوْصٰی بِهِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَعْضَ اَصْحَابِهٖ فَلَمَّا كَانَتْ غَزْوَةٌ غَنِمَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ شَیْئًا فَقَسَمَ وَقَسَمَ لَهٗ وَاَعْطٰی اَصْحَابَهٗ مَا قَسَمَ لَهٗ وَكَانَ یَرْعٰی ظَهْرَهُمْ فَلَمَّا جَاءَ دَفَعُوْهُ اِلَیْهِ فَقَالَ مَا هٰذَا؟ قَالُوْا قِسْمٌ قَسَمَهُ لَكَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَخَذَهُ فَجَاءَ بِهٖ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم فَقَالَ مَا هٰذَا قَالَ قَسَمْتُهُ لَكَ قَالَ مَا عَلٰی هٰذَا اتَّبَعْتُكَ وَلٰكِنِّی اتَّبَعْتُكَ عَلٰی اَنْ اُرْمٰی اِلٰی هٰهُنَا وَاَشَارَ اِلٰی حَلْقِهٖ بِسَهْمٍ فَاَمُوْتَ فَاَدْخُلَ الْجَنَّةَ فَقَالَ اِنْ تَصْدُقِ اللّٰهَ یَصْدُقْكَ فَلَبِثُوْا قَلِیْلاً ثُمَّ نَهَضُوْا فِیْ قِتَالِ الْعَدُوِّ فَاُتِیَ بِهِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُحْمَلُ قَدْ اَصَابَهٗ سَهْمٌ حَیْثُ اَشَارَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَهُوَ هُوَ قَالُوْا نَعَم قَالَ : صَدَقَ اللّٰهَ فَصَدَّقَهٗ ثُمَّ كَفَّنَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ جُبَّةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَدَّمَهٗ فَصَلّٰی عَلَیْهِ فَكَانَ مِمَّا ظَهَرَ مِنْ صَلَاتِهٖ

اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَبْدُكَ خَرَجَ مُهَاجِرًا فِي سَبِيْلِكَ فَقُتِلَ شَهِيْدًا اَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى ذَالِكَ.))

"ہمیں سوید بن نصر نے خبر دی انہوں نے فرمایا ہمیں عبداللہ نے ابن جریج سے خبر دی' انہوں نے فرمایا مجھے عکرمہ بن خالد نے خبر دی کہ ابن ابی عمار نے انہیں شداد بن الہاد سے خبر دی کہ ایک اعرابی نبی ﷺ کے پاس آیا۔ آپ پر ایمان لایا اور آپ کا تابع ہو گیا پھر کہنے لگا میں آپ کے ساتھ ہجرت کرتا ہوں۔ نبی ﷺ نے اس کے متعلق اپنے بعض صحابہ کو تاکید فرمائی۔ جب ایک جنگ ہوئی تو نبی ﷺ کو کچھ غنیمت حاصل ہوئی۔ آپ نے اسے تقسیم کر دیا ار اس کا حصّہ بھی نکالا اور اس کا حصّہ اس کے ساتھیوں کو دے دیا۔ وہ ساتھیوں کی سواریاں چرایا کرتا تھا۔ جب آیا تو انہوں نے اسے وہ دیا۔ کہنے لگا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا تمہارا حصّہ ہے جو نبی ﷺ نے تمہارے لیے نکالا ہے۔ اُس نے وہ لے لیا اور لے کر نبی ﷺ کے پاس آ گیا۔ کہنے لگا یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے یہ تمہارا حصّہ نکالا ہے۔ کہنے لگا میں اس کے لیے آپ کے پیچھے نہیں چلا بلکہ میں تو اس (مقصد) کے لیے آپ کے پیچھے چلا ہوں کہ مجھے (حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہاں تیر لگے تو میں فوت ہو کر جنت میں داخل ہو جاؤں آپ نے فرمایا اگر تم اللہ سے سچ کہو گے تو اللہ بھی تم سے سچ کا سلوک کرے گا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر گزری۔ پھر وہ دشمن سے لڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تو اسے اٹھا کر نبی ﷺ کے پاس لایا گیا اور اس کو وہیں تیر لگا تھا جہاں اُس نے اشارہ کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کیا یہ وہی ہے؟ صحابہ نے کہا جی ہاں! آپ نے فرمایا' اس نے اللہ تعالیٰ سے سچ کہا تو اللہ نے اس سے سچ کا سلوک کیا' پھر نبی ﷺ نے اُسے خود اپنے جبہ میں کفن دیا۔ پھر اسے آگے رکھ کر اس پر جنازہ پڑھا۔ تو جنازے میں سے آپ کے جو الفاظ ظاہر ہوئے ان میں سے چند الفاظ یہ تھے اے اللہ یہ تیرا بندہ ہے۔ ہجرت کر کے تیری راہ میں نکلا پس شہید ہو کر قتل ہوا۔ میں اس بات پر گواہ ہوں۔"

(نسائی مع التعلیقات السلفیة / ۲۲۳' باب الصلاۃ علی الشہداء)

یہ حدیث نسائی کے علاوہ طحاوی نے شرح معانی الاثار (۲۹۱/۱) میں حاکم (۵۹۵/۳۔۵۹۶) نے اور بیہقی (۱۵/۴۔۱۶) نے بھی روایت کی ہے۔

بحوالہ احکام الجنائز وبدعھا للشیخ ناصر الدین الالبانی

شیخ ناصر البانی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں اس کی اسناد صحیح ہے۔ اس کے تمام راوی مسلم کی شرط پر ہیں سوائے شداد بن الہاد کے کہ مسلم نے ان کی کوئی حدیث روایت نہیں کی مگر اس کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ وہ معروف صحابی ہیں اور شوکانی نے نیل الاوطار (۴۷/۳) میں نووی (المجموع ۵/۲۶۵) کی اتباع میں جو کہا ہے کہ وہ تابعی ہیں تو یہ ان کا واضح وہم ہے اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ (احکام الجنائز ص ۶۱)

تقریب میں ہے: شَدَّادُ بْنُ الْهَادِ اللَّيْثِيُّ صَحَابِيٌّ شَهِدَ الْخَنْدَقَ وَمَا بَعْدَهَا یعنی "شداد بن الہاد صحابی ہیں جو خندق اور اس کے بعد کی جنگوں میں شریک ہوئے"۔

اس صحیح اور صریح حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے شہید معرکہ کا جنازہ خود پڑھایا ہے اگر اُحد کے شہیدوں کا جنازہ آپ ﷺ نے نہ بھی پڑھا ہو تو یہ حدیث ہی جنازہ کے سنت ہونے کی کافی دلیل ہے۔

اگر کوئی شخص اعتراض برائے اعتراض کرنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ فصلی علیہ کا معنی یہ ہے کہ اس کے لیے دُعا کی۔ لیکن اگر یہ بات تسلیم کی جائے تو نمازِ جنازہ سرے سے ختم ہو جاتی ہے کیونکہ میت سامنے رکھ کر صرف دُعا نہیں کی جاتی بلکہ جنازہ پڑھا جاتا ہے اور اس کے لیے فصلی علیہ کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

دوسرا موقعہ: آٹھ سال بعد شہدائے اُحد کا جنازہ۔ امام بخاری رحمہ اللہ باب الصلوۃ علی الشھید میں فرماتے ہیں:

((عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا فَصَلّٰى عَلٰى اَهْلِ اُحُدٍ صَلَاتَهٗ عَلَى الْمَيِّتِ ثُمَّ انْصَرَفَ اِلَى الْمِنْبَرِ

فَقَالَ اِنِّی فَرَطٌ لَکُم وَاَنَا شَهِیْدٌ عَلَیْکُمْ وَاِنِّی وَاللّٰهِ اَنْظُرُ اِلٰی حَوْضِیَ الْاٰنَ وَاِنِّی اُعْطِیْتُ مَفَاتِیْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ اَوْ مَفَاتِیْحَ الْاَرْضِ وَاِنِّی وَاللّٰهِ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمْ اَنْ تُشْرِکُوْا بَعْدِیْ وَلٰکِنْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ اَنْ تَنَافَسُوْا فِیْهَا.))

"عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ ایک دن نکلے اور آپ نے اُحد والوں پر اس طرح جنازہ پڑھا جس طرح آپ میت پر جنازہ پڑھتے تھے۔ پھر واپس آکر منبر کی طرف آئے اور فرمایا میں پہلے جاکر تمہاری ضروریات کا انتظام کرنے والا ہوں اور اللہ کی قسم اس وقت میں اپنا حوض دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئی ہیں اور اللہ کی قسم میں تمہارے متعلق اس بات سے نہیں ڈرتا کہ تم میرے بعد شرک کروگے لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم ایک دوسرے کے مقابلے پر دنیا میں رغبت کروگے" (صحیح بخاری اصح المطابع ج ۱ ص ۱۷۹)

مسند احمد، بیہقی اور دار قطنی میں اسی روایت میں یہ لفظ بھی ہے کہ آپ نے شہداء اُحد کا یہ جنازہ آٹھ سال بعد پڑھا۔ (احکام الجنائز)

اس حدیث سے شہید کا جنازہ ثابت ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسے باب الصلوۃ علی الشهید میں نقل فرمایا ہے۔

بعض لوگ جنہوں نے طے کر رکھا ہے کہ شہید کا جنازہ تسلیم ہی نہیں کرنا، اس حدیث کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبرستان میں جاکر شہداء اُحد کے لیے دُعا کی۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ آپ نے شہداء کا جنازہ پڑھا کیونکہ صلوۃ کا معنی دُعا بھی ہے۔ مگر حدیث کے الفاظ میں اس تاویل کی گنجائش ہی نہیں۔ الفاظ یہ ہیں ((فَصَلّٰی عَلٰی اَهْلِ اُحُدٍ صَلَاتَهٗ عَلَی الْمَیِّتِ)) یعنی آپ نے اُحد والوں پر اس طرح صلوۃ پڑھی جس طرح میت پر پڑھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے باقاعدہ ان کا جنازہ پڑھا تھا۔ امام شوکانی نے فرمایا کہ صَلَاتَهٗ عَلَی الْمَیِّتِ کے الفاظ اس تاویل کی تردید کرتے ہیں کہ صلوۃ سے مراد دُعا

ہے۔

(نیل الاوطار ص ۴۴' ج ۴)

علاوہ ازیں آپ کا یہ عمل صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ آپ میت کے دفن ہونے سے پہلے کسی وجہ سے جنازہ نہ پڑھ سکتے تو قبر پر جا کر صفیں بنا کر جنازہ پڑھتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ بَابُ الصَّلٰوةِ عَلَى الْقَبْرِ بَعْدَ مَا يُدْفَنُ میں اس سلسلہ میں دو واقعات ذکر فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

((قَالَ حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بْنُ مِنْهَالٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنِي سُلَيْمَانُ الشَّيْبَانِيُّ قَالَ سَمِعْتُ الشَّعْبِيَّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ مَنْ مَرَّمَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى قَبْرٍ مَنْبُوذٍ فَاَمَّهُمْ وَصَلَّوْا خَلْفَهُ قُلْتُ مَنْ حَدَّثَكَ هٰذَا يَا اَبَا عَمْرٍو قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ.))

"ہمیں حجاج بن منہال نے حدیث بیان کی۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمیں شعبہ نے حدیث بیان کی۔ انہوں نے فرمایا مجھے سلیمان شیبانی نے حدیث بیان کی انہوں نے فرمایا میں نے شعبی سے سنا۔ انہوں نے فرمایا مجھے اس شخص نے خبر دی جو نبی ﷺ کے ساتھ ایک الگ تھلگ قبر کے پاس سے گزرا تو نبی ﷺ نے ان کی امامت کروائی اور انہوں نے آپ کے پیچھے جنازہ پڑھا' سلیمان فرماتے ہیں میں نے شعبی سے کہا کہ اے ابو عمرو آپ کو یہ حدیث کس نے بیان کی تو انہوں نے فرمایا ابنِ عباس نے" (صحیح بخاری اصح المطابع ص ۱۷۸)

شارح صحیح بخاری حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے باب الاذن بالجنازہ میں اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ صحابی جن کی قبر پر آپ نے جنازہ پڑھا طلحہ بن براء بن عمیر البلوی تھے۔ دوسری حدیث :

((عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ اَسْوَدَ رَجُلًا اَوِ امْرَءَةً كَانَ يَكُوْنُ فِي الْمَسْجِدِ يَقُمُّ الْمَسْجِدَ فَمَاتَ وَلَمْ يَعْلَمِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَوْتِهِ فَذَكَرَهُ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ مَا فَعَلَ ذَالِكَ الْاِنْسَانُ قَالُوْا

مَاتَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَفَلَا آذَنْتُمُوْنِیْ فَقَالُوْا اِنَّہٗ کَانَ کَذَا وَکَذَا قِصَّتُہٗ فَقَالَ فَحَقَرُوْا شَاْنَہٗ قَالَ فَدُلُّوْنِیْ عَلٰی قَبْرِہٖ قَالَ فَاَتٰی قَبْرَہٗ فَصَلّٰی عَلَیْہِ))

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سیاہ مرد یا عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا تو وہ فوت ہو گیا اور نبی ﷺ کو اس کی وفات کا علم نہ ہو سکا۔ آپ نے ایک دن اسے یاد کیا اور فرمایا اس آدمی کا کیا ہوا؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ وہ فوت ہو گیا۔ آپ نے فرمایا تو تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔ انہوں نے کہا اس کا واقعہ اس طرح ہوا۔ غرض انہوں نے اس کے معاملے کو معمولی قرار دیا۔ آپ نے فرمایا مجھے اس کی قبر بتاؤ۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ اس کی قبر پر گئے اور اس کا جنازہ پڑھا۔" (صحیح بخاری' ص ۱۷۸)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ باب الاذن بالجنازۃ میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ عورت تھی اور اس کا نام امِ محجن (رضی اللہ عنہا) تھا۔

صحیح بخاری میں شہدائے اُحد کے آٹھ سال بعد جنازہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر پہلے فرصت نہ مل سکے تو کئی سال بعد بھی میت کا جنازہ پڑھا جا سکتا ہے جس میں شہید بھی شامل ہیں اور اگر وہ احادیث ثابت ہوں جن میں ذکر ہے کہ رسول اللہ نے اُحد کے موقع پر بھی شہداء کا جنازہ پڑھا تو آٹھ سال بعد جنازہ سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے جنازہ پڑھا ہو تو کئی سال بعد دوبارہ قبر پر بھی جنازہ جائز ہے۔

تیسرا موقعہ جنگِ اُحد کے موقع پر شہداء اُحد کا جنازہ ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ صحیح بخاری میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے کہ شہداء اُحد کا جنازہ رسول اللہ ﷺ نے نہیں پڑھایا۔ سیدنا انس سے بھی اس مفہوم کی روایت مروی ہے مگر جب دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح سند سے ثابت ہو جائے کہ آپ ﷺ نے اس موقعہ پر شہداء کا جنازہ پڑھا ہے تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ اصول ہے کہ ایک واقعہ کے متعلق جب ایک آدمی یہ بیان

کرے کہ یہ واقعہ نہیں ہوا اور دوسرے بیان کریں کہ یہ واقعہ ہوا ہے اور دونوں سچے ہوں تو اس شخص کی بات تسلیم کی جائے گی جو واقعہ ثابت ہونے کا راوی ہے۔ دوسرے کے متعلق سمجھا جائے گا کہ اسے علم نہیں ہو سکا۔ امام شوکانی فرماتے ہیں :

((وَاَیْضًا اَحَادِیْثُ الصَّلٰوۃِ قَدْ شَدَّ مَنْ عَضَدَھَا کَوْنُھَا مُثْبِتَۃً وَالْاِثْبَاتُ مُقَدَّمٌ عَلَی النَّفْیِ وَھٰذَا مُرَجِّحٌ مُعْتَبَرٌ))

"یعنی شہداءِ اُحد پر جنازہ پڑھنے کی احادیث کو قوی قرار دینے والوں کو اس بات سے مزید قوت حاصل ہوتی ہے کہ یہ احادیث جنازے کا اثبات کرتی ہیں اور اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے اور ترجیح کی یہ وجہ ایسی ہے کہ ماننی پڑتی ہے"

(نیل الاوطار ج ۴' ص ۴۴)

رہا یہ سوال کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ اور انس رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی سے یہ بات کیسے مخفی رہ گئی تو یہ کوئی بعید بات نہیں۔ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو لاحق ہونے والی پریشانی کی حالت میں تمام لوگ اگر جنازے پر نہ پہنچ سکے ہوں اور نہ انہیں اس بات کا علم ہوا ہو تو یہ ممکن ہے۔ خصوصاً سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ ہونا اور جنازے پر پہنچ نہ سکنا تو عین ممکن ہے کیونکہ وہ اُحد کے معرکے میں شریک ہی نہیں ہو سکے جیسا کہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے :

((وَ کَانَ جَابِرٌ قَدْ اَطَاعَ اَبَاہُ یَوْمَ اُحُدٍ وَقَعَدَ لِاَجْلِ اَخَوَاتِہٖ ثُمَّ شَہِدَ الْخَنْدَقَ وَبَیْعَۃَ الشَّجَرَۃِ))

"اور جابر رضی اللہ عنہ نے اُحد کے دن اپنے والد کی اطاعت کی تھی اور اپنی بہنوں کی وجہ سے گھر میں رہ گئے تھے۔ پھر خندق میں اور بیعت شجرہ (بیعت رضوان) میں حاضر ہوئے۔" (سیر اعلام النبلاء' ص ۱۹۰' ج ۳)

خود ان کا بیان ہے کہ میں والد صاحب کے منع کرنے کی وجہ سے بدر اور اُحد میں شریک نہیں ہوا۔ جب وہ شہید ہو گئے تو میں کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا۔

(صحیح مسلم' حدیث ۱۸۱۳)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بھی اس وقت صغیر السن تھے۔ اب دورِ حاضر کے معروف سلفی

محدث شیخ ناصر الالبانی حفظہ اللہ کی کتاب احکام الجنائز میں سے دو احادیث اور ان پر شیخ صاحب کے کلام کا ترجمہ نقل کرتا ہوں:

((عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ يَوْمَ اُحُدٍ بِحَمْزَةَ فَسُجِّيَ بِبُرْدَةٍ ثُمَّ صَلّٰى عَلَيْهِ فَكَبَّرَ تِسْعَ تَكْبِيْرَاتٍ ثُمَّ اُتِيَ بِالْقَتْلٰى يُصَفُّوْنَ وَيُصَلِّي عَلَيْهِمْ وَعَلَيْهِ مَعَهُمْ.))

"عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے دن حمزہ رضی اللہ عنہ کے متعلق حکم دیا تو انہیں ایک چادر کے ساتھ ڈھانپ دیا گیا پھر آپ نے ان پر جنازہ پڑھا اور ان پر نو تکبیریں کہیں۔ پھر دوسرے مقتول لائے گئے۔ وہ صفوں میں رکھے جاتے تھے اور آپ انکا جنازہ پڑھتے تھے اور ان کے ساتھ حمزہ کا جنازہ بھی پڑھتے تھے"۔

اسے طحاوی نے معانی الآثار (۱/۲۹۰) میں روایت کیا ہے اور اس کی اسناد حسن ہے۔ اس کے تمام راوی معروف ثقہ ہیں اور ابنِ اسحاق نے تحدیث کی تصریح کی ہے اور اس کے بہت سے شواہد ہیں جن میں سے کچھ شواہد میں نے (التعلیقات الجیاد) میں مسئلہ (۵۷) میں ذکر کیے ہیں۔ (احکام الجنائز وبدعھا' ص ۸۲)

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا وَقَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حَمْزَةَ اَمَرَ بِهٖ فَهُيِّئَ اِلَى الْقِبْلَةِ ثُمَّ كَبَّرَ عَلَيْهِ تِسْعًا ثُمَّ جَمَعَ اِلَيْهِ الشُّهَدَاءَ كُلَّمَا اُتِيَ بِشَهِيْدٍ وُّضِعَ اِلٰى حَمْزَةَ فَصَلّٰى عَلَيْهِ وَعَلَى الشُّهَدَاءِ مَعَهٗ حَتّٰى صَلّٰى عَلَيْهِ وَعَلَى الشُّهَدَاءِ اثْنَيْنِ وَسَبْعِيْنَ صَلَاةً))

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر (نمازِ جنازہ کیلئے) کھڑے ہوئے' ان کے متعلق حکم دیا تو ان کی تیاری کر کے انہیں قبلہ کی طرف رکھ دیا گیا پھر آپ نے ان پر نو تکبیریں کہیں پھر دوسرے شہداء کو انکے ساتھ اکٹھا کیا جب کوئی شہید لایا جاتا حمزہ کے ساتھ رکھ دیا جاتا۔ آپ اس پر اور

اس کے ساتھ دوسرے شہید پر جنازہ پڑھتے یہاں تک کہ آپ نے اس پر اور دوسرے شہداء پر بہتر دفعہ نمازِ جنازہ پڑھی۔"

اسے طبرانی نے اپنی معجم کبیر (۳/۱۰۷، ۱۰۸) میں محمد بن اسحاق کی سند سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں مجھے محمد بن کعب قرظی اور حکم بن عتیبہ نے مقسم اور مجاہد سے حدیث بیان کی ان دونوں نے ابنِ عباس سے بیان کیا۔

میں کہتا ہوں: یہ جید سند ہے۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اس میں محمد بن اسحاق نے تحدیث کی تصریح کی ہے تو ان کی تدلیس کا شبہ دور ہو گیا۔ شیخ البانی کا کلام بقدر ضرورت ختم ہوا۔ (احکام الجنائز و بدعها ص ۱۰۴، ۱۰۵)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شہید معرکہ کا جنازہ رسول اللہ ﷺ سے کئی احادیث سے ثابت ہے۔ اگر جنگِ اُحد کے موقع پر شہداء کے جنازہ والی احادیث کو صحیح تسلیم کیا جائے تو کوئی اشکال ہی نہیں رہتا اور اگر ان کی صحت پر اطمینان نہ بھی ہو تو گلے میں تیر لگنے سے شہید ہونے والے صحابی کا جنازہ اور شہداء اُحد پر آٹھ سال بعد جنازہ والی احادیث کے بعد شہدائے معرکہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

غائبانہ نماز جنازہ

کشمیر میں شہید ہونے والے بھائیوں کی غائبانہ نمازِ جنازہ درست ہے اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَعَی النَّجَاشِیَّ فِی الْیَوْمِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْهِ وَخَرَجَ بِهِمْ اِلَی الْمُصَلّٰی فَصَفَّ بِهِمْ وَكَبَّرَ عَلَیْهِ اَرْبَعَ تَكْبِیْرَاتٍ))

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کی موت کی اطلاع اس دن دی جس دن وہ فوت ہوا اور صحابہ کو لے کر جنازہ گاہ کی طرف نکلے ان کی صفیں بنائیں اور اس پر چار تکبیریں کہیں۔"

(صحیح البخاری اصح المطابع ص ۱۷۸)

اس سے غائبانہ نمازِ جنازہ کا ثبوت ملتا ہے اور جس شخص کا جنازہ میت حاضر ہونے کی صورت میں ہو سکتا ہے' غائب ہونے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ شہید کے جنازہ کے مسنون ہونے کے دلائل اوپر گزر چکے ہیں۔ بعض لوگ جنازہ غائبانہ کے سرے سے ہی منکر ہیں۔ یہ صرف نجاشی کے ساتھ خاص تھا کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ کے لیے زمین کے تمام پردے ہٹا دیئے گئے اور نجاشی کی میت آپؐ کے سامنے تھی اور آپؐ اسے دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ امام نووی نے المجموع (۲۵۳/۵ بحوالہ احکام الجنائز) میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ روایت خیالات میں سے ہے یعنی اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

رہا نجاشی کے ساتھ خاص ہونا تو یہ بات اس لیے درست نہیں کہ نبی ﷺ کا ہر فعل امت کے لیے نمونہ ہے ﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ ﴾ ہاں اگر کسی عمل کے متعلق آپ ﷺ نے خود وضاحت فرما دی کہ وہ آپؐ کے لیے خاص ہے تو الگ بات ہے اور یہاں آپؐ نے اس بات کی صراحت نہیں فرمائی۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ صرف اس شخص کا غائبانہ جنازہ درست ہے جس کا جنازہ اس علاقہ میں نہ پڑھا گیا ہو جہاں وہ فوت ہوا ہے۔ ان کا استدلال ان الفاظ سے ہے جو اسی حدیث کی بعض روایات میں آئے ہیں کہ اِنَّ اَخَا لَكُمْ قَدْ مَاتَ بِغَيْرِ اَرْضِكُمْ یعنی تمہارا ایک بھائی تمہارے علاقے سے باہر فوت ہو گیا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ نجاشی کا جنازہ وہاں نہیں پڑھا گیا تھا۔

ان حضرات کا علم و فضل مسلم ہونے کے باوجود حدیث کے الفاظ میں یہ صراحت کم از کم مجھے کہیں نہیں ملی کہ نجاشی کا جنازہ وہاں کسی نے نہیں پڑھا تھا۔ علاقہ غیر میں فوت ہونے سے یہ بات ضروری نہیں کہ وہاں کوئی بھی مسلمان موجود نہ ہو اور کسی نے بھی نجاشی کا جنازہ نہ پڑھا ہو۔ علاقے سے باہر فوت ہونے کی وجہ سے غائبانہ جنازہ پڑھنے کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے لیے وہاں پہنچنا مشکل ہے۔

بہرحال شہدائے کشمیر کا جنازہ غائبانہ اس لحاظ سے بھی درست ہے کہ وہ علاقہ

ہندوؤں کے تسلط میں ہے اور شہداء کی میتیں بعض اوقات کشمیری مسلمانوں کو دے دی جاتی ہیں اور وہ ان کا جنازہ پڑھتے ہیں۔ بعض اوقات انہیں دی ہی نہیں جاتیں کہ ان کا جنازہ پڑھا جا سکے۔ بلکہ بعض اوقات عام آبادی کے مشتعل ہونے کے خوف سے انہیں شہادتوں کی خبر ہی نہیں ہونے دی جاتی۔ خصوصاً بارڈر ایریا میں شہید ہونے والے بھائیوں کی میتیں تو ہندو آرمی حتی الوسع اٹھانے ہی نہیں دیتی۔ نہ ان پر جنازہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں شہدائے کشمیر کا جنازہ ان حضرات کے قول کے مطابق نجاشی کے جنازہ کے مطابق بھی مسنون ہے۔

اگر غور کیا جائے تو طلحہ بن براء رضی اللہ عنہ اور اُم محجن رضی اللہ عنہا کے جنازے ادا ہو چکنے کے باوجود ان کی قبر پر آپ کا جنازہ ادا کرنا اور شہداء اُحد کا جنازہ پڑھنے کے باوجود آٹھ سال بعد ان کی قبروں پر نمازِ جنازہ ادا کرنا بھی جنازہ غائبانہ ہی کی ایک صورت ہے کیونکہ میت تو نگاہوں سے غائب ہے۔ اسے حاضر کا جنازہ کس طرح کہا جا سکتا ہے اور جب نگاہوں سے ہی غائب ہو گیا تو پھر فاصلے کی کمی یا زیادتی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' نومبر/ ۱۹۹۶ء)

شہید کا جنازہ

س بعض لوگ کہتے ہیں کہ شہید ہونے والے کا نمازِ جنازہ پڑھنا بدعت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ کیا یہ بات درست ہے۔ قرآن و سنت کے دلائل سے وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ (ابوالحسن محمد حسین لاہور)

ج شہید کی نمازِ جنازہ پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ:

۱) شداد بن الہاد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' کہتے ہیں۔ ایک اعرابی اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا۔ مسلمان ہو کر کہنے لگا' میں آپ کے ساتھ ہجرت کروں گا۔ اللہ کے رسول نے اسے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے سپرد کر دیا۔ وہ ان کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔

غزوۂ خیبر میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوا' اس میں سے رسول اللہ نے اس کا حصّہ بھی نکالا اور اس کے ساتھیوں کو دے دیا۔ جب وہ بکریاں چرا کر واپس آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ حصّہ رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت میں سے تیرے لیے مقرر کیا ہے۔ وہ اس حصّہ کو لے کر رسول اللہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے آپؐ کی پیروی اس دنیاوی مال کے لئے نہیں کی تھی بلکہ اس لیے آپؐ پر ایمان لایا تھا کہ میری شہ رگ میں تیر لگے اور میں شہید کر دیا جاؤں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تو سچ کہتا ہے تو اللہ تجھے سچا کر دے گا۔ پھر وہ تھوڑی دیر ٹھہرے اور دشمن کے ساتھ قتال میں مشغول ہو گئے اور شہید ہوئے تو اسے اٹھا کر نبی کریم ﷺ کے پاس لایا گیا۔ اسے وہیں تیر لگا تھا جہاں اُس نے اشارہ کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے پوچھا' کیا یہ وہی ہے۔ کہا گیا' ہاں۔ آپؐ نے فرمایا' اُس نے اللہ کے ساتھ صدق سے معاملہ کیا تو اللہ نے بھی سچ کر دکھایا۔

((ثُمَّ كَفَّنَهُ النَّبِيُّ فِيْ جُبَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلَّى عَلَيْهِ فَكَانَ فِيْمَا ظَهَرَ مِنْ صَلَاتِهِ اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَبْدُكَ خَرَجَ مُهَاجِرًا فِيْ سَبِيْلِكَ فَقُتِلَ شَهِيْدًا اَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى ذٰلِكَ.))

"پھر نبی کریم ﷺ نے اسے اپنے جبہ میں کفن دیا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی تو آپؐ کی دُعا سے جو الفاظ ظاہر ہوئے' وہ یہ ہیں۔ اے اللہ! یہ تیرا بندہ تیرے راستے میں ہجرت کر کے نکلا اور شہادت کی موت سے مشرف ہوا میں اس پر گواہ ہوں"

(صحیح سنن النسائی' سنن الکبریٰ بیہقی ۴/۱۷۔۱۰' حاکم)

شیخ البانیؒ صاحب حفظہ اللہ فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے جس کے سب راوی مسلم کی شرط پر ہیں۔ سوائے شداد بن الہاد کے اور یہ معروف صحابی رسول ہیں۔

۲) عبداللہ بن زبیر کہتے ہیں :

((اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَوْمَ اُحُدٍ بِحَمْزَةَ فَسُجِّيَ بِبُرْدَةٍ ثُمَّ صَلّٰى عَلَيْهِ فَكَبَّرَ تِسْعَ تَكْبِيْرَاتٍ ثُمَّ اُتِيَ بِالْقَتْلٰى يَصُفُّوْنَ وَيُصَلِّيْ عَلَيْهِمْ

وَعَلَيْهِ مَعَهُمْ))

"رسول اللہ نے اُحد کے دن حمزہ بڑا ہو کو چادر سے ڈھانپنے کا حکم دیا۔ پھر رسول اللہ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی اور نو تکبیریں کہیں۔ پھر دوسرے شہداء کو لایا جاتا۔ آپ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھی اور ساتھ حمزہ کی بھی"۔ (معانی الآثار طحاوی)

شیخ البانی فرماتے ہیں' اس کے سب راوی ثقہ اور معروف ہیں اور محمد بن اسحٰق نے سماع کی تصریح کی ہے۔

۳) انس بن مالک کہتے ہیں' رسول اللہ ﷺ حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے۔ اُن کا مثلہ (ناک کان اور دوسرے ظاہری اعضاء کٹے ہوئے) کیا ہوا تھا۔ آپ نے حمزہ رضی اللہ عنہ کے سوا شہدائے اُحد میں سے کسی کا جنازہ نہیں پڑھا۔

(ابوداؤد' ترمذی' احمد' حاکم)

شیخ البانی فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے۔

یہ تین روایات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ شہید کی نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے۔ ٹھیک ہے بعض صحیح روایات میں یہ بھی موجود ہے کہ شہدائے احد کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی لیکن ان روایات میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ جن میں ہے کہ حمزہ کے سوا کسی کا نمازِ جنازہ نہیں پڑھا گیا۔ ان کی تطبیق اس طرح ہے کہ حمزہ رضی اللہ عنہ کی طرح مستقلاً ایک ایک کا جنازہ نہیں پڑھا گیا اور پھر یہ شریعت کا قاعدہ بھی ہے الاثبات مُقَدَّمٌ عَلَى النَّفْيِ ایک طرف کسی چیز کے ثبوت کی دلیل ہو اور دوسری طرف نفی کی تو ثبوت والی نفی والی پر مقدم ہوتی ہے۔ اب ہمارے اس مسئلہ میں بعض احادیث نماز جنازہ کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شہداء اُحد کی نماز جنازہ پڑھی اور بعض اس کی نفی کرتی ہیں تو اس قاعدے کے مطابق ان احادیث کو ترجیح ہو گی جو نمازِ جنازہ کے پڑھنے پر دلالت کر رہی ہیں پھر جو احادیث شہدائے اُحد پر نمازِ جنازہ کی نفی کرتی ہیں' وہ صرف دو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ ایک جابر بن عبداللہ اور دوسرے انس رضی اللہ عنہما۔ جبکہ انس رضی اللہ عنہ اس واقعہ کے

وقت چھوٹے بچے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہی دونوں صحابیٔ رسول (انس اور جابر رضی اللہ عنہما) اس واقعہ میں رسول اللہ کے نمازِ جنازہ پڑھنے کو بھی بیان کر رہے ہیں۔ جابر کی حدیث مستدرک حاکم میں ہے جبکہ انس کی حدیث ابوداؤد میں بھی ہے۔

بخاری شریف میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن گھر سے نکلے اور شہداءِ اُحد کا جنازہ آٹھ سال بعد پڑھا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہید کی نمازِ جنازہ پڑھنی چاہیے اگرچہ لمبی مدت گزرنے کے بعد پڑھی جائے۔ خلاصہ یہی ہے کہ شہید کی نمازِ جنازہ دوسرے فوت ہونے والوں کی طرح فرض نہیں۔ علامہ ابن القیم فرماتے ہیں:

((وَالصَّوَابُ فِي الْمَسْئَلَةِ أَنَّهُ مُخَيَّرٌ بَيْنَ الصَّلٰوةِ عَلَيْهِمْ وَتَرْكِهَا لِمَجِيءِ الْآثَارِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنَ الْأَمْرَيْنِ.))

"اور اس مسئلہ میں درست بات یہی ہے کہ شہید کا نمازِ جنازہ پڑھنے اور نہ پڑھنے میں اختیار ہے کیونکہ دونوں طرح کے آثار موجود ہیں"۔ (تہذیب السنن)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے دونوں امروں کا جواز نقل کیا ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

((وَلَا شَكَّ أَنَّ الصَّلٰوةَ عَلَيْهِمْ أَفْضَلُ مِنَ التَّرْكِ إِذَا تَيَسَّرَتْ لِأَنَّهَا دُعَاءٌ وَعِبَادَةٌ.))

"اس میں کوئی شک نہیں کہ شہداء کا نمازِ جنازہ پڑھنا نہ پڑھنے سے افضل ہے جب یہ میسر ہو کیونکہ یہ دُعا اور عبادت ہے۔" (احکام الجنائز، ص ۱۰۸)

شوکانی نے بھی شہید کی نمازِ جنازہ پڑھنے کو زیادہ پسند کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (مجلۃ الدعوۃ، اکتوبر/ ۱۹۹۵ء)

نمازِ جنازہ سری یا جہری؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ جو

نمازِ جنازہ اونچی قرأت سے پڑھتے ہیں اس کا اور آہستہ پڑھنے کا کیا ثبوت ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن و حدیث کی روشنی میں مفصل دیں۔

(شمشاد احمد سلفی' ڈی ٹائپ کالونی' فیصل آباد)

ج نمازِ جنازہ میں قرأت جہراً و سراً دونوں طرح درست ہے البتہ دلائل کی رُو سے سراً پڑھنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے۔ سری پڑھنے کے دلائل یہ ہیں :

۱) سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا :

((السُّنَّةُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ اَنْ يَقْرَأَ فِي التَّكْبِيرَةِ الْأُولٰى بِاُمِّ الْقُرْآنِ مَخَافَتَةً ثُمَّ يُكَبِّرَ ثَلَاثًا وَالتَّسْلِيمُ عِنْدَ الْآخِرَةِ.))

"نماز جنازہ میں سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ آہستہ آواز میں پڑھے' پھر تین تکبیریں کہے اور آخری تکبیر کے پاس سلام پھیرے"

(نسائی ۲۸۰/۱' المحلی ۱۲۹/۵' المجموع ۲۳۳/۵' شرح معانی الآثار للطحاوی ۲۸۸/۱)

یعنی تکبیر اولیٰ کے بعد سورۂ فاتحہ آہستہ پڑھے پھر باقی تکبیرات میں جیسا کہ دیگر احادیث میں صراحت ہے کہ دوسری تکبیر کے بعد درود پڑھے پھر تیسری تکبیر کے بعد دُعا پڑھے اور چوتھی تکبیر کے بعد سلام پھیر دے۔ بعض صحیح روایات میں چار سے زائد تکبیرات کا بھی ثبوت موجود ہے ملاحظہ ہو۔ احکام الجنائز للشیخ البانی حفظہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام ۲۳۹/۱' ۲۴۰ پر اور انہی کی سند سے امام بیہقی ۳۹/۴ پر اور امام ابن الجارود المنتقی (۲۶۵) پر لائے ہیں کہ ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں ہے۔

((اَنَّ السُّنَّةَ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ اَنْ يُّكَبِّرَ الْإِمَامُ ثُمَّ يَقْرَءُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ بَعْدَ التَّكْبِيرَةِ الْأُولٰى سِرًّا فِي نَفْسِهِ ثُمَّ يُصَلِّي عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيُخْلِصُ الدُّعَاءَ لِلْجَنَازَةِ فِي التَّكْبِيرَاتِ لَا يَقْرَأُ فِي شَيْءٍ مِنْهُنَّ ثُمَّ يُسَلِّمُ سِرًّا فِي نَفْسِهِ وَالسُّنَّةُ اَنْ يَفْعَلَ مَنْ وَرَاءَهُ مِثْلَمَا فَعَلَ اِمَامُهُ.))

"نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ امام تکبیر کہے۔ پھر پہلی تکبیر کے بعد سورۃ فاتحہ آہستہ آواز میں پڑھے۔ پھر (تکبیر کے بعد) نبی ﷺ پر درود پڑھے۔ پھر باقی تکبیروں میں میت کے لیے خلوص سے دعا کرے اور ان تکبیروں میں قرأت نہ کرے پھر آہستہ آہستہ سلام پھیرے اور سنت یہ ہے کہ مقتدی بھی وہ عمل کرے جو اس کا امام کرے۔"

اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَاَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُوْلُوْنَ بِالسُّنَّةِ وَالْحَقِّ اِلَّا لِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى.))

"یعنی اصحاب نبی ﷺ جب کسی مسئلہ کے بارے میں کہیں کہ یہ سنت اور حق ہے تو اس کا مطلب محض یہی ہوتا ہے کہ یہ سنت نبویؐ ہے۔ ان شاء اللہ"

ان احادیث سے معلوم ہوا نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ کی قرأت آہستہ کرنا مسنون ہے اور سِراً فِيْ نَفْسِهٖ مَخَافَتَةً کے الفاظ اس مسئلہ پر صراحت سے دلالت کرتے ہیں۔ اور جہری قرأت کرنے کا استدلال اس حدیث سے ہے کہ سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى جَنَازَةٍ فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهٖ وَهُوَ يَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ))

"رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازہ کی نماز پڑھائی میں نے آپ کی دعا سے یاد کرلیا۔ آپ کہہ رہے تھے اے اللہ اس کو بخش دے اور اس پر رحم کر اور اس کو عافیت و معافی سے نواز دے" (الحدیث)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابی نے آپ کے جنازہ پڑھانے سے یہ دعا حفظ کی اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب آپ نے جہری پڑھی ہو۔ بہرکیف سری پڑھنا حدیث سے صراحتاً اور جہری پڑھنا استدلالاً ثابت ہے' اس لیے آہستہ پڑھنا زیادہ قوی و بہتر

ہے۔ تفصیل کے لیے علامہ البانی حفظہ اللہ کی کتاب احکام الجنائز ملاحظہ کیجئے۔

(مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۶ء)

مُردہ پیدا ہونے والے بچے کا نمازِ جنازہ؟

س کیا بچہ مُردہ ناتمام پیدا ہو تو اس کا نمازِ جنازہ ہو جائے گا؟ یا نہیں۔ قرآن و حدیث سے واضح کریں۔ (محمد ابراہیم۔ راولپنڈی)

ج مُردہ یا ناتمام بچے کا نمازِ جنازہ ادا کرنا شرعاً مشروع و جائز ہے۔ حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

((عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الرَّاكِبُ يَسِيْرُ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَالْمَاشِيْ يَمْشِيْ خَلْفَهَا وَاَمَامَهَا وَعَنْ يَمِيْنِهَا وَعَنْ يَسَارِهَا قَرِيْبًا مِنْهَا وَالسِّقْطُ يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَيُدْعٰى لِوَالِدَيْهِ بِالْمَغْفِرَةِ وَالرَّحْمَةِ))

"مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سوار جنازہ کے پیچھے چلے اور پیدل آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں۔ اس سے قریب رہ کر چلیں اور ناتمام بچے پر بھی نماز پڑھی جائے اور اس کے ماں باپ کے لیے رحمت اور بخشش کی دُعا کی جائے"

(ابوداؤد (۳۱۸۰) ۳/۲۰۵' احمد (۱۷۷۰۹' ۱۷۷۱۶)' ۵/۳۰۲' ۳۰۴' حاکم ۱/۳۶۳)

علامہ البانی حفظہ اللہ احکام الجنائز ص ۸۱ میں لکھتے ہیں:

"اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ "ناتمام" سے مراد وہ بچہ ہے جس کے چار ماہ مکمل ہو چکے ہوں اور اس میں روح پھونکی گئی ہو۔ پھر وفات پائے۔ البتہ اس سے پہلے کی صورت میں اگر ساقط ہو جائے تو ادا نہیں کی جائے گی۔ اس لیے کہ وہ میت کہلا ہی نہیں سکتی۔ اس بات کی وضاحت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی اس مرفوع روایت سے ہوتی ہے:

((اِنَّ خَلْقَ اَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ يَكُوْنُ

عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ اِلَيْهِ مَلَكًا يَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ))

"یقیناً تمہاری تخلیق کا طریقہ کار یہ ہے کہ چالیس دن تک وہ ماں کے پیٹ میں نطفے کی شکل میں پڑا رہتا ہے۔ پھر اتنے ہی دن تک لوتھڑے کی شکل میں' پھر اتنے ہی دن تک بوٹی کی طرح رہتا ہے' پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے" (متفق علیہ)

لہٰذا جس بچے کے چار ماہ مکمل ہوں اور اس میں روح پھونکی گئی ہو' وہ ناتمام پیدا ہوا ہو تو اس کا نمازِ جنازہ ادا کیا جا سکتا ہے اور روح پھونکے جانے سے قبل ہی ساقط ہو جائے' اس کا نمازِ جنازہ ادا نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کو میت نہیں کہا جا سکتا۔ بعض علماء نے یہ شرط لگائی ہے کہ بچہ زندہ پیدا ہو خواہ ایک دفعہ ہی اس نے سانس لیا ہو اور اس کی دلیل یہ روایت پیش کرتے ہیں:

((اِذَا اسْتَهَلَّ السِّقْطُ صُلِّيَ عَلَيْهِ وَوُرِّثَ))

"جب بچہ پیدا ہونے والا چیخے تو اس کی نماز بھی پڑھائی جائے گی اور وہ وارث بھی ہو گا۔"

علامہ البانی حفظہ اللہ احکام الجنائز ص ۸۱ پر فرماتے ہیں یہ روایت ضعیف اور ناقابل حجت ہے۔ اس روایت کی تفصیل التلخیص الحبیر ۱۴۶/۶-۱۴۷ المجموع ۲۵۵/۵ اور "نقد التاج الجامع للاصول الخمسہ (۲۹۳) پر موجود ہے۔

(مجلّہ 'الدعوۃ' جنوری / ۱۹۹۶ء)

نمازِ جنازہ میں سلام ایک طرف پھیرا جائے یا دونوں طرف؟

س نمازِ جنازہ میں دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں۔ یہ عمل کیسا ہے؟ اہلحدیث عامل ہیں جبکہ دار قطنی' حاکم بیہقی نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طرف سلام پھیرنے کی روایت نقل کی ہے اور مسند شافعی میں سلام پھیرنے کا ذکر ہے مگر ایک یا دو کا ذکر نہیں وضاحت کریں۔ (ملفاق احمد سلفی مسئول طلباء امیرپور سادات)

ج نمازِ جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا بھی صحیح ہے اور دونوں طرف بھی۔ ایک طرف سلام پھیرنے والی جس حدیث کی طرف سائل نے اشارہ کیا ہے' وہ یہ ہے: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلّٰی عَلٰی جَنَازَۃٍ فَکَبَّرَ عَلَیْھَا اَرْبَعًا وَسَلَّمَ تَسْلِیْمَۃً وَّاحِدَۃً.))

"بے شک رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازہ پڑھا اس پر چار تکبیریں کہیں اور ایک سلام پھیرا" (دارقطنی ۱۹۱' حاکم ۱/۳۶۰)

امام حاکم نے اس حدیث کے بعد فرمایا:

"قَدْ صَحَّتِ الرِّوَایَۃُ فِیْہِ عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ وَعَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ وَعَبْدِ اللّٰہِ وَ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍ وَّجَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ وَ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی وَاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّھُمْ کَانُوْا یُسَلِّمُوْنَ عَلَی الْجَنَازَۃِ تَسْلِیْمَۃً وَّاحِدَۃً۔"

"سیدنا علی' سیدنا عبداللہ بن عمر' سیدنا عبداللہ بن عباس' سیدنا جابر بن عبداللہ' سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی اور سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہم سے صحیح روایات سے ثابت ہے کہ وہ جنازہ پر ایک سلام پھیرا کرتے تھے"

رہا یہ مسئلہ کہ عموماً جو جنازوں پر سلام پھیرا جاتا ہے وہ دونوں طرف ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((ثَلَاثُ خِلَالٍ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَفْعَلُھُنَّ تَرَکَھُنَّ النَّاسُ اِحْدَاھُنَّ التَّسْلِیْمُ عَلَی الْجَنَازَۃِ مِثْلَ التَّسْلِیْمِ فِی الصَّلَاۃِ))

"تین کام رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے جنہیں لوگوں نے ترک کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ نمازِ جنازہ پر اس طرح سلام پھیرنا جس طرح نماز میں سلام پھیرا جاتا ہے" (بیہقی ۴/۴۳)

امام نووی نے ۲۳۹/۵ پر اس کی سند کو جید قرار دیا ہے اور امام ہیثمی نے مجمع الزوائد ۳۴/۳ پر فرمایا رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ ثقات اس حدیث کو امام طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ ملاحظہ ہو احکام الجنائز ص ۱۲۷ اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم وغیرہ میں روایت ہے کہ:

((اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُسَلِّمُ تَسْلِيْمَتَيْنِ فِي الصَّلٰوةِ.))

"نبی اکرم ﷺ نماز میں دو سلام پھیرا کرتے تھے"۔

سیدنا ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انھوں نے نمازِ جنازہ کے متعلق جو فرمایا کہ اس پر نماز کی طرح سلام پھیرتے تھے تو وہ سلام دونوں طرف ہے۔ لہٰذا نمازِ جنازہ جو عموماً اہلِ حدیث اور دیگر حضرات دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں بالکل جائز درست ہے اور ایک طرف سلام پھیرنا بھی روا اور مشروع ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۶ء)

نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کرنا

س کیا نمازِ جنازہ کے بعد کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر دُعا کرنا قرآن و حدیث سے ثابت ہے ہمارے علاقے میں بریلوی حضرات نمازِ جنازہ کے بعد بیٹھ کر دُعا مانگتے ہیں اور اس پر دلیل یہ دیتے ہیں کہ سنن ابوداؤد میں حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ((اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَاَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَا)) "جب تم میت پر نمازِ جنازہ پڑھ چکو تو اس کے لیے خالص دُعا کرو"۔ اور مفتی احمد یار خان نے جاء الحق ۲۷۴ پر لکھا کہ ف سے معلوم ہوتا ہے کہ فوراً دُعا کی جائے اور اس میں صَلَّيْتُمْ شرط ہے اور فَاَخْلِصُوْا جزا ہے اور شرط اور جزا میں تغایر چاہیے نہ کہ جزاء شرط میں داخل ہو۔ پھر صَلَّيْتُمْ ماضی ہے اور فَاَخْلِصُوْا امر ہے۔ لہٰذا نماز پڑھ چکنے کے بعد ہی دُعا ہوگی۔ اس کی وضاحت بالتفصیل فرمائیں۔ (محمد اقبال' بھلوال)

ج نمازِ جنازہ ادا کرنے کا جو طریقہ کتب احادیث میں وارد ہے اس میں میت کے لیے دُعا کرنے کے دو مواقع کا ذکر ہے ایک دُعا نماز جنازہ کے اندر اور دسری دُعا قبر میں میت کو دفن کرنے کے بعد۔ نمازِ جنازہ کے بعد وہیں بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر دُعا کرنے کا جو رواج بریلویوں میں یا بعض دیوبندیوں میں پایا جاتا ہے اس کا ثبوت نہ اللہ کے رسول ﷺ سے ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ سے ہے۔ قرآنِ مجید سے اشارۃً میت کے لیے دُعا کے دو مواقع معلوم ہوتے ہیں جب آپؐ نے عبداللہ بن اُبي کا نمازِ جنازہ ادا کیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ :

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ﴾

(التوبہ : ۸۴)

"اے پیغمبر (ﷺ) ان میں سے کوئی مرجائے تو اس کی نمازِ جنازہ کبھی بھی ادا نہ کرنا اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہونا"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ خیر القرون میں نماز جنازہ ادا کرنے اور دفن کے بعد قبر پر دُعا کرنے کا طریقہ ضرور موجود تھا اور ان سے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حق میں آیت کے اندر صریحاً ممانعت کر دی۔

اگر کسی تیسری دُعا کا وجود ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس سے ضرور روک دیتے نماز جنازہ کے بعد دُعا کرنے سے تو فقہائے احناف نے بھی منع کیا ہے۔ جیسا کہ :

(۱) كَشْفُ الرَّمْزِ عَلَى الْكَنْزِ ۱۳۱ پر سید الحموی رقم طراز ہیں :

"لَا يَقُوْمُ بِالدُّعَاءِ بَعْدَ صَلٰوةِ الْجَنَازَةِ لِاَنَّهٗ يَشْبَهُ الزِّيَادَةَ فِي صَلٰوةِ الْجَنَازَةِ۔"

"نماز جنازہ کے بعد دُعا کو قائم نہ کرو اس لیے کہ یہ نمازِ جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے"

(۲) حاشیہ جواہر النفیس ص ۷۷ پر مرقوم ہے :

" لَا يَدْعُوْ بَعْدَ التَّسْلِيْمِ اَیْ وَلَا يَقُوْمُ الْاِمَامُ بِالدُّعَاءِ بَعْدَ صَلٰوةِ

الْجَنَازَةِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى كَذَا فِيْ مَجْمُوْعَةِ الْفَتَاوٰى۔"

"سلام کے بعد دُعا نہ مانگے یعنی امام نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کا قیام عمل میں نہ لائے۔ علمائے احناف کا اس پر فتویٰ ہے جیسا کہ مجموعۃ الفتاویٰ میں موجود ہے۔"

مندرجہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ حنفی علماء بھی اس دُعا کو ناجائز اور مکروہ سمجھتے تھے۔ سوال میں مذکور حدیث کا جو ترجمہ پیش کیا گیا۔ ساری خرابی اسی ترجمہ میں ہے۔

اس حدیث کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ:

جب تم نمازِ جنازہ پڑھو تو اس کے لیے خالص دُعا کرو............ نہ کہ جب تم نمازِ جنازہ پڑھ لو تو اس کے لیے خالص دُعا کرو۔ یہ ترجمہ تو حدیث کی رُوح کے خلاف ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ تو یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ جب میت پر نمازِ جنازہ ادا کی جائے تو نہایت ہی اخلاص کے ساتھ میت کے لیے دُعا مانگنی چاہیے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جنازہ تو بغیر اخلاص کے ساتھ پڑھ لو اور بعد میں اخلاص کے ساتھ دُعا کر لو۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل سے یہ اخلاص ثابت کیا ہے۔ جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک جنازہ پر رسول اللہ ﷺ نے یہ دُعا: ((اللھم اغفرلہٗ وارحمہ.)) الخ۔ اس رقت آمیز لہجہ میں کی کہ پیچھے کھڑے ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے کہ: فتمنیتُ ان اکون ھذا المیت میں نے تمنا کی کہ یہ میری میت ہوتی اور اللہ کے رسول ﷺ اس پر یہ دُعا کرتے۔

(مسلم ۱/۳۱۱' السنن الکبریٰ ۴/۳۹' مشکوٰۃ ۱/۱۴۵)

اسی طرح ایک صحابی سے نمازِ جنازہ ادا کرنے کا جو طریقہ کتاب الام ۱/۲۳۹' السنن الکبریٰ ۴/۳۹' المنتقی لابن جارود ۲۶۵ میں موجود ہے' اس میں یہ بھی ہے کہ:

نمازِ جنازہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ امام تکبیر کہے پھر پہلی تکبیر کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھے پھر (دوسری تکبیر کے بعد) نبی کریم ﷺ پر درود بھیجے پھر (تیسری تکبیر کے

بعد) ویخلص الدعا للجنازۃ جنازہ کیلئے خالص دُعا کرے پھر آہستہ سلام پھیر دے۔

اِس حدیث میں ویخلص الدعا للجنازۃ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دُعا نمازِ جنازہ کے اندر ہے نہ کہ فوراً وہاں بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر دُعا مانگی جائے اور جن محدثین رحمہم اللہ نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے ان میں سے امام ابنِ ماجہ رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں باب باندھا ہے کہ :

باب ما جاء فی الدعا فی صلوٰۃ الجنازۃ (سنن ابنِ ماجہ ۱/۴۸۰)

اسی طرح امام بیہقی نے بھی السنن الکبریٰ ۴/۲ پر یوں ہی تبویب کی ہے۔

مفتی احمد یار خاں نے جاء الحق ف اور شرط و جزا کے متعلق جو تحریر کیا ہے وہ سراسر باطل ہے کیونکہ ف میں جس طرح تاخیر و تعقیب زمانی ہوتی ہے ایسے ہی مرتبی بھی ہوتی ہے اور شرط و جزا میں جو تغایر کا ذکر ہے وہ مسلم ہے مگر یہ تغایر مختلف مقامات پر مختلف ہوتا ہے۔ کبھی یہ تغایر دو الگ الگ ذاتوں کا ہوتا ہے جیسا کہ ﴿ اذا طعمتم فانشروا ﴾ میں کھانا ایک الگ حقیقت ہے اور انتشار ایک الگ حقیقت ہے۔ کبھی یہ تغایرِ اطلاق و تقیید کا ہوتا ہے جیسا کہ اذا سئالتموھنّ متاعًا فاسئلاھن من وراء حجاب میں پہلا سوال جو جملہ شرطیہ میں مذکور ہے مطلق ہے اور جزاء میں جو سوال ہے وہ وراء حجاب سے مقید ہے۔ کبھی یہ تغایر جزو کل کا ہوتا ہے جیسے : ﴿ واذا قرأت القران فاستعذ باللّٰہ ﴾ میں قرأت قرآن کُل ہے اعوذ باللہ اس کُل کا جزو ہے۔ ایسے ہی اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا لہ الدعا میں نمازِ جنازہ ادا کرنا کُل ہے اور دُعا اس کُل کا جزو ہے جو نمازِ جنازہ کے اندر ہی ہو سکتی ہے۔ اس مسئلہ کی تفہیم کے لیے درج ذیل امثلہ پر غور کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿ واذا قرئ القران فاستمعوا لہ وانصتوا ﴾ اور جب قرآنِ مجید پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور چپ ہو جاؤ۔ اس آیت

میں ﴿ قُرِئَ ﴾ فعل ماضی ہے اور شرط ہے اور ﴿ فاستمعوا ﴾ امر ہے۔ اور یہ جزا ہے اس پر ف بھی داخل ہے تو مفتی صاحب کے مفروضہ کے مطابق اس کا ترجمہ یوں ہو گا کہ جب قرآنِ مجید پڑھ لیا جائے تو تم غور سے سنو اور چپ رہو یعنی تلاوت پہلے ہو جائے اور سنا اسے بعد میں جائے۔ اسی طرح ﴿ واذا قرات القران فاستعذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ﴾ (میں مذکورہ بالا تمام باتیں موجود ہیں) اس کا ترجمہ کیا یوں مناسب ہو گا : "جب تم قرآنِ مجید پڑھ لو تو ﴿ اعوذ باللہ من الشطین الرجیم ﴾ پڑھو۔ یعنی قراءتِ قرآن پہلے اور اعوذ باللہ بعد میں پڑھی جائے۔ اسی طرح ایک حدیث میں یوں آتا ہے کہ : ((واذالبستم فابدءوا بمیا منکم)) جب تم لباس پہنو تو دائیں طرف سے شروع کرو۔ مفتی صاحب کا ترجمہ یوں ہو گا کہ جب تم لباس پہن لو تو پھر دائیں جانب سے شروع کرو۔ اس قسم کی قرآنِ مجید اور احادیث میں بے شمار امثلہ موجود ہیں جن سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۲ء)

میت پر دُعا مانگنے کا نبوی طریق

(س) کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں جو واثلہ بن اسقع کی روایت میں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے میت پر پڑھا ((اَللّٰھُمَّ فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ)) الخ نبوی طریقہ کیا ہے کہ میت پر یہی الفاظ پڑھے جائیں جیسا کہ آپؐ نے پڑھا؟

یا میت کا نام لے کر یہ دُعا پڑھنی چاہیے؟ اگر سنت نبوی ﷺ نام لے کر پڑھنا ہے تو اس کا ثبوت کس کتاب میں ہے کہ آپؐ نے اس میت کا نام لے کے دُعا کی یا راوی نے غلطی سے فلان بن فلان کہا ہے؟ اگر نام نہ لیا جائے یہ الفاظ دُہرا دیئے جائیں تو کوئی حرج ہے؟ (عبدالوحید' امام مسجد ایبٹ آباد)

(ج) واثلہ بن اسقع کی روایت میں رسول اللہ ﷺ سے جو یہ الفاظ آئے

ہیں کہ اَللّٰھُمَّ اِنَّ فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ فِیْ ذِمَّتِكَ فَقِهِ عَذَابَ الْقَبْرِ ۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جنازہ میں یہ دعا میت کا نام لے کر پڑھنی چاہئے کیونکہ فلان بن فلان سے مراد ہی خاص شخص ہوتا ہے۔ صرف لفظ فلاں بن فلاں دہرا دینے کا کوئی فائدہ نہیں اس حدیث کے متعلق شیخ شمس الحق عظیم آبادی عون المعبود میں فرماتے ہیں :

"فِیْهِ دَلِیْلٌ عَلَی اسْتِحْبَابِ تَسْمِیَةِ الْمَیِّتِ بِاسْمِهٖ وَاسْمِ اَبِیْهِ وَهٰذَا اِنْ کَانَ مَعْرُوْفًا وَّاِلَّا جُعِلَ مَکَانَ ذٰلِكَ اَللّٰھُمَّ اِنَّ عَبْدَكَ اَوْ نَحْوَهٗ۔"

از : (ع ۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ' نومبر/ ۱۹۹۴ء)

قبر پر سورۂ بقرہ وغیرہ پڑھنا

س اس مسئلہ کی کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ حدیث میں آتا ہے؟

((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی الله عنهما قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صلی الله علیه وسلم یَقُوْلُ اِذَا مَاتَ اَحَدُکُمْ فَلَا تَحْبِسُوْهُ وَاَسْرِعُوْا بِهٖ اِلٰی قَبْرِهٖ وَلْیُقْرَأْ عِنْدَ رَأْسِهٖ فَاتِحَةُ الْبَقَرَةِ وَعِنْدَ رِجْلِهٖ بِخَاتِمَةِ الْبَقَرَةِ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ قَالَ وَاَیْضًا اِنَّهٗ مَوْقُوْفٌ))

اس حدیث کی وضاحت کریں کہ کیا یہ پڑھنا کسی صریح مرفوع حدیث سے ثابت ہے جبکہ دوسری طرف نبی مکرم ﷺ نے قبر پر قرآن پڑھنے سے منع کیا کہ قبروں کو عبادت گاہ نہ بنایا جائے۔ اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ گھروں میں سورۂ بقرۃ پڑھا کرو اور انہیں قبریں نہ بناؤ۔ برائے مہربانی اس کی وضاحت فرمائیں آپ کا شکریہ (سائل عبدالخالق)

ج آپ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جو روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا : "جب تم میں سے کوئی شخص فوت ہو جائے تو اسے روک

کر نہ رکھو اور اسے اس کی قبر کی طرف جلدی لے جاؤ اور اس کے سر کے پاس سورۂ بقرۃ کی ابتدائی آیات پڑھی جائیں اور اس کے پاؤں کے پاس سورۂ بقرہ کی آخیر آیات پڑھی جائیں۔ اس روایت کی وجہ سے یہ رواج عام پایا جاتا ہے کہ میت کی قبر کے سرہانے سورۂ بقرہ کی ابتدائی اور اس کے پاؤں کے پاس سورۂ بقرہ کی آخری آیات پڑھی جاتی ہیں۔ کئی اہل حدیث حضرات بھی اس پر عمل کرتے ہیں حالانکہ یہ روایت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ مشکوۃ کے باب دفن المیت میں اس روایت کے ساتھ لکھا ہے کہ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے یعنی ان کا اپنا قول ہے (رسول اللہ ﷺ کا فرمان نہیں)۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت نہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے نہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے۔ شیخ ناصر الدین البانی نے مشکوۃ کی تعلیق میں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب روایت کے متعلق لکھا ہے کہ اسے بیہقی کے علاوہ طبرانی نے معجم کبیر (۳/۲۰۸/۲) میں اور خلال نے کتاب القراء ت عند القبور (ق ۲۵/۲) میں بہت ہی ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس میں ایک راوی یحییٰ بن عبداللہ بن ضحاک بابلتی ہے جو ضعیف ہے۔ اس نے اسے ایوب بن نہیک سے روایت کیا ہے جسے ابوحاتم وغیرہ نے ضعیف کہا ہے اور ازدی نے کہا کہ وہ متروک ہے۔

مشکوۃ میں شعب الایمان سے بیہقی کا قول جو نقل کیا ہے کہ: "صحیح بات یہ ہے کہ یہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے" تو شعب الایمان میں مجھے بیہقی کے یہ الفاظ نہیں ملے۔ انہوں نے مرفوع روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے:

"لَمْ يُكْتَبْ اِلاَّ بِهٰذَا الْاَسْنَادِ فِيْمَا اَعْلَمُ وَقَدْ رُوِيْنَا الْقِرَاءَ ةَ الْمَذْكُوْرَةَ فِيْهِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ مَوْقُوْفًا عَلَيْهِ۔"

"دیکھیے شعب الایمان حدیث ۹۲۹۴ یعنی یہ مرفوع روایت میرے علم کے مطابق صرف اسی سند سے آئی ہے اور اس میں مذکور (سورۂ بقرۃ کی آیات کی) قرأت

ہمیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً روایت کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیہقی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی موقوف روایت کو صحیح نہیں کہا بلکہ صرف یہ ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً یہ روایت آتی ہے۔

از : (ع ۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ' نومبر/ ۱۹۹۴ء)

قبرستان میں قرآن پڑھنے کا حکم

قبرستان میں قرآن مجید پڑھنے کا سنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے مثلاً سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں قبرستان والوں کے لیے کیا کہوں تو آپ نے فرمایا تم کہا کرو :

((اَلسَّلَامُ عَلٰی اَھْلِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَیَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاْخِرِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ.))

صحیح مسلم کتاب الجنائز باب ما یقال عند دخول المقابر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر صرف سلام اور دُعا ہی سکھائی ہے۔ قرآن مجید کا کوئی حصہ پڑھنے کی تعلیم نہیں دی۔ اگر وہاں قرآن پڑھنا جائز ہوتا تو آپ کبھی نہ چھپاتے اور اگر آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کچھ بتایا ہوتا تو ہم تک بھی ضرور پہنچ جاتا مگر یہ کسی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔

اس کی مزید تاکید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ہوتی ہے کہ :

((لَا تَجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ مَقَابِرَ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ یَفِرُّ مِنَ الْبَیْتِ الَّذِیْ یُقْرَاُ فِیْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ))

"آپ نے فرمایا کہ اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ پس بیشک شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے" (صحیح مسلم' کتاب صلوۃ المسافرین باب استحباب صلاۃ النافلة فی بیته وجوازها فی المسجد)

اس سے معلوم ہوا کہ قبرستان سورۃ بقرۃ پڑھنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ حدیث

اس طرح ہے جس طرح دوسری حدیث میں فرمایا :

((صَلُّوْا فِیْ بُیُوْتِکُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا))

"اپنے گھروں میں نماز پڑھو اور انہیں قبریں نہ بناؤ" (صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها باب استحباب صلاۃ النافلة فی بیته وجوازها فی المسجد)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح قبرستان میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اسی طرح قبرستان میں قرآن مجید پڑھنا درست نہیں۔ از : (ع - ع)

قبروں پر مساجد تعمیر کرنا اور انھیں پختہ بنانا

س قبروں پر مساجد' قبے' گنبد بنانا اور انہیں پختہ کرنے کے متعلق وضاحت کریں کہ قرآن وسنت میں اس کا کیا حکم ہے؟ (محمد حنیف' کوٹلی افغاناں)

ج قبروں پر مساجد تعمیر کرنا' گنبد بنانا اور انہیں پختہ کرنا از روئے شریعت ممنوع و حرام ہے۔ قبروں کو مسجد بنانے کا معنی یہ ہے کہ قبروں کو سجدہ کرنا یا قبروں کی طرف منہ کر کے عبادت کرنا انہیں قبلہ سمجھنا ہے۔ امام ابنِ حجر ہیثمی اپنی کتاب "الزواجر عن اقتراف الکبائر" ۲۴۶/۱ پر لکھا ہے کہ "وَاتِّخَاذُ الْقَبْرِ مَسْجِدًا مَعْنَاهُ الصَّلَاةُ عَلَیْهِ اَوْ اِلَیْهِ" قبر کو مسجد بنانے کا معنی یہ ہے کہ اس پر نماز پڑھنا یا اس کو قبلہ بنا کر اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ہے۔ اس معنی کی تائید رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے کہ ((لَا تُصَلُّوْا اِلٰی قَبْرٍ وَّلَا تُصَلُّوْا عَلٰی قَبْرٍ)) طبرانی کبیر ۲/۱۴۵/۳ "نہ قبر کو قبلہ بنا کر نماز پڑھو اور نہ قبر پر نماز پڑھو"۔ یہود و نصاریٰ میں سے اگر کوئی نیک آدمی مرجاتا ہے تو وہ لوگ اس کی قبر پر عمارتیں تعمیر کر کے اور مساجد بنا کر عبادت کرتے تھے اور اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے آخری ایام میں فرمایا کہ :

((لَعَنَ اللّٰهُ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِهِمْ مَسَاجِدَ۔

قَالَتْ : فَلَوْلَا ذٰلِكَ لَأُبْرِزَ قَبْرُهٗ وَلٰكِنَّهٗ خُشِيَ اَنْ يُّتَّخَذَ مَسْجِدًا))

"اللہ تعالیٰ یہودیوں اور عیسائیوں پر لعنت کرے کہ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مسجدیں بنایا۔ سیدہ عائشہ نے کہا کہ اس خطرہ سے کہ کہیں آپ کی قبر کو مسجد کی شکل نہ دی جائے آپ کی قبر کھلی فضا میں نہ بنائی گئی"

(بخاری ۱۵۶/۳' ۱۹۸۔۱۱۴/۸' مسلم ۶۷/۲' مسند احمد' ۲۵۵/۶' ۱۲۱' ۸۰)

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ :

((اُولٰٓئِكَ اِذَا مَاتَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا ثُمَّ صَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ اُولٰٓئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

"جب ان (یہودیوں اور عیسائیوں) میں سے کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تو یہ لوگ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے تھے اس کے بعد نیک لوگوں کی تصویریں بنا کر اس میں لٹکا دیتے تھے یہی وہ لوگ ہیں جو قیامت کے دن اللہ کے ہاں بدترین مخلوق سمجھے جائیں گے۔"

(بخاری ۴۱۶/۱' مسلم ۶۶/۲' نسائی ۱۱۵/۱' بیہقی ۸۰/۴' مصنف ابن ابی شیبہ ۱۴۰/۴)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علماء' صلحاء' شہداء اور نیک لوگوں کی قبروں پر مسجدیں تعمیر کرنا یہود و نصاریٰ کا کام ہے۔

اور جو لوگ بزرگوں کی قبروں پر مساجد تعمیر کر کے وہاں عبادت کرتے ہیں ان کے تقرب کے حصول کے لیے نذر و نیاز تقسیم کرتے ہیں۔ انہیں مشکل کشا و حاجت روا سمجھتے ہیں یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے ہاں بدترین مخلوق ٹھہریں گے۔

قبروں کو پختہ بنانے اور ان پر گنبد تعمیر کرنے کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کی یہ حدیث ہے جسے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ :

((نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ.))

"رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ کرنے اور اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت تعمیر کرنے

سے منع فرمایا ہے"۔ (مسلم ۶۲/۳ (۹۸۰)' ترمذی ۱۵۵/۲' مسند احمد ۳۳۹'
۳۹۹/۳' شرح السنۃ ۴۰۵/۵' ابوداؤد ۲۱۶/۳)

مذکورہ بالا احادیث میں صراحتاً قبروں کو مساجد بنانے اور انہیں پختہ کرنے کی نہی و ممانعت مذکور ہے اور نہی اصلاً تحریم پر دلالت کرتی ہے لہٰذا قبروں پر گنبد بنانا انہیں پختہ کرنا' اور سجدہ گاہ بنانا ازروئے شریعت حرام و ممنوع ہے۔ (مجلّہ "الدعوة" جولائی / ۱۹۹۵ء)

قبر کی اُونچائی کی حد

س: میں نے ایک حدیث کافی مرتبہ پڑھی ہے کہ قبر زمین کے برابر ہونی چاہیئے جب کہ ہمارے پورے ملک میں تمام قبریں زمین کے اوپر بنی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں میری رہنمائی فرمائیں۔ (محمد جاوید خان' ناکھے پسرور)

ج: ہمارے علم میں کوئی ایسی حدیث نہیں جس میں یہ حکم ہو کہ قبر زمین کے برابر ہونی چاہیئے۔ شاید آپ کی مُراد صحیح مسلم کی وہ حدیث ہو جس میں ابوالہیاج اسدی بیان فرماتے ہیں کہ مجھے علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں اس کام پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا وہ یہ ہے کہ جو تصویر دیکھو' اسے مٹا دو اور جو اونچی قبر دیکھو اسے برابر کر دو"۔ مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اونچی قبر کو دوسری قبروں کے برابر کر دو۔ یہ نہیں کہ زمین کے برابر کر دو کیونکہ اگر قبر زمین کے برابر بنائی جائے تو ظاہر ہے قبر کا نشان باقی ہی نہیں رہے گا۔ پھر قبروں کی زیارت جس کی تلقین رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے' کیسے کی جائے گی؟ خود رسول اللہ ﷺ کی قبر زمین سے تقریباً ایک بالشت اونچی بنائی گئی ہے۔ چنانچہ صحیح ابنِ حبان میں ہے: جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے لحد (جو ایک طرف بنائی گئی ہے) بنائی گئی اس پر کچھ کچی اینٹیں نصب کی گئیں اور آپ کی قبر زمین سے تقریباً ایک بالشت بلند کی گئی۔ (حدیث ۲۱۶۰)

اس لیے مسنون طریقہ یہی ہے کہ قبر سے نکلنے والی ہی مٹی اوپر ڈالی جائے۔

اسے کوہان نما بنایا جائے اور مزید مٹی لا کر اسے اونچا نہ کیا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' جولائی / ۱۹۹۵ء)

میت کے لیے اظہارِ غم کی غیر شرعی شکلیں

س زید اہلحدیث تھا وہ فوت ہو گیا۔ اس کی اولاد نہ اہل حدیث ہے نہ ہی بریلوی۔ ان کے علاوہ دوسرے تمام رشتہ دار بریلوی ہیں جو کہ زید کی وفات پر تیسرے دن قل کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ زید کے بیٹے کچھ نہ کچھ اہل حدیثوں والا ذہن رکھتے ہیں اسلئے وہ قل' ساتے' چالیسویں وغیرہ کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے تیسرے دن بجائے قل کروانے کے ایک پروگرام بنایا جس میں ایک اہلحدیث عالم دین کو بلا کر تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کروائی اور بعد میں آنے والے مہمانوں کو کھانا کھلایا۔ جس پر کسی قسم کا ختم وغیرہ نہیں دیا گیا تھا۔ کیا دعوتِ دین کی غرض سے ایسا کرنا عالم کیلئے یا ورثاء کیلئے جائز ہے؟ کیا ایسی ہی دعوت کی غرض سے کوئی پکا اہلحدیث یا غیر اہلحدیث اس قسم کا پروگرام کروا سکتا ہے؟ (حافظ محمد انور عابد' بورے والا)

ج مرنے والے پر نوحہ خوانی جاہلیت کا عمل ہے۔ صحیح مسلم میں ابومالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں چار چیزیں جاہلیت کے کاموں میں سے ہیں جنہیں وہ نہیں چھوڑیں گے۔ ان میں سے ایک چیز نیاحة (بین کرنا) شمار فرمائی اور آپ نے فرمایا کہ نوحہ کرنے والی موت سے پہلے توبہ نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس پر گندھک کی قمیص اور خارش کا کرتہ ہو گا۔ (بخاری' مسلم' مشکوۃ باب البکاء علی المیت)

نوحہ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ میت کے دفن کے بعد میت کے گھر میں اجتماع کیا جائے اور کھانا تیار کیا جائے۔ مسند احمد میں جریر بن عبداللہ البجلی سے روایت ہے فرماتے ہیں:

"كُنَّا نَعُدُّ الْاِجْتِمَاعَ اِلٰى اَهْلِ الْمَيِّتِ وَصُنْعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهٖ مِنَ النِّيَاحَةِ۔"

"یعنی ہم (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میت کے گھر والوں کی طرف اکٹھ کرنا اور کھانا تیار کرنا نوحہ میں سے شمار کرتے تھے" (نیل الاوطار' ص ۹۷' ج ۴)

اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ سے صراحت آئی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قسم کے اجتماع اور کھانا تیار کرنے کو نوحہ (بین کرنا) شمار کرتے تھے۔ کیونکہ یہ بھی اظہارِ غم کی ایک مذموم صورت ہے جس میں اہل میت پر بے جا بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ کھانا تیار کرنے کی ناروا مشقت ڈالی جاتی ہے اور بلا ضرورت تمام کام چھوڑ کر اکٹھے ہونے کا بے جا اہتمام کیا جاتا ہے۔ غیر مسلموں کی دیکھا دیکھی برسی منانے کا سلسلہ بھی اظہارِ غم کی ایک ایسی ہی صورت ہے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں بلکہ خالص کفار کی رسم ہے۔ کفار کی کئی اور رسمیں مثلاً تیجا' ساتواں' دسواں' چالیسواں بھی مسلمانوں میں داخل ہو گئی ہیں۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ جو شخص ان رسوم میں حاضر نہ ہو اسے مطعون کیا جاتا ہے کہ اسے مرنے والے کا کوئی غم اور صدمہ نہیں۔ چنانچہ ملامت کے خوف سے مجبوراً لوگ ان رسموں میں پہنچتے ہیں۔

بعض لوگوں نے تو میت کے گھر اس قسم کے اجتماعات مثلاً تیجے' ساتویں' دسویں' چالیسویں اور برسی کو دین ہی بنا لیا ہے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان دنوں میں اس طریقے سے اکٹھ کرنا' کھانا پکانا' مولوی صاحب کا اس پر ختم پڑھنا' نوحہ کی ایک صورت ہونے کے علاوہ ہندوؤں کی نقالی ہے۔ اور ان دنوں میں وہ بھی اکٹھ کرتے اور کھانا تیار کرتے ہیں جس پر ان کے پنڈت باقاعدہ اپنی کتاب پڑھتے ہیں۔ ان حضرات کے علماء بھی ان کاموں کو کار ثواب قرار دینے کے لیے دلائل گھڑتے رہتے ہیں کیونکہ عوامی دین اختیار کر لینے کی وجہ سے ان کا کام یہ نہیں کہ قرآن و سنت کے ساتھ لوگوں کی رہنمائی کریں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ لوگوں نے جو رسوم اختیار کر لی ہیں' انہیں قرآن و سنت سے ثابت کریں۔ خواہ ان کا قرآن و سنت سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔

بعض لوگ جو کسی اہلحدیث گھر میں پیدا ہو گئے مگر اتباعِ سنت سے اپنے آپ کو آراستہ نہ کر سکے' نہ بدعت سے اجتناب کا جذبہ قائم رکھ سکے عجیب مشکل میں گرفتار ہیں۔ ان رسوم میں شریک ہوتے ہیں تو اتباعِ سنت کا آبائی شرف ہاتھ سے جاتا ہے۔ شریک نہیں تو اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتے کہ جاہلانہ رسوم میں مبتلا حضرات کی ملامت برداشت کر سکیں۔ یہ لوگ ان رسوم کو جائز کرنے کے لیے حیلے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک حیلہ یہ ہے جو آپ نے ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ تیسرے دن مولوی صاحب کی تقریر کروا لیتے ہیں اور ساتھ کھانا کھلا دیتے ہیں۔ حالانکہ اس موقعہ پر میت والوں کے ہاں اکٹھ کرنا' کھانا تیار کرنا اظہارِ غم کی ایک صورت ہے جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نوحہ خوانی میں شمار کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس موقع پر کبھی اس قسم کا اجتماع کیا ہے نہ کھانے کا اہتمام کیا ہے۔

عورتوں میں یہ کام مردوں سے بھی زیادہ ہے حتیٰ کہ بعض اہلحدیث مدارس کی مقررہ خواتین باقاعدہ اس قسم کی مجالس میں شریک ہوتی ہیں اور اپنے خیال میں لوگوں کو قل اور ختم کی بدعات سے بچاتی ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ وہ دوسروں کو بدعت سے بچاتے بچاتے خود ایک بہت بڑے گناہ میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ کیونکہ اس پر اجتماع اور کھانا نوحہ کی ایک قسم ہے اور بجائے خود ایک عبادت ہے۔

ہاں کسی کی موت کی خبر آنے پر اس کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کر کے بھیجنا سنت ہے کیونکہ اس وقت گھر والے غم واندوہ کی وجہ سے کھانا پکانے کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتے۔

((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اصْنَعُوْا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَقَدْ اَتَاهُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ))

"عبداللہ بن جعفر فرماتے ہیں کہ جب جعفر رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر آئی تو رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا کہ جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کے پاس ایسی چیز آئی ہے جس نے انہیں مشغول کردیا ہے۔"

(رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجه (مشکوۃ باب البکاء علی المیت)

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

وَاُحِبُّ لِجِيْرَانِ الْمَيِّتِ اَوْ ذِيْ قَرَابَةٍ اَنْ يَّعْمَلُوْا لِاَهْلِ الْمَيِّتِ فِيْ يَوْمِ يَمُوْتُ وَلَيْلَتِهٖ طَعَامًا يُّشْبِعُهُمْ فَاِنَّ ذٰلِكَ سُنَّةٌ وَّذِكْرٌ كَرِيْمٌ وَّهُوَ مِنْ فِعْلِ اَهْلِ الْخَيْرِ قَبْلَنَا وَبَعْدَنَا لِاَنَّهٗ لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ ((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اجْعَلُوْا لِاٰلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَاِنَّهٗ جَاءَهُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ.))

"یعنی میں میت کے رشتہ داروں کے لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ میت کی وفات کے دن اس کے گھر والوں کے لیے اس دن اور اس کی رات کے لیے اتنا کھانا تیار کریں جس سے وہ سیر ہو جائیں۔ کیونکہ یہ سنت ہے اور اچھی یاد ہے۔ اور یہ ہم سے پہلے اور پچھلے اہل خیر کا عمل ہے کیونکہ جب جعفر رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر آئی تو رسول اللہ نے فرمایا آلِ جعفر کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کے پاس وہ چیز آئی ہے جس نے انہیں مشغول کردیا ہے" (کتاب الام ص ۳۱۷' ج ۱)

اس حدیث سے اس دن میت کے گھر والوں کے پاس آنے والے مہمانوں کا کھانا تیار کر کے بھیجنے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنے لیے کھانا تیار نہیں کر سکتے تو مہمانوں کے لیے کھانا کیسے تیار کر سکیں گے۔ مگر اس حدیث کا مروجہ قل ساتویں وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں نہ ہی کھانا تیار کر کے جلسے کے نام پر تعزیتی ماتمی اجتماع کا کوئی تعلق ہے۔ میت کے گھر والوں کے پاس تعزیت کے لیے جانا بھی مسنون ہے مگر اس کے لیے باقاعدہ اجتماع کرنا اور اس کا دن مقرر کرنا درست نہیں۔ قدرتی طور پر جیسے جیسے لوگ آتے جائیں تعزیت کر کے واپس چلے جائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ میت کے گھر میں اس قسم کا اجتماع اور کھانا نوحہ خوانی میں

شامل ہے اور درحقیقت ماتمی اجتماع ہے۔ اس لیے اس میں شریک ہونا جائز نہیں۔ خواہ تبلیغ دین کے بہانے سے ہو کیونکہ ناجائز کام کو دین کی تبلیغ کا ذریعہ سمجھنا درست نہیں جیسے کہ آج کل اقامت دین کی دعوے دار جماعتیں قوالی' تصویر کشی' موسیقی' بھنگڑے' ڈرامے' یوم پیدائش' برسی وغیرہ کو اپنے خیال میں اقامت دین کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ دعوت و تبلیغ کی صرف وہی صورتیں جائز ہیں جن میں کوئی شرعی قباحت نہ پائی جائے۔ بلند مقاصد کے لیے ذرائع بھی صاف ستھرے ہونے چاہئیں۔ از : (ع۔ع) (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۴ء)

اہل میت کے لیے کھانا پکانا

س وفات کے وقت طعام کا بندوبست کن لوگوں کی طرف سے ہونا چاہئے اور کتنے دنوں کے لیے ہونا چاہئے۔ نیز موجودہ رائج سسٹم کس حد تک درست ہے؟ (حافظ محمد زاہد' فیصل آباد)

ج جس گھر میں فوتیدگی ہو جائے تو ان کے طعام کا بندوبست میت کے قریبی رشتہ داروں یا پڑوسیوں کو کرنا چاہئے کیونکہ حدیث میں آتا ہے :

((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِصْنَعُوْا لِاٰلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَقَدْ اَتَاهُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ))

"عبداللہ بن جعفر نے کہا کہ جب جعفر رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر آئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو ان کے پاس ایسی چیز آئی ہے جو ان کو مشغول رکھے گی۔" (مستدرک حاکم ۱/۳۷۲' ابوداؤد ۲/۵۹' ترمذی ۲/۱۳۷)

اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے تلخیص میں ان کی موافقت کی ہے۔ امام ابنِ سکن نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ یعنی سیدنا جعفر غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے جب انکی شہادت کی خبر آئی تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کہا کہ

جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ وہ تو پریشانی میں مبتلا ہیں' کھانا نہیں پکا سکیں گے۔ اس کھانے کو عام لوگوں کے لیے دعوت کی صورت بنا لینا درست نہیں ہے اور نہ ہی میت کے گھر والوں کو لوگوں کے لیے کھانا تیار کرنا چاہئے بلکہ یہ ان کے عزیز و اقارب کا حق ہے۔ جیسا کہ سیدنا جریر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ :

((كُنَّا نَرَى الْاِجْتِمَاعَ اِلٰى اَهْلِ الْمَيِّتِ وَصُنْعَةَ الطَّعَامِ مِنَ النِّيَاحَةِ))

"ہم اہل میت کے ہاں جمع ہونا اور وہاں کھانا تیار کرنا نوحہ شمار کرتے تھے"

(ابنِ ماجہ ۱/ ۵۱۳ (۱۶۱۲) احمد حدیث نمبر ۶۹۰۵' ۱۲۵/۱۱' ۱۲۶ پر ان الفاظ سے یہ روایت مروی ہے :

((كُنَّا نَعُدُّ الْاِجْتِمَاعَ اِلٰى اَهْلِ الْمَيِّتِ وَصَنِيْعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهٖ مِنَ النِّيَاحَةِ.))

"ہم اہل میت کے ہاں جمع ہونا اور میت کے دفن کے بعد وہاں کھانے کا انتظام کرنا نوحہ شمار کرتے تھے" اور نوحہ شریعت میں حرام ہے۔

شیخ احمد محمد شاکر مسند احمد کے حاشیہ پر اس کی یوں شرح کرتے ہیں کہ :

وَالْمُرَادُ بِصُنْعَةِ الطَّعَامِ هُنَا : مَا يَصْنَعُهٗ اَهْلُ الْمَيِّتِ لِضِيَافَةِ الْوَارِدِيْنَ لِلْعَزَاءِ زَعَمُوْا فَاِنَّ السُّنَّةَ اَنْ يَّصْنَعَ النَّاسُ الطَّعَامَ لِاَهْلِ الْمَيِّتِ لَا اَنْ يَّصْنَعُوْهُمْ لِلنَّاسِ لِقَوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.... اِصْنَعُوْا لِاٰلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا

صُنْعَةُ الطَّعَامِ کا مطلب یہ ہے کہ اہل میت ان لوگوں کے لیے جو ان کے ہاں تعزیت کے لیے آتے ہیں کھانا تیار کریں.... حالانکہ سنت یہ ہے کہ لوگ اہل میت کے لیے کھانا تیار کریں نہ اہل میت لوگوں کے لئے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو کہا تھا کہ آلِ جعفر کے لیے کھانا تیار کرو۔ علامہ ابنِ ہمام نے فتح القدیر ۱/ ۴۷۳ میں ایسے کھانے کے متعلق لکھا ہے کہ "هِيَ بِدْعَةٌ قَبِيْحَةٌ"

یہ قبیح بدعت ہے۔ اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ اور دیگر محدثین کا اتفاق ہے جیسا کہ الفتح الربانی ۸/ ۹۰ میں مرقوم ہے۔

البتہ جو مہمان دور دراز سے تعزیت کے لیے آتے ہیں ان کے لیے کھانے کا بندوبست کرنا درست ہے کیونکہ وہ اہل میت کے طعام کے ضمن میں ہی آتے ہیں۔

اور ہمارے ہاں جو برادری سسٹم رائج ہے اس میں یہ خرابی ہے کہ یہ کھانا عوض و معاوضہ بن چکا ہے اور جتنی دیر تک اس کھانے کا عوض نہ دیا جائے اتنی دیر تک برادری والے اس کو قرض سمجھتے ہیں۔ ہمیں یہ خرابی دور کر کے صحیح سنت کے مطابق کام کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ آمین (مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۴ء)

مرنے کے بعد میت کو کن کاموں کا اجر ملتا ہے؟

س: مرنے کے بعد انسان کو کن چیزوں کا ثواب جاتا ہے۔ جو آج کل رواج بن چکا ہے گھروں میں سپارے دیئے جاتے ہیں پڑھانے کے لیے اور پھر ان سپاروں کا ثواب مردے کو دیا جاتا ہے۔ پھر روٹی بھی کپڑے بھی۔ گویا مردے کے نام کے دیئے جاتے ہیں ثواب کے لیے۔ میں ایک بات بتاؤں کہ جناب میری دادی بھی اہل حدیث ہے اس کا بڑا بیٹا فوت ہو چکا ہے اس کو فوت ہوئے ۳ سال ہو گئے ہیں لیکن آج تک وہ اس کے نام کی روٹی اور کپڑے وغیرہ دیتی ہے اگر میں منع کروں تو میرے والد صاحب مجھے سختی سے ڈانٹتے ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہر چیز مردے کو جاتی ہے۔ اگر تم نے کسی کو کہا کہ کچھ نہیں جاتا مردے کو تو میں تمہیں مار دوں گا۔ قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں کہ ان سب چیزوں کا ثواب مردے کو جاتا ہے؟ (عبدالحفیظ مغل)

ج: جواب پڑھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ عبادات میں معتبر وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ کے مطابق ہو۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ اپنے خطبوں میں یہ پڑھا کرتے تھے:

((فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَشَرُّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))

"یقیناً بہترین حدیث اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت محمد ﷺ کی ہدایت ہے اور معاملات میں سے برے (دین میں) نئے ایجاد کردہ ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

(رواہ مسلم' مشکوۃ کتاب الایمان' باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

اور نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے :

((خَيْرُ أُمَّتِيْ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ...))

"میری امت میں سے بہتر زمانہ میرا ہے اور پھر جو ان کے بعد آئیں اور پھر جو ان کے بعد ہے (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ)"

(متفق علیہ' مشکوۃ باب مناقب الصحابہ)

ابنِ مسعود فرمایا کرتے تھے :

((مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ فَإِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ أُولٰئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا أَفْضَلَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَأَبَرَّهَا قُلُوْبًا... فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوْا عَلٰى آثَارِهِمْ تَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ أَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ فَإِنَّهُمْ كَانُوْا عَلٰى هُدًى مُسْتَقِيْمٍ))

"تم میں سے جو کوئی کسی طریقے کو اختیار کرنے والا ہے وہ ان کے طریقے کو اختیار کرے جو فوت ہو چکے ہیں کیونکہ زندوں سے فتنہ کا خوف رہتا ہے اور وہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ تھے جو اس امت میں سب سے افضل... ان کی فضیلت کو پہچانو اور ان کے آثار کی پیروی کرو اور اپنی استطاعت کے مطابق ان کی سیرت اور اخلاق کو اپناؤ وہ بالکل سیدھے راستے پر تھے" (مشکوۃ کتاب الاعتصام ۳۲/۱)

جو چیز دلائل سے ثابت ہے اور ان قرون مفضلہ میں موجود تھی وہ یہ ہے کہ انسان جب دنیا سے فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے جیسا کہ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے :

((وَإِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ))

"کہ جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کے عملوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے"

اب کیا مرنے کے بعد کسی دوسرے کے عمل یا اپنے بعض کیے ہوئے عملوں کا ثواب اسے پہنچتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میت زندہ افراد کی کوشش اور محنت پر دو وجوہات سے مستفید ہوتی ہے۔ پہلی وجہ وہ ہے جس کا سبب یہ اپنی زندگی میں بن گیا تھا اور اس میں اہل سنت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے :

((وَإِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاَثٍ صَدَقَةٌ جَارِيَةٌ أَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُوا لَهُ أَوْ عِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهِ مِنْ بَعْدِهِ))

"کہ جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال اس سے منقطع ہو جاتے ہیں (یعنی کسی کا ثواب اسے نہیں ملتا) مگر تین چیزیں ہیں (جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی اسے ملتا رہتا ہے) ایک صدقہ جاریہ ہے' دوسری نیک اولاد ہے جو اس کے لیے دعا کرتی ہے اور تیسری چیز علم ہے جس سے لوگ اس کے جانے کے بعد فائدہ اٹھا رہے ہیں" (رواہ مسلم ۵/ ۷۳' الادب المفرد ص ۷' ابوداؤد و نسائی احمد بیہقی)

نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والا اگر ان میں سے کوئی چیز چھوڑ جاتا ہے تو اسے مرنے کے بعد بھی فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے :

((رِبَاطُ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَّقِيَامِهِ وَإِنْ مَّاتَ أُجْرِيَ عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِيْ كَانَ يَعْمَلُهُ وَأُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ وَأَمِنَ الْفَتَّانَ))

"ایک دن اور ایک رات اللہ تعالیٰ کے راستے (جہاد فی سبیل اللہ) میں پہرہ دینا

ایک مہینے کے روزے اور راتوں کو قیام کرنے سے افضل ہے اور اگر وہ شخص اسی حالت میں فوت ہو جاتا ہے تو اس کے لیے اس کے وہ سارے عمل جاری رکھے جائیں گے جو اس حال میں وہ کرتا تھا۔ یعنی جتنے عمل وہ کرتا تھا سب کا اجر اور ثواب اس کے مرنے کے بعد بھی اسی طرح اس کو ملتا رہے گا"۔

(رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الجہاد، ص ۳۴۹)

اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ عَمَلٍ يَنْقَطِعُ عَنْ صَاحِبِهِ إِذَا مَاتَ إِلَّا الْمُرَابِطُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَإِنَّهُ يُنْمِي لَهُ عَمَلُهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ.))

"مرنے کے بعد انسان سے ہر عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے راستے میں پہرہ دینے والا، اس کے عمل اس کے لیے قیامت تک بڑھائے جاتے ہیں (یعنی قیامت تک اسے ان اعمال کا اجر ملتا رہے گا)"

(المعجم الكبير للطبراني بسند صحيح)

دوسری وجہ جس سے مرنے والے کو فائدہ پہنچتا ہے وہ ہے دوسرے مسلمان کا ان کے لیے دُعا کرنا ان کی طرف سے حج اور صدقہ خیرات کرنا اسی طرح ان کے لیے استغفار کرنا ان چیزوں سے بھی میت مستفید ہوتی ہے کیونکہ ان سب چیزوں کے دلائل قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ استغفار کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ ﴾ (الحشر: ١٠)

"اور وہ لوگ جو ان (اہل ایمان) کے بعد آئے (دُنیا میں وہ ایمان کی حالت میں) کہتے ہیں (دعا کرتے ہوئے) اے اللہ! ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ایمان کی حالت میں (تیرے پاس) ہم سے پہلے پہنچ چکے ہیں۔"

اور حدیث رسول ﷺ بھی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((لَمَّا نَعَى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّجَاشِيَّ صَاحِبَ الْحَبَشَةِ فِي الْيَوْمِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اِسْتَغْفِرُوْا لِاَخِيْكُمْ))

"کہ جس دن حبشہ کا حاکم نجاشی فوت ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس کی موت کی خبر سنائی اور کہا اپنے بھائی کے لیے بخشش طلب کرو"

(البخاری' کتاب الجنائز باب الصلوۃ علی الجنائز بالمصلی والمسجد)

اس آیت کریمہ اور حدیثِ نبوی ﷺ سے معلوم ہوا کہ استغفار سے میت مستفید ہوتی ہے۔ دُعا کی دلیل نمازِ جنازہ کی عام احادیث اور اس طرح جو قبروں کی زیارت کی احادیث ہیں سب اس چیز پر دال ہیں۔ عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں :

((سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ رَجُلٍ مُّسْلِمٍ يَّمُوْتُ فَيَقُوْمُ عَلٰى جَنَازَتِهٖ اَرْبَعُوْنَ رَجُلًا لَّا يُشْرِكُوْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا شَفَّعَهُمُ اللّٰهُ فِيْهِ.))

"کوئی مسلمان آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس پر چالیس آدمی نماز جنازہ پڑھیں جو اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش (دُعا) کو اس کے بارے میں قبول کر لیتا ہے"

(مسلم' کتاب الجنائز' باب من صلی علیہ اربعون شفعوا فیہ)

اور جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے نبی کریم ﷺ جب قبرستان جاتے تو یہ دُعا پڑھتے :

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاْخِرِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ))

"ان گھروں (قبروں) میں رہنے والے مومنو! اور مسلمانو! تم پر سلامتی ہو اللہ تعالیٰ تمہارے پہلے آنے اور بعد میں آنے والوں پر رحم کرے۔ یقیناً ہم بھی اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں"۔ (مسلم' کتاب الجنائز' باب ما یقال عند دخول القبور والدُّعا لاھلھا)

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں :

((اَسْئَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ.))

"میں اللہ سے تمہارے لیے اور اپنے لیے عافیت کا سوال کرتا ہوں"۔

رحم کی دُعا اور عافیت کا سوال کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ میت اس سے مستفید ہوتی ہے۔

صدقے کی دلیل : صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ :

((اَنَّ رَجُلاً جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اُمِّي افْتُلِتَتْ نَفْسُهَا وَلَمْ تُوْصِ وَاَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ اَفَلَهَا اَجْرٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ))

"نبی کریم ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا کہ میری والدہ اچانک فوت ہو گئی اور اُس نے کوئی وصیت نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ مرتے وقت بات کر سکتی تو صدقہ ضرور کرتی۔ کیا میں اس کی طرف سے صدقہ کروں؟ اور کیا اُسے اِس پر اَجر ملے گا؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہاں!" (صحیح بخاری و مسلم)

اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ سعد بن عبادہ کی والدہ وفات پا گئیں اور وہ وہاں موجود نہیں تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگے

((اِنَّ اُمِّي مَاتَتْ وَكُنْتُ غَائِبًا عَنْهَا فَهَلْ يَنْفَعُهَا اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟ قَالَ : نَعَمْ.))

"کہ میری والدہ فوت ہو گئی اور میں وہاں موجود نہیں تھا۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اسے اس صدقہ کا نفع پہنچے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ہاں!" (بخاری)

فرض روزہ کا ثواب بھی میت کو پہنچتا ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں :

((مَنْ مَّاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهٗ))

"کہ جو شخص فوت ہو گیا اور اس کے ذمے روزے تھے تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے" (مسلم' کتاب الصیام باب قضاء الصیام عن المیت)

حج کی دلیل : ایک عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میری والدہ نے حج کی نذر مانی تھی لیکن حج کرنے سے پہلے فوت ہو گئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا :

((اَرَاَیْتِ لَوْ کَانَ عَلٰی اُمِّكِ دَیْنٌ؟ أَاَنْتِ قَاضِیَتُهٗ؟ قَالَتْ : نَعَمْ قَالَ فَاللّٰهُ اَحَقُّ بِالْقَضَاءِ))

"کہ مجھے بتاؤ اگر تمہاری والدہ پر کسی کا قرض ہوتا تو اس قرض کو ادا کرتی؟ اُس نے کہا ہاں ضرور کرتی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تو پھر اللہ تعالیٰ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کا قرض ادا کیا جائے" (بخاری)

یہ چند چیزیں ہیں جو شریعت سے ثابت ہیں کہ میت کے مرنے کے بعد ان سے فائدہ پہنچتا ہے ان کے علاوہ دوسری اشیاء لوگوں نے ایجاد کر رکھی ہیں۔ قل' تیجا' ساتواں' چالیسواں وغیرہ ان کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں اور یہ سب کام بدعت کے زمرہ میں ہیں۔ اگر ان چیزوں کا ثواب بھی میت کو پہنچتا ہوتا اور یہ میت کے لیے مفید ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ ضرور بیان کر دیتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ضرور اس پر عمل کرتے لیکن یہ چیزیں نہ تو رسول کریم ﷺ سے ثابت ہیں اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسی نے ان کو اختیار کیا تھا بلکہ یہ چیزیں تو ہندو اور دوسری غیر مسلم قوموں سے مسلمانوں میں آ گئی ہیں۔

باقی رہا قرآن مجید پڑھ کر اس کا ثواب میت کو بخشنا تو اس بارہ میں بعض علماء کی رائے ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں لیکن شرعاً کسی صریح اور مرفوع حدیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ قرآن پڑھنے کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں یہ چیزیں موجود نہیں تھیں اور نہ ہی نبی کریم ﷺ کے بعد خیر القرون میں یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ میں اس کا کوئی رواج تھا۔ اگر یہ اچھا کام ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے ضرور بالضرور سرانجام دیتے اور یہ بات مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقرب صرف ان اعمال سے حاصل ہو سکتا ہے جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں قیاس

اور آراء کو اس جگہ دخل نہیں کیونکہ یہ توقیفی امر ہے۔ علامہ عز بن عبدالسلام فرماتے ہیں :

" وَمَنْ فَعَلَ طَاعَةً لِلّٰهِ تَعَالَى ثُمَّ اَهْدَى ثَوَابًا اِلَى حَيٍّ اَوْ مَيِّتٍ لَمْ يَنْتَقِلْ ثَوَابُهَا اِلَيْهِ اِذْ ﴿ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ (النجم) فَاِنْ شَرَعَ فِي الطَّاعَةِ نَاوِيًا اَنْ يَّقَعَ عَنِ الْمَيِّتِ لَمْ يَقَعْ اِلَّا فِيْمَا اِسْتَثْنَاهُ الشَّرْعُ كَالصَّدَقَةِ وَالصَّوْمِ وَالْحَجِّ وَالدُّعَاءِ وَالْاِسْتِغْفَارِ۔"

"کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا کوئی کام کیا پھر اس کا ثواب میت یا زندہ کو دے دیا اللہ کی اطاعت کا ثواب اسے ہرگز نہیں پہنچے گا کیونکہ قرآن میں ہے کہ انسان کے لیے صرف وہی چیز ہے جس کی اُس نے کوشش کی۔ اگر کسی اطاعت کی ابتداء اس نیت پر کی کہ اس کا ثواب فلاں میت کو مل جائے تو یہ میت کی طرف سے واقع ہی نہیں ہو گی۔ ہاں وہ چیزیں جن کو شریعت نے مستثنیٰ قرار دیا ہے جیسے صدقہ' روزہ' حج' دُعا' استغفار وغیرہ (ان کا ثواب ہے) اور قرأت قرآن کو کہیں بھی مستثنیٰ نہیں کیا" (احکام الجنائز' ص ۱۷۴)

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" لَمْ يَكُنْ مِنْ عَادَةِ السَّلَفِ اِذَا صَلَّوْا تَطَوُّعًا وَصَامُوْا وَحَجُّوا وَقَرَؤُا الْقُرْاٰنَ اَنَّهُمْ كَانُوْا يُهْدُوْنَ ثَوَابَهُمْ اِلَى الْاَمْوَاتِ اِنَّمَا كَانُوْا يَدْعُوْنَ لَهُمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لَهُمْ فَلَا يَنْبَغِيْ لِلنَّاسِ اَنْ يَّعْدِلُوْا عَنِ الطَّرِيْقِ السَّلَفِ فَاِنَّهُ اَفْضَلُ وَاَكْمَلُ۔"

"سلف کی یہ عادت نہیں تھی کہ وہ نفلی نماز پڑھنے روزہ رکھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کے بعد اس کا ثواب میت کو پہنچاتے ہوں وہ تو ان کے لیے دُعا کرتے اور بخشش مانگتے تھے لوگوں کے لائق نہیں ہے کہ وہ سلف کا طریقہ چھوڑ دیں کیونکہ یہی طریقہ افضل اور زیادہ کامل ہے۔"

(فتاویٰ ابنِ تیمیہ ج ۲۴' ص ۲۲۲' ۲۲۳)

بعض علم سے کورے لوگ قرآن خوانی کے جواز کے لیے ایک حدیث پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا :

((اِقْرَؤُا عَلٰی مَوْتَاکُمْ سُوْرَۃَ یَاسِیْنَ)) (رواہ ابوداؤد)

حالانکہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ثابت ہی نہیں ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ابوعثمان اپنے باپ سے بیان کرتا ہے اور یہ باپ بیٹا دونوں ہی مجہول راوی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حدیث موقوف اور مضطرب بھی ہے۔ پھر آج کل لوگوں نے جو رواج بنایا ہوا ہے کہ قرآن خوانی کے لیے اجرت پر قراء اور دوسرے لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔ اس فعل کو تو اہل علم و دانش میں کسی نے بھی اچھا اور مستحسن قرار نہیں دیا۔ علامہ ناصرالدین البانی حفظہ اللہ فرماتے ہیں :

" مِنْ بِدَعِ التَّعْزِیَۃِ اِعْطَاءُ الدَّرَاھِمِ لِمَنْ یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ عَلٰی رُوْحِ الْمَیِّتِ اَوْیُسَبِّحُ اَوْیُھَلِّلُ۔"

"جو میت کی روح کے لیے قرآن خوانی یا ذکرو اذکار پر پڑھنے والے کو پیسے دیئے جاتے ہیں یہ بھی تعزیت کی بدعات میں سے ہے"۔

جو مرنے والا اپنی زندگی میں کوئی ایسا عمل کر جاتا ہے جو صدقہ جاریہ کے زمرے میں آتا ہے تو اس کا ثواب بھی اس کو پہنچتا رہتا ہے' کسی کے نام پر صدقہ دینے والی اس میں کوئی بات نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو قرآن و سنت کو سمجھنے اور اس پر کاربند ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ از : (ع ۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ' دسمبر/ ۱۹۹۴ء)

میت کو دیکھ کر کھڑے ہونا؟

س کیا میت کو دیکھ کر کھڑے ہو جانا چاہیے یا بیٹھے رہنا چاہیے؟ قرآن و سنت کی رُو سے وضاحت فرمائیں۔ (محمد اکرم' ٹیکسلا)

ج نبی ﷺ نے مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست کی جب بنیاد رکھی تو

اس کے مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ کئی احکام نازل ہوئے۔ کئی ایسے تھے جن پر پہلے عمل تھا لیکن بعد میں ان میں تغیر و تبدل ہوا۔ مثال کے طور پر پہلے آپؐ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ پھر آپؐ کی دلی خواہش پر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اسی طرح شروع شروع میں شراب کی کلی ممانعت نہ تھی لیکن بعد میں اس کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔ اسی طرح پہلے جب آپؐ کے پاس سے کوئی جنازہ گزر جاتا تو آپؐ اسے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ یہودی اور یہودیہ کی میت کے لیے بھی کھڑے ہوئے۔ جب آپؐ کو کہا گیا کہ آپؐ یہودی کے جنازہ کے لیے کھڑے ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا' کیا اس میں جان نہ تھی۔

(بخاری ۱/۱۷۵' مسلم ۱/۳۱۰)

آپؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی فرمایا' جب تم جنازہ دیکھو تو اس کے لیے کھڑے ہو جایا کرو۔ اور جو ساتھ چل رہا ہو' وہ اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک اسے زمین پر نہ رکھ دیا جائے۔ (بخاری ۱/۱۷۵' مسلم ۱/۳۱۰)

لیکن اس کے بعد نبی ﷺ کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ جیسا کہ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ((قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِجَنَازَةٍ ثُمَّ جَلَسَ فَجَلَسْنَا)) اور ابوداؤد میں یہ لفظ ہیں: ((كَانَ يَقُوْمُ فِي الْجَنَائِزِ ثُمَّ جَلَسَ بَعْدُ)) مسلم ۳/۵۹' ابنِ ماجہ ۱/۴۶۸' احمد (۶۳۱' ۱۰۹۴' ۱۱۶۷)' موطا ۱/۲۳۲' ابوداؤد ۲/۶۴)

رسول اللہ ﷺ جنازے کے لیے کھڑے ہوئے تو ہم بھی کھڑے ہوئے۔ پھر آپؐ بیٹھ گئے ہم بھی بیٹھ گئے۔ موطا اور ابوداؤد کی روایت میں یہ ہے کہ آپؐ جنازوں کے لیے کھڑے ہوتے تھے پھر بعد میں بیٹھ گئے۔

واقد بن عمرو بن سعد بن معاذ نے کہا' میں بنو سلمہ کے ایک جنازہ میں حاضر ہوا۔ میں کھڑا ہوا تو نافع بن جبیر نے کہا بیٹھ جایئے۔ میں تمہیں عنقریب اس کے متعلق حدیث بتاؤں گا۔ پھر بیان کیا کہ مجھے مسعود بن الحکم الزرقی نے بتایا کہ انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں کہتے ہوئے سنا' وہ فرما رہے تھے:

((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَنَا بِالْقِيَامِ فِى الْجَنَازَةِ ثُمَّ جَلَسَ بَعْدَ ذٰلِكَ وَاَمَرَنَا بِالْجُلُوْسِ.))

"آپ نے ہمیں جنازہ کے لیے کھڑے ہونا کا حکم دیا تھا اس کے بعد آپ بیٹھے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔"

(احمد ۶۲۷' بیہقی ۲۷/۴' کتاب الاعتبار للحازی ۹۱)

اِن احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری کتاب الجنائز ص ۴۶ پر اور علامہ البانی حفظہ اللہ احکام الجنائز ص ۷۷ پر لکھتے ہیں کہ قیام پہلے مشروع تھا بعد میں منسوخ ہو گیا۔ اور علامہ شوکانی نے امام مالک' امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب' نسخ کا نقل کیا ہے۔ جبکہ امام احمد' امام اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہما کا عدمِ نسخ کا۔ یعنی یہ لوگ نسخ کے قائل نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جواز کے طور پر ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' جنوری / ۱۹۹۶ء)

الزَّكٰوةِ

زکوٰۃ کے احکام

س: زکوٰۃ کی شرعی حیثیت اور اس کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہے' کتنے مال پر زکوٰۃ فرض ہے اور مصارفِ زکوٰۃ کتنے ہیں؟ علاوہ ازیں صدقہ فطر کی وضاحت بھی کریں۔

ج: زکوٰۃ اسلام کا تیسرا بنیادی رکن ہے جس کی فرضیت قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ صریحہ سے ثابت ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ ﴾

(البقرہ : ۴۳)

"نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو"

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكَاةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (توبہ : ۵)

"پس جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو' ان کو پکڑلو اور ان کا محاصرہ کرو اور ہر مقام پر ان کی گھات میں بیٹھے رہو پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں' زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو (یعنی جنگ بند کر دو) بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار و مشرکین اگر ایمان کا دعویٰ کریں۔ اسلام قبول کریں تب بھی ان سے جنگ بند نہیں ہو گی تاوقتیکہ وہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد ہی وہ مسلم برادری میں شامل ہو سکتے ہیں اور رشتہ اخوت میں منسلک رہ سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو وہ اس رشتہ سے محروم رہتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ○ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكَاةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَنُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ ﴾ (التوبہ : ۱۰،۱۱)

”وہ کسی مومن کے بارے میں نہ قرابت کالحاظ کرتے ہیں' نہ عہد کا اور یہی لوگ ہیں حد سے بڑھنے والے۔ پھر اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں ہم آیات کھول کھول کربیان کرتے ہیں۔“

لفظ زکوٰۃ دو معنوں میں مستعمل ہے (۱) بڑھنا (۲) پاک و صاف ہونا۔

سال گزارنے کے بعد جو حصہ بطور فرض ادا کیا جاتا ہے ان ہی دو معنوں کے پیش نظر اسے زکوٰۃ کہتے ہیں کیونکہ ادائیگی زکوٰۃ کرنے والے کی نیکیاں بڑھتی ہیں۔ درجات بلند ہوتے ہیں۔ مال کی طہارت ہوتی ہے اور اس میں اللہ کی طرف سے برکت پیدا ہوتی ہے اور زکوٰۃ دہندہ خود گناہ اور بخل سے بچ جاتا ہے اور اس کا مال غرباء فقراء و مساکین وغیرہ کا حق نکل جانے کی وجہ سے خبث و حرام سے پاک ہو جاتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾ (التوبہ)

”(اے نبی ﷺ) زکوٰۃ لے کران کے جان ومال کا تزکیہ کرواوران کوپاک وصاف بنادو“۔

زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی حقیقتاً مالی عبادت ہے اور اسے اگر واقعاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کو اجتماعی زندگی میں معاشرے کے اندر ریڑھ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کی بنیاد ہے۔ شریعت اسلامی نے چار قسم کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے :

۱) بہائم۔ چارپائے جانور اونٹ گائے بکری وغیرہ

۲) سونا چاندی نقود اور زیورات وغیرہ

۳) ہر قسم کا وہ تجارتی مال جس میں تجارت شرعاً جائز ہے

۴) زمین کی پیداوار، اجناس، خوردنی پھل وغیرہ

چونکہ شریعت نے زکوٰۃ مالداروں پر فرض کی ہے تاکہ ان کے مال کا کچھ حصہ ہر سال غرباء و مساکین کی ضروریات پر صرف کیا جا سکے لہٰذا ہر قسم کے مال سے زکوٰۃ کا نصاب مقرر کیا گیا۔ مذکورہ بالا چار قسم کے مال کا نصاب درج ذیل ہے:

۱) بہائم: اونٹوں کا نصاب پانچ اونٹ ہے۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ فِيْ مَا دُوْنَ خَمْسِ ذُوْدٍ صَدَقَةٌ مِنَ الْإِبِلِ.))

پانچ سے کم اونٹوں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ پانچ تا نو اونٹ پر ایک بکری زکوٰۃ ہے۔ ۱۰ تا ۱۴ پر ۲ بکریاں، ۱۵ تا ۱۹ پر تین بکریاں، ۲۰ تا ۲۴ پر ۴ بکریاں، ۲۵ تا ۳۵ پر ایک سالہ اونٹنی الی آخرہ۔

گائیوں کا نصاب: گائیوں کا نصاب تیس گائیں ہیں جامع ترمذی ۱/۱۹۵ اور مستدرک حاکم ۱/۳۹۸ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو انہیں حکم دیا:

((وَاَمَرَهُ اَنْ يَّأْخُذَ مِنَ الْبَقَرِ مِنْ كُلِّ ثَلَاثِيْنَ بَقَرَةً تَبِيْعًا.))

"کہ ہر تیس گائیوں پر ایک سال کا بچھڑا زکوٰۃ میں لے"

یعنی ۳۰ سے کم گائیوں میں زکوٰۃ نہیں اور جب ۳۰ گائیں ہوں ان پر ایک سالہ بچھڑا زکوٰۃ ہے اور ۴۰ پر ایک گائے جس کے دو دانت نکل آئے ہوں اسی طرح ہر ۳۰ پر ایک سالہ بچھڑا اور ہر ۴۰ پر ایک گائے دو دانت والی۔

۲) چاندی اور سونے کا نصاب:

((عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا كَانَتْ لَكَ مِائَتَا دِرْهَمٍ وَّحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ يَعْنِيْ فِي الذَّهَبِ حَتّٰى يَكُوْنَ لَكَ عِشْرُوْنَ دِيْنَارًا

وَّحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ فَفِيْهَا نِصْفُ دِيْنَارٍ))

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو ان پر زکوۃ پانچ درہم ہوگی اور جب تمہارے پاس بیس دینار سونا ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس میں نصف دینار زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے"۔ (ابوداؤد' کتاب الزکوۃ نیل الاوطار ۴/۱۸)

اس کے علاوہ کتب احادیث میں بے شمار ایسی روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چاندی کے لیے ۲۰۰ درہم اور سونے کے لیے ۲۰ دینار نصاب متعین فرمایا ہے اور ان پر زکوۃ کے واجب ہونے کے لیے ایک سال کا عرصہ شرط قرار دیا۔ اور اس بات پر عموماً اتفاق ہے کہ ہمارے ہاں رائج اوزان کے مطابق ۲۰۰ درہم چاندی کا وزن ساڑھے باون تولے ہے اور ۲۰ دینار سونے کا وزن ساڑھے سات تولہ سونا ہے۔

نوٹ: نقد روپیہ کا نصاب ۲۰۰ درہم یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہے اس وقت چاندی کی قیمت فی تولہ ۴۸.۵۰ روپے ہے اور ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت ۲۵۴۶.۲۵ روپے ہے لہٰذا جس شخص کے پاس اتنی مالیت ہو' اس پر سال کا عرصہ گزر جائے تو اسے اس نقدی پر اڑھائی فیصد کے اعتبار سے زکوۃ دینی چاہیے۔

۳) **زیورات پر زکوۃ**: سونے اور چاندی کے زیورات پر بھی زکوۃ دینی چاہیے' جب وہ نصاب کو پہنچ جائیں۔ شریعت نے جب سونے اور چاندی پر زکوۃ فرض کی ہے اور سونے چاندی کے زیور بھی سونا چاندی ہیں ان کو کسی نص قطعی نے زکوۃ سے مستثنیٰ نہیں کیا۔ آپ نے زیورات پر زکوۃ نہ دینے پر بڑی وعید بیان کی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی اور اس کی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے دو موٹے موٹے کنگن تھے۔ آپ نے پوچھا:

((اَتُعْطِیْنَ زَکٰوۃَ ھٰذَا؟ قَالَتْ : لَا قَالَ اَیَسُرُّكِ اَنْ یُّسَوِّرَكِ اللّٰهُ بِهِمَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ سِوَارَیْنِ مِنْ نَّارٍ؟))

"کیا تم ان کی زکوۃ بھی دیتی ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تمہیں پسند ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے بدلے میں تمہیں آگ کے کنگن پہنائے۔"

اس عورت نے یہ بات سنتے ہی کنگن اتار کر آپ کے سامنے رکھ دیئے اور کہا میں نے یہ دونوں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کی راہ میں دے دیئے۔

(صحیح نسائی ۲۲۲۴، صحیح ابوداؤد ۱۵۶۳)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا، ایک روز رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور ہاتھ میں چاندی کی چوڑیاں دیکھیں اور پوچھا، عائشہ رضی اللہ عنہا یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ (زیور) میں نے آپ کی خاطر حصولِ زینت کے لیے بنائے ہیں۔ آپ نے فرمایا :

((اَتُؤَدِّیْنَ زَکَاتَهُنَّ؟ قُلْتُ لَا اَوْ مَا شَاءَ اللّٰهُ قَالَ : حَسْبُكِ مِنَ النَّارِ))

"کیا ان کی زکوۃ ادا کرتی ہو؟ میں نے کہا نہیں یا ماشاء اللہ کہا۔ آپ نے فرمایا : پھر آگ کی سزا تجھے یہی کافی ہے" (صحیح ابوداؤد ۱۵۶۵، دارقطنی)

امام حاکم نے بھی اس حدیث کو مستدرک میں بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ زیورات کی زکوۃ ادا کرنی چاہیے اور یہ ضروری ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سعید بن مسیب، عطاء، سعید بن جبیر، عبداللہ بن شداد، سیحون بن مہران، مجاہد، جابر بن زید، زہری، سفیان ثوری، ابنِ منذر، عبداللہ بن مبارک، ابوحنیفہ وغیرہ کا یہی موقف ہے اور امام شافعی سے بھی ایک قول اسی طرح مروی ہے۔ اس کے برعکس امام مالک، اسحٰق بن راہویہ، شعبی وغیرہ کا موقف ہے کہ زیورات میں زکوۃ واجب نہیں۔ اور ان کا استدلال قیاس اور بعض آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہے لیکن صحیح

اور راجح مسلک پہلا ہے اور صحیح و صریح احادیث اس کی تائید کرتی ہیں اور آپ کی صحیح حدیث کے مقابلے میں کسی کی بات حجت نہیں۔

مال تجارت پر زکوۃ: ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ﴾ (البقرہ : ۲۶۷)

"اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے بہترین چیز خرچ کرو"

امام مجاہد سے بسند صحیح تفسیر طبری ۵/۵۵۶ میں مروی ہے کہ یہ آیت تجارت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور امام بخاری نے بھی اس آیت سے اموال تجارت میں زکوۃ کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ (الزکوۃ واحکامہا للغاوجی' ص ۴۳)

((عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : فِی الْاِبِلِ صَدَقَتُهَا وَفِی الْغَنَمِ صَدَقَتُهَا وَفِی الْبَقَرِ صَدَقَتُهَا وَفِی الْبُزِّ صَدَقَتُهٗ))

" سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اونٹوں پر زکوۃ' بکریوں پر زکوۃ' گائیوں پر زکوۃ اور تجارت کے کپڑے پر زکوۃ ہے"

(دار قطنی ۲/۱۰۲' مستدرک حاکم' بیہقی)

((عَنْ اَبِیْ عَمْرِو بْنِ حِمَاسٍ عَنْ اَبِیْهِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ اَبِیْعُ الْاَدَمَ وَالْجِعَابَ فَمَرَّ بِیْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ فَقَالَ اَدِّ صَدَقَةَ مَالِكَ فَقُلْتُ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِنَّمَا هُوَ الْاَدَمُ قَالَ قَوِّمْهُ ثُمَّ اَخْرِجْ صَدَقَتَهٗ))

"ابو عمرو بن حماس رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں چمڑا اور تیر کے ترکش فروخت کرتا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس سے گزرے تو فرمایا اپنے مال کی زکوۃ ادا کرو میں نے عرض کیا اے امیر المؤمنین یہ تو فقط چمڑا ہے' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کی قیمت لگاؤ اور اس کی زکوۃ ادا کرو" (الشافعی ۱/۲۳۶' عبدالرزاق (۶۹-۷۰)' دار قطنی ۲۱۳' کتاب الاموال لابی عبید ۴۲۵' بیہقی ۴/ ۱۴۷' المجموع

۴۴/۶)

مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ مال تجارت سے بھی زکوٰۃ نکالنی چاہیے۔ مال تجارت کا نصاب شرح نقدی کا ہی نصاب ہے یعنی حاضر وقت میں ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت مال تجارت کا نصاب تصور کیا جائے گا جس آدمی کے پاس کاروبار کے لیے ساڑھے باون تولہ چاندی جس کی قیمت تقریباً ۲۵۴۶.۲۵ روپے تک مال تجارت موجود ہے وہ اپنے مال کی قیمت لگا کر اس پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے۔

۴) **زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ :** زمین سے پیدا ہونے والے غلّہ سے جو حصہ بطور زکوٰۃ ادا کیا جاتا ہے عشر کہلاتا ہے۔ عشر کا معنی ہے دسواں حصّہ' بعض حالات میں زمین کی پیداوار کا دسواں حصّہ واجب الادا ہوتا ہے اس لیے اسے عشر کا نام دیا گیا ہے جو کھیتی یا باغ' چشمہ' بارش' نہری پانی یا قدرتی ذرائع سے سیراب ہو اور اس کو پانی دینے کے لیے کسی مصنوعی آلہ کی ضرورت نہیں پڑتی تو ایسی کھیتی یا باغات پر عشر واجب الادا ہوتا ہے اور جس کھیتی یا باغ کو پانی دینے کے لیے مصنوعی آلات مثلاً رہٹ' مشین وغیرہ کی ضرورت پڑے تو اس کی پیداوار پر نصف عشر یعنی بیسواں حصّہ زکوٰۃ ہے۔

((عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُوْنُ اَوْ كَانَ عَثَرِيًّا الْعُشْرُ وَمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ))

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو کھیتی بارش اور چشموں سے سیراب ہوتی ہو یا وہ بارانی ہو اس میں عشر ہے اور جو زمین جانوروں یا کسی دوسرے ذریعہ سے پانی کھینچ کر لائے اس میں نصف عشر ہے۔"

(صحیح بخاری' کتاب الزکوٰۃ ۱۵۵/۲)

دونوں حالتوں میں کاشتکار کی محنت کا لحاظ رکھا گیا ہے' چونکہ اول الذکر صورت

میں محنت کم ہوتی ہے' اس لیے اس پر زکوٰۃ زیادہ ہے اور موخر الذکر صورت میں محنت زیادہ ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ کم ہے۔ زمین کی پیداوار کے لیے نصاب زکوٰۃ ۵ وسق ہے۔

((عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ! لَيْسَ فِیْ حَبٍّ وَّلَا تَمْرٍ صَدَقَةٌ حَتّٰى يَبْلُغَ خَمْسَةَ اَوْسُقٍ))

"ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک غلّہ اور کھجور کی مقدار پانچ وسق تک نہ ہو جائے اس پر زکوٰۃ نہیں" (نسائی)

اسی طرح صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ ۲/۱۳۳ پر مروی ہے کہ:

((لَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ صَدَقَةٌ.))

"پانچ وسق سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔"

جب پیداوار پانچ وسق یا اس سے زیادہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ پانچ وسق کا وزن ۲۰ من یا ۷۲۵ کلوگرام تک ہوتا ہے۔

مصارفِ زکوٰۃ

مصارفِ زکوٰۃ کا مطلب ہے کہ وہ مدیں جہاں پر زکوٰۃ صرف کی جاتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ (توبہ)

یعنی زکوٰۃ کا مال فقراء اور مساکین' زکوٰۃ وصول کرنے والے عاملین' نو مسلموں کی تالیف قلب' غلاموں' قرضداروں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ یہ آٹھ مصارف زکوٰۃ ہیں۔ ان آٹھ مصارف کی مختصر وضاحت درج ذیل ہے:

فقراء و مساکین

فقیر سے مُراد وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور مسکین جس کے پاس تھوڑا بہت خرچ موجود ہو یعنی اس کی آمدنی اس کی ضرورت سے بہت تھوڑی ہو۔

عاملین

وہ لوگ جو خلیفہ اسلام یا مسلمانوں کے امیر کی طرف سے زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے مقرر ہوتے ہیں۔ انکی تنخواہوں وغیرہ پر زکوٰۃ کا مال صرف ہو سکتا ہے۔

مُؤَلَّفَۃِ الْقُلُوْب

اس سے وہ ضعیف الایمان مسلمان مُراد ہیں جن کی دلجوئی یا مالی اعانت اگر نہ کی جائے تو ان کا اسلام سے منحرف ہونے کا خطرہ ہو۔

غلام

یعنی اگر کوئی مسلمان آدمی غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہو تو مالِ زکوٰۃ سے اسے غلامی سے آزادی دلا دی جائے۔

غارمین

ان سے مُراد وہ مقروض ہیں جن پر اتنا قرض چڑھ گیا ہے کہ وہ اتارنے کی سکت نہیں رکھتے مگر یاد رہے کہ اگر کوئی آدمی خلاف شرع کاموں جیسے شراب جوا وغیرہ میں مال خرچ کرنے کی وجہ سے مقروض ہو گیا ہو تو اس پر زکوٰۃ کا مال صرف کرنے سے گریز کرنا چاہئے جب تک وہ توبہ نہ کر لے۔

فی سبیل اللہ

اس سے مُراد وہ لوگ ہیں جو محاذ جنگ پر دشمنان اسلام سے نبرد آزما ہیں۔ یہ لوگ غنی بھی ہوں تب بھی ان کی اعانت مالِ زکوٰۃ سے کرنا جائز ہے تاکہ وہ سامان حرب جیسا کہ دورِ حاضر میں کلاشنکوف، گرینوف، زیکویک وغیرہ گنیں خرید کر دشمن

اسلام کا مقابلہ کر سکیں۔

ابن السبیل

اس سے مُراد وہ مسافر ہیں جو اپنے وطن سے دور ہیں اور ان کے پاس خرچ ختم ہو گیا ہے تو مالِ زکوٰۃ سے ان کی اعانت کرنا جائز ہے۔

صدقۃ الفطر

صدقۃ الفطر فرض ہے۔ صدقہ اس لیے ادا کیا جاتا ہے کہ رمضان المبارک میں اگر کسی فرد سے روزہ میں کوتاہی یا لغویات وغیرہ ہو گئی ہو تو اس سے پاکیزگی حاصل کی جائے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

((فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكٰوةَ الْفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِيْنِ مَنْ اَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلَاةِ فَهِيَ زَكٰوةٌ مَّقْبُولَةٌ وَمَنْ اَدَّاهَا بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَهِيَ صَدَقَةٌ مِّنَ الصَّدَقَاتِ))

"نبی کریم ﷺ نے تو روزہ دار کو بے ہودگی اور فحش کلامی سے پاک کرنے اور غرباء و مساکین کو خوراک مہیا کرنے کے لیے صدقہ فطر فرض کیا ہے جو شخص عید کی نماز سے قبل یہ صدقہ ادا کرے تو اس کا صدقہ مقبول ہے اور جو شخص نماز کے بعد صدقہ ادا کرے تو یہ نفلی صدقات کی طرح ایک صدقہ ہے" (صحیح ابوداود)

اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر کی ادائیگی عید کی نماز سے قبل ہونی چاہیے۔ اور یہ ہر مسلمان پر خواہ مرد ہو یا عورت غلام ہو یا آزاد چھوٹا ہو یا بڑا' فرض ہے اور ہر فرد کی طرف سے ایک صاع طعام ادا کیا جاتا ہے۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ میں حدیث ہے کہ:

((فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكٰوةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ اَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِيْرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى وَالصَّغِيْرِ وَالْكَبِيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ))

"نبی اکرم ﷺ نے صدقہ فطر ایک صاع کھجور سے یا ایک صاع جو سے غلام' آزاد' مذکر و مؤنث' چھوٹے اور بڑے مسلمان پر فرض کیا ہے"

طعام سے مراد ہر وہ چیز ہے جو کسی گھر میں عموماً کھائی جاتی ہے جیسا کہ چاول' جو' گندم وغیرہ ایک صاع کا وزن ۲.۲۵ سیر ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' مارچ / ۱۹۹۳ء)

مسجد کے قاری کے لیے صدقہ فطر

س ہماری مسجد میں بچوں کی تعلیم کے لیے قاری صاحب رکھے ہوئے ہیں جو صبح و شام انہیں قرآن کی تعلیم دیتے ہیں کیا صدقہ فطر انہیں دیا جا سکتا ہے؟

(محمد اسلم' ڈسکہ)

ج صدقہ فطر فقراء و مساکین کا حصہ ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

((فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكٰوةَ الْفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطَعْمَةً لِلْمَسَاكِيْنِ))

"نبی اکرم ﷺ نے صدقہ فطر فرض قرار دیا ہے جو روزہ دار کے لیے فضول و بے کار باتوں سے طہارت کا باعث ہے اور مساکین کے لیے کھانے کا۔ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر مساکین کا حق ہے' لہٰذا اس مال سے قاری صاحب کی تنخواہ ادا نہیں کی جا سکتی۔ ہاں اگر وہ مساکین کے زمرے میں داخل ہیں تو انھیں صدقہ فطر دیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم (مجلۃ الدعوۃ' مارچ / ۱۹۹۶ء)

﴿۸﴾

كتاب

الصَّوْمِ

روزہ اور بیوی کے حقوق

س روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے ساتھ سونے' بوسہ لینے وغیرہ کا کیا حکم ہے۔ (محمد جاوید خان)

ج روزہ کی حالت میں بیوی کے جسم سے جسم ملانا یا بوسہ لینا جائز ہے البتہ جماع حرام ہے۔ اس لیے اگر کسی کو خطرہ ہو کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا تو بوسہ وغیرہ سے بچے۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ روزہ کی حالت میں اپنی بیویوں کے جسم سے جسم ملا لیتے اور بوسہ لے لیتے اور آپ تم سب سے زیادہ اپنی حاجت پر قابو رکھنے والے تھے۔

(مشکوۃ باب تنزیہ الصوم) از : (ع ۔ م) مجلۃ الدعوۃ' جولائی / ۱۹۹۵ء

روزہ میں حقوقِ زوجیت کی ادائیگی

س شادی کے دو تین ماہ بعد رمضان کا مہینہ آگیا۔ میں نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم کر لیے۔ ایسا مجھ سے دو مرتبہ ہوا ہے جبکہ مجھے اس بارے میں بالکل نہیں معلوم کہ اس طرح گناہ ہو گا' برائے مہربانی قرآن و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل مجھے بتائیں۔ (محمد حنیف)

ج صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ :

ایک دن ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا' یا رسول اللہ میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا تمہیں کیا ہو گیا؟ کہنے لگا! میں روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کر بیٹھا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تمہارے پاس کوئی گردن (غلام یا لونڈی) ہے جسے آزاد کرو؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا: تم دو ماہ کے روزے رکھ سکتے ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا: ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ نبی کریم ﷺ (کچھ دیر) ٹھہر گئے۔ اسی دوران میں آپ کے پاس کھجوروں کا ایک ٹوکرا لایا گیا۔ آپ نے فرمایا مسئلہ پوچھنے والا کہاں ہے؟ اس نے کہا' میں حاضر ہوں۔ فرمایا: یہ لے لو اور صدقہ کر دو"۔

(صحیح بخاری' ج۱' ص ۲۵۹)

اس حدیث میں روزہ کی حالت میں جماع کرنے کا کفارہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک گردن آزاد کرے۔ یہ طاقت نہ ہو تو پے در پے دو ماہ کے روزے رکھے۔ یہ بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ سوال میں کہا گیا ہے کہ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ روزہ کی حالت میں بیوی سے جماع کرنے سے گناہ ہو گا۔ اگر واقعی سائل کو یہ بات معلوم نہیں تھی تو اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ اسے چاہئے آئندہ احتیاط کرے۔ قیامت کے دن مواخذہ علم پر ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن ابنِ آدم کے قدم اپنے رب کے پاس سے نہیں ہلیں گے جب تک پانچ چیزوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ اس کی عمر کے متعلق کہ اسے کس چیز میں فنا کیا' جوانی کے متعلق کہ کہاں گزاری اور اس کے مال کے متعلق کہ کہاں سے کمایا اور کس چیز میں خرچ کیا اور جو جانتا تھا اس پر کتنا عمل کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(ترمذی ابواب صفة القیامه' صحیح الترمذی شیخ ناصر الدین البانی حدیث ۱۹۱۹)

(مجلة الدعوة' اگست / ۱۹۹۵ء)

اعتکاف کے مسائل

اعتکاف عکوف سے مشتق ہے جس کا لغوی معنی کسی جگہ بیٹھ جانا ہے۔ لیکن اصطلاحِ شرع میں کسی شخص کا ایک خاص مدت کے لیے مخصوص صفت کے ساتھ مسجد کے ایک گوشہ میں اقامت گزین ہونا اور خلوت و تنہائی میں اللہ کی عبادت یعنی نوافل' تلاوتِ قرآن و حدیث' ذکر و اذکار کے لیے وقف ہو جانا ہے۔ ملاحظہ کیجیے

طرح التثریب ۱۶۶/۴' مفردات القرآن ص ۳۴۳' شرح مسلم للنووی ۶۶/۷۔

یہ عمل آپؐ کا سنت مؤکدہ ہے۔ آپؐ مدنی زندگی میں ہر سال اعتکاف کرتے تھے۔ ایک سال کسی سفر کی بنا پر اعتکاف چھوٹ گیا تو دوسرے سال بیس دن اعتکاف کر لیا۔ حدیث میں آتا ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْتَكِفُ

الْعَشْرَ الْأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ))

"سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان کے آخری دس دن اعتکاف بیٹھتے تھے۔" (بخاری ۲۷۱/۱)

((عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَعْتَكِفُ الْأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ فَسَافَرَ عَامًا فَلَمْ يَعْتَكِفْ فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ اعْتَكَفَ عِشْرِيْنَ))

"سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے' ایک سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کیا' اعتکاف نہ کیا تو آئندہ سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس دن کا اعتکاف کیا۔"

(نسائی' ابوداؤد' ابن حبان' فتح الباری ۳۳۲/۱)

مسنون اعتکاف یہ ہے کہ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کیا جائے البتہ اس سے کم وقت یعنی ایک دن یا رات وغیرہ کے لیے بھی اعتکاف ہو سکتا ہے جیسا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے :

((أَنَّ عُمَرَ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ نَذَرْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ أَنْ أَعْتَكِفَ لَيْلَةً فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَقَالَ فَأَوْفِ بِنَذْرِكَ))

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں مسجد حرام میں ایک رات اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی تو آپ نے فرمایا' اپنی نذر پوری کر۔" (بخاری ۲۷۲/۱)

یہی حدیث امام ابنِ ماجہ رحمہ اللہ اپنی سنن میں باب فِي اعْتِكَافِ يَوْمٍ أَوْ لَيْلَةٍ (یعنی ایک دن یا رات کا اعتکاف کرنا) میں لائے ہیں۔ (۵۶۳/۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص دن رات یا کچھ حصے کی نذر مان لیتا ہے کہ میں اتنا وقت اعتکاف کروں گا تو اسے نذر پوری کرنی چاہیے۔

علاوہ ازیں رمضان کے مہینے کے علاوہ بھی دیگر مہینوں میں اعتکاف ہو سکتا ہے

جیسا کہ نبی ﷺ نے شوال میں اعتکاف کیا۔ (بخاری ۲۲۶/۴، مسلم ۱۱۴۳)

شرائط : اعتکاف مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ مشروع و جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ ﴾ (بقرہ : ۱۸۷)

"اور تم ان سے مباشرت نہ کرو' اس حال میں کہ تم مساجد میں اعتکاف بیٹھے ہوئے ہو"

نبی ﷺ کی سنت میں یہی بات شامل ہے کہ آپ مسجد میں اعتکاف بیٹھا کرتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ :

((اَلسُّنَّةُ لَا اعْتِكَافَ اِلَّا بِصَوْمٍ وَّلَا اعْتِكَافَ اِلَّا فِيْ مَسْجِدٍ جَامِعٍ))

"سنت یہ ہے کہ اعتکاف روزہ کے ساتھ ہی ہوتا ہے اور جامع مسجد میں ہوتا ہے" (ابوداؤد ۱/۳۳۵)[1]

عورت اگر اعتکاف بیٹھنا چاہے تو وہ بھی مسجد میں ہی اعتکاف کر سکتی ہے۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی مسجد میں اعتکاف بیٹھا کرتی تھیں۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ نبی ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دے دی۔ پھر آپ کے بعد آپ کی بیویوں نے اعتکاف کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے اجازت مانگی تو آپ نے انہیں اجازت دے دی۔ فَضَرَبَتْ فِيْهِ قُبَّةً انہوں نے مسجد میں خیمہ لگا لیا۔

(بخاری ۱/ ۲۷۳)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان اوپر گزر چکا ہے کہ اعتکاف صرف جامع مسجد میں ہوتا ہے اس لیے اگر عورت اعتکاف کرنا چاہے تو مسجد میں ہی اس کا انتظام کرنا پڑے گا البتہ علامہ ناصرالدین البانی حفظہ اللہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث :

---

[1] اس روایت کی سند میں امام زھری کا عنعنہ ہے اور تصریح بالسماع نہیں ہے۔ (ابو طاہر)

"کہ آپ کے بعد ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے اعتکاف کیا" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَفِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى جَوَازِ اعْتِكَافِ النِّسَاءِ وَلَا شَكَّ اَنَّ ذٰلِكَ مُقَيَّدٌ بِاِذْنِ اَوْلِيَائِهِنَّ لِذٰلِكَ وَاَمْنِ الْفِتْنَةِ وَالْخَلْوَةِ مَعَ الرِّجَالِ لِلْاَدِلَّةِ الْكَثِيْرَةِ فِى ذٰلِكَ وَالْقَاعِدَةُ الْفِقْهِيَّةُ دَرْءُ الْمَفَاسِدِ مُقَدَّمٌ عَلٰى جَلْبِ الْمَصَالِحِ صِفَةُ صَوْمِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

"اس حدیث میں عورتوں کے اعتکاف پر جواز کی دلیل ہے اور بلاشبہ یہ بات عورتوں کے ولیوں کی اجازت' فتنہ اور مردوں کے ساتھ خلوت سے بچاؤ کے ساتھ مقید (مشروط) ہے۔" یعنی فسادات اور فتنہ کا اگر خدشہ ہو تو پھر ان سے اجتناب کرنا اور بچنا یہ مصلحتوں کے حاصل کرنے سے زیادہ ضروری اور مقدم ہے۔

اعتکاف کا طریقہ

اعتکاف کے متعلق اللہ کے نبی ﷺ کی ایک حدیث تو اوپر گزر چکی ہے کہ آپ آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے۔ دوسری حدیث یہ ہے:

((عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَّعْتَكِفَ صَلَّى الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ مُعْتَكَفَهُ))

"سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف بیٹھنے کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھ کر جائے اعتکاف میں داخل ہو جاتے"

(صحیح مسلم' ابوداؤد ۳۳۴)

ان احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے عام اہل علم یہ بات لکھتے ہیں کہ آخری عشرہ کا آغاز بیس رمضان کا سورج غروب ہوتے ہی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا معتکف کو چاہئے کہ اکیسویں رات شروع ہوتے ہی مسجد میں آ جائے۔ رات بھر تلاوت قرآن' ذکر الٰہی' تسبیح و تہلیل اور نوافل میں مصروف رہے اور صبح نماز فجر ادا کر کے اپنے اعتکاف کی

جگہ میں داخل ہو جائے۔

جبکہ دوسرا موقف جو ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ آخری عشرے کا اعتکاف بیٹھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اعتکاف کا آغاز نماز صبح کے بعد کرتے اکیس یا بیس کی صبح کو اس کا تعین واضح نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ معتکف بیس رمضان کی فجر کی نماز پڑھ کر اعتکاف کا آغاز کرے تاکہ اکیس کی رات معتکف میں آئے کیونکہ اعتکاف لیلۃ القدر کی تلاش کا ایک ذریعہ ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے لیلۃ القدر میں دو عشرے اعتکاف کیا۔ نہ ملی تو پھر آپ نے تیسرے اور آخری عشرے کا اعتکاف کیا۔ تسلسل بھی جاری رکھا حتیٰ کہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے ساتھ اعتکاف کر رہے تھے۔ ان میں سے بعض بیسویں کی صبح اپنا بوریا بستر اٹھا کر گھر میں بھی پہنچا چکے تھے۔ تب آپ نے اعلان فرمایا کہ جو میرے ساتھ اعتکاف کر رہا ہے وہ اپنے اعتکاف کو جاری رکھے۔ بیسویں رمضان تھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے پھر سے آخری عشرے کا آغاز کر دیا۔ (بخاری)

ذرا غور فرمائیں کہ آخری عشرے کا اعتکاف اکیسویں رات بعد از غروب آفتاب شروع ہوتا ہے تو آپ نے بیسویں کے دن کا اعتکاف صحابہ رضی اللہ عنہم سے کیوں کروایا۔ آپ انہیں اکیسویں رات کو ہی بلا لیتے اور کہہ دیتے کہ تم نے معتکف تو توڑ چھوڑ دیا ہے۔ اب رات مسجد میں گزارو اور کل صبح یعنی اکیسویں کی صبح کی نماز کے بعد دوبارہ معتکف میں داخل ہو جانا تاکہ تمہارا آخری عشرے کا اعتکاف پورا ہو جائے۔ ملاحظہ ہو مولانا عبدالسلام بستوی کے "اسلامی خطبات"۔ ان حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اگر ۲۰ کی صبح کو مسجد میں آ جائے تو ذہنی طور پر لیلۃ القدر کی تلاش کے لیے اکیسویں کو پورا تیار ہو جاتا ہے جبکہ دوسرے موقف کے لحاظ سے اکیسویں رات جائے اعتکاف سے باہر گزاری اور اعتکاف کے ارادے سے اکیس کی صبح کو معتکف میں داخل ہوا تو آخری عشرے سے ایک رات خارج ہو جائے گی جو ایک نقص بھی ہے لہٰذا زیادہ مناسب اور موزوں یہ ہے کہ بیسویں کی صبح کو مسجد میں آ جائے اور

نماز کی ادائیگی کے بعد اپنے معتکف میں تیار ہو کر بیٹھ جائے۔ اس صورت میں دونوں احادیث پر بہتر عمل ہو جائے گا۔ صرف آخری عشرہ سے ۱۲ گھنٹوں کا اضافہ ہو گا اور اس اضافے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حافظ عبداللہ بہاولپوری رحمہ اللہ بھی اسی موقف کے قائل تھے اور یہ موقف مبنی بر احتیاط ہے۔ واللہ اعلم

جائز امور : معتکف کے لیے حالتِ اعتکاف میں نہانا' سر میں کنگھی کرنا' تیل لگانا اور حاجاتِ ضروریہ مثلاً پیشاب' پاخانہ' فرض غسل وغیرہ کے لیے جانا درست ہے۔ (بخاری ۱/۲۷۲)

اعتکاف بیٹھنے والے کو بلاعذر شرعی اپنے معتکف سے باہر نہیں جانا چاہیے۔

(مجلۃ الدعوۃ' فروری / ۱۹۹۶ء)

شوال کے چھ روزے

س شوال کے روزوں کی کیا فضیلت ہے؟ کیا یہ مسلسل رکھنے پڑتے ہیں؟

ج رمضان المبارک کے روزے رکھنے کے بعد ماہ شوال کے چھ روزے رکھنے کا اجر و ثواب سال بھر کے روزے رکھنے کے برابر ہے۔ حدیث میں وارد ہے :

((عَنْ اَبِی اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَہٗ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ کَانَ کَصِیَامِ الدَّھْرِ وَ فِی رِوَایَۃٍ کَانَ تَمَامَ السَّنَۃِ)) (مسلم ۱/ ۳۶۹)

"سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے رمضان المبارک کے روزے رکھے' پھر اسکے پیچھے شوال کے چھ روزے رکھے تو اس کو سال بھر کے روزوں کا ثواب ملتا ہے۔"

محدثین نے اس کی یوں توضیح کی ہے کہ ہر نیکی کا اجر کم از کم دس گنا ملتا ہے تو رمضان کے ۳۰ روزوں میں ۶ روزے شوال کے جمع کریں تو کل ۳۶ روزے بنتے ہیں۔ اب ان کو دس کے ساتھ ضرب دیں تو یہ ۳۶۰ ہوئے۔ گویا سال بھر کے روزوں کا ثواب اللہ تعالیٰ اسے عطا کر دیتا ہے۔ شوال کے چھ روزے عید کے بعد

مسلسل بھی رکھے جا سکتے ہیں اور اس مہینہ میں وقفہ بعد وقفہ بھی رکھے جا سکتے ہیں۔
(مجلۃ الدعوۃ' فروری / ۱۹۹۶ء)

لیلۃ القدر کی فضیلت اور علامات

س لیلۃ القدر کی کیا فضیلت ہے اور اس کو پہچاننے کے لیے کیا علامات ہیں؟

ج لیلۃ القدر کی کچھ علامات احادیث میں اس طرح آئی ہیں۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((صَبِيحَةُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ تَطْلُعُ الشَّمْسُ لَا شُعَاعَ لَهَا كَأَنَّهَا طَسْتٌ حَتَّى تَرْتَفِعَ))

"لیلۃ القدر کی صبح کو سورج کے بلند ہونے تک اس کی شعاع نہیں ہوتی۔ وہ ایسے ہوتا ہے جیسا کہ تھالی (پلیٹ)" (مسلم ۷۶۲)

اسی طرح سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

((أَيُّكُمْ يَذْكُرُ حِينَ طَلَعَ الْقَمَرُ وَهُوَ مِثْلُ شِقِّ جَفْنَةٍ))

"تم میں سے کون اسے یاد رکھتا ہے (اس رات) جب چاند نکلتا ہے تو ایسے ہوتا ہے جیسے بڑے تھال کا کنارہ" (مسلم ۱۱۷۰)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةٌ سَمْحَةٌ طَلْقَةٌ لَا حَارَّةٌ وَلَا بَارِدَةٌ تُصْبِحُ الشَّمْسُ صَبِيحَتَهَا ضَعِيفَةً حَمْرَاءَ))

"لیلۃ القدر آسان و معتدل رات ہے جس میں نہ گرمی ہوتی ہے اور نہ ہی سردی۔ اس کی صبح کو سورج اس طرح طلوع ہوتا ہے کہ اس کی سرخی مدھم ہوتی ہے۔" (مسند بزار ۴۸۶/۱' مسند طیالسی ۳۴۹' ابن خزیمہ ۲۳۱/۳)

شیخ سلیم الہلالی اور شیخ علی حسن عبدالحمید نے صفۃ صوم النبی ﷺ کے صفحہ ۹۰ پر اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' فروری / ۱۹۹۶ء)

مسنون تراویح

س: نمازِ تراویح کتنی رکعت ہے؟ کیا تہجد اور تراویح آپ نے علیحدہ علیحدہ پڑھی تھیں؟

ج: نمازِ تراویح جسے ہم رمضان المبارک کی راتوں میں ادا کرتے ہیں' احادیث میں اسے قیامِ رمضان' صلوۃ رمضان' قیام اللیل اور صلوۃ الوتر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ یہ نماز رمضان المبارک میں اور اس کے علاوہ باقی مہینوں میں گیارہ رکعات ادا فرمایا کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے رمضان المبارک میں تین رات اس کی جماعت کروائی تھی۔ پھر فرضیت کے خوف سے اس کو ترک کر دیا اور یہ بھی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ آپ نے اس کی جماعت کی فضیلت ذکر کی ہے جیسا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے۔ آپ نے ہمیں آخری ہفتہ میں تین طاق راتوں میں اس طرح نماز پڑھائی کہ پہلی رات کو اول وقت میں اور دوسری رات کو نصف شب میں۔ آپ سے کہا گیا کہ اس رات کا قیام بڑھا دیں۔ آپ نے فرمایا :

((اِنَّ الرَّجُلَ اِذَا صَلّٰی مَعَ الْاِمَامِ حَتّٰی یَنْصَرِفَ حُسِبَ لَهٗ قِیَامُ لَیْلَةٍ))

"یقیناً جب آدمی امام کے ساتھ نماز ادا کرے اس کے پھرنے یعنی امام کے نماز کو ختم کرنے تک' تو اس کے لیے پوری رات کا قیام شمار کیا جائے گا"۔

پھر تیسری رات کو آخر شب میں آپ نے اپنے اہل و عیال اور دیگر لوگوں کو جمع کیا' نماز پڑھائی یہاں تک کہ ہمیں فلاح یعنی سحری کے فوت ہونے کا ڈر لگا۔

(ابنِ ماجہ' ابوداؤد وغیرہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضان المبارک میں رات کے وقت امام کے ساتھ قیام کرنا مشروع اور باعث فضیلت ہے۔ آپ نے صرف فرضیت کی بنا پر اس کو ترک فرمایا تھا اور نماز کی فرضیت کا تعلق آپ کی حیات مبارکہ کے ساتھ تھا۔ آپ کے بعد اس کو کوئی فرض قرار نہیں دے سکتا۔ لہٰذا اب یہ قیام مع الامام جائز

اور باعث ثواب ہے۔

نمازِ تراویح کی تعداد صحیح احادیث میں جو مذکور ہوئی ہیں' وہ گیارہ رکعات ہیں جیسا کہ اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ :

((كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فِيمَا بَيْنَ اَنْ يَفْرُغَ مِنْ صَلَاةِ الْعِشَاءِ وَهِيَ الَّتِيْ يَدْعُوا النَّاسُ الْعَتَمَةَ اِلَى الْفَجْرِ اِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً يُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُوْتِرُ بِوَاحِدَةٍ))

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد صبح تک گیارہ رکعات پڑھتے تھے اور ہر دو رکعتوں پر سلام پھیرتے تھے اور ایک وتر پڑھتے تھے۔ عشاء کی نماز کو لوگ "عَتَمَه" بھی کہتے ہیں"۔ (صحیح مسلم ۱/۲۵۴)

اسی طرح صحیح بخاری ۱/۲۶۹ باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان وغیرہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا :

((كَيْفَ كَانَتْ صَلَاةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي رَمَضَانَ فَقَالَتْ : مَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَزِيْدُ فِي رَمَضَانَ وَلَا فِي غَيْرِهٖ عَلٰى اِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً))

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رمضان میں نماز کیسی ہوتی تھی تو انہوں نے فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے"۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سائل نے رمضان المبارک کی راتوں کو ادا کی جانے والی نماز کے بارے میں سوال کیا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں رمضان المبارک کے متعلق بھی جواب دیا اور ساتھ افادہ زائدہ کے طور پر غیر رمضان کے متعلق بھی بتایا کہ غیر رمضان میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعات ادا کرتے تھے جو نماز عشاء کے بعد سے لے کر نماز فجر تک ادا کرتے۔

نوٹ : بریلوی حضرات کے چند علماء مثلاً مولوی امجد علی' احمد علی وغیرہ نے مل کر بخاری شریف کا جو ترجمہ اور حواشی لکھے ہیں انہوں نے اس حدیث میں تحریف

کی ہے اور فی رمضان کے الفاظ عربی متن سے بھی اور اردو ترجمہ سے بھی خارج کر دیئے ہیں کیونکہ فی رمضان کے الفاظ اس بات کو متعین کرتے ہیں کہ سائل کا سوال نمازِ تراویح کے متعلق تھا۔ اُن کی اس خیانت کو ہمیشہ مدنظر رکھیں۔

کیا تہجد اور تراویح علیحدہ علیحدہ ہیں؟

بعض لوگ مذکورہ حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کا تعلق نماز تہجد کے ساتھ ہے تراویح کے ساتھ نہیں۔ آپ نے تراویح اور تہجد علیحدہ علیحدہ پڑھی ہیں اور یہ بات بڑے بڑے حنفی علماء بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تہجد اور تراویح کے علیحدہ علیحدہ پڑھنے پر کوئی دلیل موجود نہیں جیسا کہ مولانا انور شاہ کاشمیری دیوبندی رقمطراز ہیں :

" وَلَا مَنَاصَ مِنْ تَسْلِيْمِ اَنَّ التَّرَاوِيْحَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَتْ ثَمَانِيَةَ رَكْعَاتٍ وَلَمْ يَثْبُتْ فِي رِوَايَةٍ مِنَ الرِّوَايَاتِ اَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ صَلَّى التَّرَاوِيْحَ وَالتَّهَجُّدَ عَلٰى حِدَةٍ فِيْ رَمَضَانَ۔"

"یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تراویح آٹھ رکعات تھیں اور کسی روایت سے ثابت نہیں کہ آپ نے تراویح اور تہجد کو رمضان میں علیحدہ علیحدہ پڑھا ہو"۔

یعنی اگر تراویح اور تہجد الگ الگ نمازیں ہوتیں تو رمضان میں ان کے الگ الگ پڑھنے کا آپ سے کوئی ثبوت ملنا چاہیے تھا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ نبی ﷺ جو گیارہ رکعات عام دنوں میں تہجد کے طور پر پڑھتے تھے' وہی گیارہ رکعت رمضان میں ادا کرتے تھے فرق صرف ان کے اوقات اور قیام میں طوالت کا تھا۔ ابوداؤد وغیرہ کے حوالے سے مذکورہ روایت جس میں آپؐ کے تین راتوں میں جماعت کرانے کا تذکرہ ہے' اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ آپؐ نے اسی نمازِ تراویح کو رات کے تین حصوں میں پڑھا اور تراویح کا وقت عشاء کے بعد سے اخیر رات تک اپنے عمل سے بتا دیا جس میں تہجد کا وقت آ گیا پس فعل رسول ﷺ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ عشاء کے بعد طلوع فجر تک ایک ہی نماز ہے۔ یہی بات مولوی عبدالحی لکھنوی حنفی

نے اپنے فتاویٰ اُردو ۴۲۹/۱ پر لکھی ہے۔

علاوہ ازیں ائمہ محدثین نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث پر قیام رمضان اور تراویح کے ابواب باندھے ہیں جیسا کہ صحیح بخاری میں کتاب صلوۃ التراویح باب فضل من قام رمضان کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث ذکر کر کے بتا دیا کہ اس کا تعلق نمازِ تراویح کے ساتھ ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں ۴۹۵/۲، ۴۹۶ پر باب ماروی فی عدد رکعات القیام فی شهر رمضان اور امام محمد بن حسن شیبانی شاگرد امام ابوحنیفہ نے اپنی موطا میں ص ۱۴۱ پر باب قیام شهر رمضان وما فیه من الفضل قائم کیا ہے یعنی اس حدیث کا تعلق قیام رمضان کے ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ متعدد ائمہ نے اس حدیث کو ۲۰ رکعت والی موضوع و منکر روایت کے مقابلہ میں بطورِ معارضہ پیش کیا ہے جیسا کہ علامہ زیلعی حنفی نے نصب الرایہ ۱۸۳/۲، علامہ ابنِ حجر عسقلانی نے الدرایہ ۲۰۳/۱، علامہ ابن ہمام حنفی نے فتح القدیر ۴۶۷/۱، علامہ عینی نے عمدۃ القاری ۱۲۸/۱۱ میں اور امام سیوطی نے الحاوی للفتاوی ۳۴۸/۱ پر ذکر کیا ہے۔

سیدنا جابر انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ :

((صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي رَمَضَانَ ثَمَانَ رَكْعَاتٍ وَالْوِتْرَ))

"ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں آٹھ رکعتیں اور وتر پڑھائے۔"

(صحیح ابن خزیمہ ۱۳۸/۲، ابنِ حبان ۲۶/۴، ۶۴)

امام ذہبی میزان میں فرماتے اور اس حدیث کی سند وسط (حسن) ہے۔ اسی طرح ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ آج رات میرے ساتھ ایک بات ہو گئی ہے۔ آپ نے پوچھا، اے ابی وہ کیا بات ہے؟ میرے گھرانے کی عورتوں نے کہا ہم قرآن نہیں پڑھتیں، اس لیے تمہاری اقتداء میں نماز ادا کریں گی۔ فَصَلَّيْتُ بِهِنَّ ثَمَانَ رَكْعَاتٍ ثُمَّ أَوْتَرْتُ قَالَ فَكَانَ شِبْهُ الرِّضَا وَلَمْ يَقُلْ شَيْئًا

مسند ابی یعلی ۳/۳۳۶) امام ہیثمی نے اس سند کو حسن کہا ہے۔ (مجمع الزوائد) "میں نے انہیں آٹھ رکعات پڑھائیں۔ پھر وتر ادا کیے۔ آپؐ نے کچھ نہ کہا گویا اس پر رضامندی ظاہر کی۔" ان احادیث سے بھی معلوم ہوا کہ آپؐ کی سنت نمازِ تراویح میں آٹھ رکعات ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' فروری / ۱۹۹۶ء)

شبینہ کی شرعی حیثیت

س: علمائے کرام اس بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں عشاء کی نماز کے بعد تراویح کے علاوہ جو شبینہ پڑھایا جاتا ہے جس میں قاری حضرات دو رکعت میں ایک پارہ قرأت کرتے ہیں اور مقتدی پیچھے کھڑے ہو کر سنتے ہیں اور اسی طرح رات ایک بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور کئی کئی پارے اور کئی رکعات نفل ادا کیے جاتے ہیں۔ کیا یہ عمل رسول اللہ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم یا تابعین رحمہم اللہ سے ثابت ہے۔ اگر نہیں تو کیا یہ عمل باعث ثواب ہے یا بدعت کی بنا پر گمراہی ہے اور گناہ کا باعث ہے؟ (خالد مسعود' وزیر آباد)

ج: مذکورہ صورت میں دو تین باتیں قابل غور ہیں اولاً نماز نفل باجماعت ادا کرنا' ثانیاً نماز نفل کا اپنی طرف سے مقررہ اہتمام اور اس پر دوام و اصرار کرنا۔ یعنی خاص وقت یا معین مہینہ میں اس کا خصوصی اہتمام کرنا۔ اول الذکر بات تو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے جیسا کہ صحیح بخاری باب اذا ینو الامام ان یوم ثم جاء قوم فامھم میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں ایک رات اپنی خالہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ جب رسول اکرم ﷺ نماز تہجد میں مشغول ہوئے تو میں آپ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ ان کی اقتداء میں نماز تہجد پڑھنے لگا حالانکہ آپؐ نے میری امامت کی نیت نہیں کی تھی تو آپؐ نے میرے سر سے پکڑ کر مجھے اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا۔ (صحیح بخاری ۱/۹۷)

اور اسی طرح صحیح بخاری باب صلوۃ النوافل جماعۃ میں محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ

سے سیدنا عتبان بن مالک کا واقعہ منقول ہے کہ رسول اکرم ﷺ سیدنا عتبان کی فرمائش پر ان کے گھر تشریف لائے اور دو رکعت نماز باجماعت ادا فرمائی۔
(صحیح بخاری ۱/ ۱۰۸)

ان ہر دو احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہوا کہ نماز نفل کی جماعت بلاشک و شبہ جائز ہے۔ لیکن اس کا اعلان کرنا مردوں اور عورتوں کو بذریعہ اشتہارات جمع کرنا، نوافل باجماعت، بالدوام ادا کرنا اور رات کو چراغ گل کر کے دعائیں مانگنا ناجائز اور بدعت معلوم ہوتا ہے کیونکہ مطلقاً نماز نفل باجماعت ادا کرنا تو صحیح ہے لیکن یہ قیود مع اہتمام اس مطلق جواز کو بدعت میں بدل دیتے ہیں جیسا کہ نماز چاشت صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام ہانی رضی اللہ عنہا سے یہ نماز مروی ہے اور نبی کریم ﷺ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اس کی پابندی کی وصیت بھی فرمائی (صحیح بخاری ۱/۱۵۷) مگر اس وصیت کے باوصف سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس کو بدعت کہتے ہیں (اس کی وجہ ذیل میں آ رہی ہے) جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ مجاہد کہتے ہیں: میں اور عروۃ دونوں مسجد میں داخل ہوئے: فَإِذَا عَبْدُاللهِ بْنُ عُمَرَ جَالِسٌ إِلٰى حُجْرَةِ عَائِشَةَ وَإِذَا أُنَاسٌ يُصَلُّوْنَ فِي الْمَسْجِدِ صَلٰوةَ الضُّحٰى فَسَأَلْنَاهُ عَنْ صَلَاتِهِمْ فَقَالَ بِدْعَةٌ

(صحیح بخاری باب کم اعتمر النبی ﷺ ۱/۲۳۸، صحیح مسلم ۱/۴۰۹)

"سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے پاس بیٹھے تھے اور اس وقت کچھ لوگ مسجد میں نماز چاشت پڑھ رہے تھے۔ ہم نے ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے ان کی اس نماز کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا یہ بدعت ہے۔"

جبکہ یہ نماز متعدد اسانید صحیحہ سے مروی ہے جیسا کہ اوپر صحیح بخاری کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ مقامِ غور ہے کہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بدعت کیوں کہا؟ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مسعود میں اس نماز کو باجماعت ادا کرنے کا دستور نہیں تھا۔ چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے:

((مرَادُهُ إِنَّ اِظْهَارَهَا وَالْاِجْتِمَاعَ لَهَا بِدْعَةٌ لَا اَنَّ صَلٰوةَ الضُّحٰى بِدْعَةٌ

وَقَدْ سَبَقَتِ الْمَسْئَلَةُ فِی کِتَابِ الصَّلٰوۃِ))

"سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مُراد یہ تھی کہ نماز چاشت کو مسجد میں ظاہر کر کے پڑھنا اور اس کے لیے اجتماع و اہتمام کرنا بدعت ہے نہ کہ نماز چاشت بدعت ہے"۔

امام ابوبکر محمد بن ولید الطرطوشی لکھتے ہیں:

مَحلُّہٗ عِنْدِیْ عَلٰی اَحَدِ وَجْھَیْنِ اَنَّھُمْ کَانُوْا یُصَلُّوْنَھَا جَمَاعَۃً اِمَّا اَنَّھَا یُصَلُّوْنَھَا مَعًا اَوْ فَذَاذًا عَلٰی ھَیْئَۃِ النَّوَافِلِ فِی اَعْقَابِ الْفَرَائِضِ

(کتاب الحوادث والبدع ۴۰)

"ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی اس نماز کو تو اس لیے بدعت قرار دیا کہ وہ اسے باجماعت پڑھ رہے تھے یا اس لیے کہ اکیلے اکیلے اس طرح پڑھ رہے تھے جیسے فرائض کے بعد ایک ہی وقت میں تمام نمازی سنن رواتب پڑھا کرتے ہیں۔

اس کی دوسری مثال یہ لے لیں کہ سبحان اللہ، اللہ اکبر، لا الٰہ الاّ اللہ کا وظیفہ اپنے اپنے اندر بڑے فضائل رکھتا ہے۔ اور مفسرین نے اس کو باقیات صالحات میں شمار کیا ہے یہ بلندی درجات اور نجات اخروی کا بہترین ذریعہ ہے مگر اس کے باوجود جب اسے خاص قیود اور غیر ثابت تکلفات و التزامات کے ساتھ پڑھا جائے گا تو یہی وظیفہ ہلاکت اور خسارے کا باعث بن جائے گا۔ جیسا کہ سنن دارمی میں بسند صحیح سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے آتا ہے کہ کچھ لوگ کوفہ شہر کی مسجد میں حلقہ باندھے کنکریوں پر سبحان اللہ، اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ سو سو دفعہ پڑھ رہے تھے تو ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا:

فَعُدُّوا مِنْ سَیِّاٰتِکُمْ فَاَنَا ضَامِنٌ اَنْ لَّا یَضِیْعَ مِنْ حَسَنَاتِکُمْ شَیْئٌ وَّیْحَکُمْ یَا اُمَّۃَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَسْرَعَ ھَلَکَتَکُمْ ھٰؤُلَاءِ صَحَابَۃُ نَبِیِّکُمْ مُتَوَافِرُوْنَ وَھٰذِہٖ ثِیَابُہٗ لَمْ تَبْلَ وَآنِیَتُہٗ لَمْ تُکْسَرْ.. ..اَوْ مُفْتَتِحُوْا بَابِ ضَلَالَۃٍ؟)) (سنن دارمی، ص ۶۱)

"تم اپنے گناہوں کو شمار کرو میں ضمانت دیتا ہوں تمہاری نیکیاں ضائع نہیں ہوں گی۔ اے امت محمد ﷺ تم پر افسوس ہے کہ تم کتنی جلدی ہلاکت میں مبتلا ہو گئے ہو ابھی تم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بکثرت موجود ہیں۔ ابھی تو رسول اللہ ﷺ کے کپڑے بھی پرانے نہیں ہوئے اور آپ کے استعمال میں آنے والے برتن بھی نہیں ٹوٹے۔ تم ایسا کر کے گمراہی کا دروازہ کھول رہے ہو۔"

اس روایت سے یہ ثابت ہوا کہ عبادت اور اطاعت جس طرح شریعت میں منقول ہو' اس کو اسی انداز میں ادا کرنا چاہیے یعنی جس ہیئت و صورت میں وہ عبادت ہوئی ہے' اس کو اسی طرز سے اپنانا چاہیے۔ اپنی طرف سے اس میں پابندیاں عائد کرنا' بغیر دلیل کے مطلق کو مقید کرنا' غیر مؤقت کو مؤقت کرنا یعنی کسی وقت کے ساتھ خاص کر لینا' غیر معین کو معین بنانا' بدعت بن جائے گا جس سے اجتناب ضروری ہے۔ وگرنہ ہلاکت میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ یہی وہ نکتہ ہے جس کے پیش نظر ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے چاشت کو بدعت کہا اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے حلقہ باندھ کر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ وغیرہ کا ذکر کرنے کو بدعت اور ہلاکت قرار دیا۔ امام ابو اسحاق شاطبی رقم طراز ہیں کہ:

" مِنْهَا اِلْتِزَامُ الْكَيْفِيَّاتِ بِهَيْئَةِ الْاِجْتِمَاعِ عَلٰى صَوْتٍ وَّاحِدٍ وَّاِتِّخَاذُ وِلَادَةِ النَّبِيِّ عِيْدًا وَّمَا اَشْبَهَ ذٰلِكَ وَمِنْهَا اِلْتِزَامُ الْعِبَادَاتِ مُعَيَّنَةً فِي اَوْقَاتٍ مُعَيَّنَةٍ لَمْ يُوْجَدْ لَهَا ذٰلِكَ التَّعْيِيْنُ فِي الشَّرِيْعَةِ كَالْتِزَامِ يَوْمِ نِصْفٍ مِّنْ شَعْبَانَ وَقِيَامِ لَيْلَتِهٖ۔"

یہ بھی بدعات سے ہے کہ کسی نیک عمل کی ادائیگی کے لیے اجتماع کی صورت میں ایک ہی آواز کے ساتھ ذکر کا التزام کرنا' عید میلاد النبی منانا اور اس کی مثل دیگر امور اور ان بدعات میں سے یہ بھی ہے کہ عبادات کو معین کرنا' معین اوقات کے ساتھ جن کی تعیین شریعت میں نہیں پائی جاتی۔ جیسا کہ ۱۵ شعبان اور اس کی رات کو پابندی کے ساتھ عبادت بجا لانے کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن

عمر رضی اللہ عنہ ' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ امام شاطبی اور دیگر محدثین کی تصریح سے یہ بات ثابت ہوئی کہ شریعت نے جن عبادات و اطاعات کو مطلق چھوڑا ہے' ان میں اپنی طرف سے پابندیاں عائد کرنا ان کی ہیئت و کیفیت کو بدلنا ہے۔ ان کو اوقات کے ساتھ معین کرنا گویا دین کو بدلنا ہے اور اس کا نام تحریف ہے اور یہ گمراہی ہے۔

لہٰذا لوگوں کا نوافل کے لیے اہتمام' خصوصی شبینہ کرنا' اس کے لیے لوگوں کو تیار کرنا' اس پر اصرار کرنا سراسر سنت اور سبیل المؤمنین کے خلاف ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ' تابعین' فقہاء' محدثین رحمہم اللہ نے اس تکلف اور اہتمام کو پسند نہیں کیا۔ لہٰذا اس بدعت سے اجتناب کرنا چاہیے اور عبادت کا جو طریقہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اس پر عمل کرنا چاہیے۔ (مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۳ء)

كتاب

الْحَجِّ

حج پر عورتوں کا بال کٹوانا

س سنا ہے کہ جب حج کر کے عید کی نماز پڑھ کر حجامت کرواتے ہیں تو عورتیں بھی اپنے بال کاٹ لیتی ہیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(ایک طالبہ، فیصل آباد)

ج حج اور عمرہ کے موقع پر عورت اپنے سر کے بال کتروا سکتی ہے۔ اس کی مشروعیت شریعت میں مذکور ہے۔ سنن ابوداؤد اور دار قطنی میں حدیث ہے:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ الْحَلْقُ اِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيْرُ))

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورتوں پر سر منڈانا نہیں بلکہ بال کترنا ہے" (ابوداؤد مع عون ۲/۱۵۰، نیل الاوطار ۵/۸۰)

امام قاضی شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار ۵/۸۰ پر لکھا ہے:

فِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الْمَشْرُوْعَ فِي حَقِّهِنَّ التَّقْصِيْرُ وَقَدْ حَكَى الْحَافِظُ الْاِجْمَاعَ عَلٰى ذَالِكَ

"یہ حدیث عورتوں کے بال کترانے کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہے۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس مسئلہ پر ائمہ کا اجماع نقل کیا ہے۔

اس حدیث کی تائید سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے:

((نَهٰى اَنْ تَحْلِقَ الْمَرْاَةُ رَاْسَهَا))

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے سر منڈانے سے منع کیا ہے۔ یعنی عورتوں کے ذمہ صرف بال کترانا ہے، مردوں کی طرح منڈوانا نہیں۔

(مجلۃ الدعوۃ، ستمبر ۱۹۹۳ء)

﴿۱۰﴾

کتاب

الْجِهَادِ

ہندوستان سے جہاد والی حدیث کا جائزہ

س "ہندوستان کے جہاد" کی فضیلت کے بارے میں حدیث بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میری اُمت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم سے آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ایک وہ جو ہندوستان کے خلاف جہاد کرے گا اور دوسرا وہ جو عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر دجال کے خلاف لڑے گا" اِس حدیث کی سند کے بارے میں وضاحت کر دیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی اور یہ بھی وضاحت کر دیں کہ ہندوستان پرانا نام ہے یا اس وقت رکھا گیا جب پاکستان و ہندوستان بنے؟ (ابو ہریرہ' لاہور)

ج ہندوستان کے جہاد کی فضیلت کے بارے میں سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث امام نسائی اپنی سنن میں باب غزوۃ الہند کے تحت لائے ہیں اور یہ حدیث بایں سند مروی ہے:

((اَخْبَرَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحِیْمِ قَالَ حَدَّثَنَا اَسَدُ بْنُ مُوْسٰی قَالَ ثَنَا بَقِیَّةُ قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبُوْبَکْرِ الزُّبَیْدِیُّ عَنْ اَخِیْهِ مُحَمَّدِ بْنِ الْوَلِیْدِ عَنْ لُقْمَانَ بْنِ عَامِرٍ عَنْ عَبْدِالْاَعْلٰی بْنِ عَدِیِّ الْبَهْرَانِیِّ عَنْ ثَوْبَانَ))

اس حدیث کی سند کے تمام راوی ثقہ و صدوق ہیں سوائے ابوبکر الزبیدی کے اس کو حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے تقریب ص ۳۹۷ پر مجہول الحال لکھا ہے۔ یعنی اس کے حالات معلوم نہیں لیکن محمد بن الولید جو اس کا استاد ہے' اس سے اس کے علاوہ عبداللہ بن سالم بھی یہ حدیث بیان کرتے ہیں جیسا کہ مسند احمد ۲۷۸/۵ پر مروی ہے۔ عبداللہ بن سالم کو امام ذہبی نے الکاشف ۵۵۵/۱ پر صدوق قرار دیا ہے اور اسی طرح حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے تقریب میں رقم کیا ہے۔ لہٰذا اس سند میں ابوبکر الزبیدی کا مجہول الحال ہونا مضر نہیں کیونکہ عبداللہ نے اس کی متابعت کی ہے' اس

لیے یہ روایت صحیح ہے۔ علامہ البانی حفظہ اللہ نے صحیح الجامع الصغیر ۲/۴۲ ۷ پر اس روایت کو مسند احمد' نسائی اور امام مقدسی رحمۃ اللہ علیہ کی ضیاء مختارہ کے حوالے سے درج کر کے تصحیح کی ہے اور سلسلہ احادیث الصحیحہ میں ۱۹۳۴ بھی درج کیا ہے۔

اس لیے معترضین کا اس حدیث کی سند پر اعتراض درست نہیں ہے۔

ہندوستان کو تقسیم پاک و ہند کے وقت اس نام سے موسوم نہیں کیا گیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی اس کو ہند ہی کہا جاتا تھا جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث سے ہی یہ بات عیاں ہے اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ جو پاکستان و ہندوستان کی تقسیم سے کئی سو سال پہلے اس دنیائے فانی سے رحلت فرما چکے ہیں' نے بھی غزوۂ ہند کا باب باندھ کر اس تردد کو دُور فرما دیا ہے۔

11
کتاب
النِّکَاحِ

عورت کا حقیقی ولی کے بغیر نکاح کرنا

س کیا عورت اپنے حقیقی ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کسی عارضی ولی کے ذریعے کر سکتی ہے؟

ج (من رحمت اللہ ربانی)

((عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَيُّمَا امْرَاَةٍ نَكَحَتْ نَفْسَهَا بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَاِنْ دَخَلَ بِهَا فَلَهَا الْمَهْرُ بِمَ اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا فَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لاَّ وَلِيَّ لَهٗ)) (احمد والترمذی)

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کر لیا پس اس کا نکاح باطل ہے۔ یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی اور اگر مرد نے اس کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کر لیے ہیں تو اس عورت کو مہر ادا کیا جائے کیونکہ مرد نے اس کی فرج کو حلال کیا ہے (اور جدائی ڈلوا دی جائے گی) اور اگر عورت کے حقیقی ولی باپ کے علاوہ ولی ہوں اور وہ آپس میں جھگڑا کریں تو اس وقت حاکم ہی اس عورت کا ولی ہو گا جس کا کوئی ولی نہ ہو۔"

اس حدیث سے صاف واضح ہے کہ حقیقی ولی کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہو گا۔ عورت کی رضامندی اور ولی کی اجازت دونوں ضروری ہیں۔ امام حاکم نے نکاح میں ولی کی قید کئی صحابہ و صحابیات سے ثابت کی ہے۔ اس کے خلاف اگر عورت کو ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے کی اجازت دی جائے تو معاشرہ میں بہت بگاڑ اور فساد پیدا ہو گا اور عصمتیں برباد ہوں گی اور عصمتوں کا تحفظ ختم ہو جائے گا۔

(مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۶ء)

باپ کی موجودگی میں چچا کی ولایت

س لڑکی چچا زاد کے ساتھ شادی شدہ ہے۔ اس کے خاوند نے نئی شادی کر لی اور اپنی اس پہلی بیوی کو طلاق دے دی۔ یہ مطلقہ اپنے چچا یعنی سسر کے پاس رہ رہی ہے۔ اب اس مطلقہ کے سسرال اس کے طلاق دینے والے خاوند کے چھوٹے بھائی سے اس کا نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ لڑکی کے والدینؒ اس پر رضا مند نہیں ہیں۔ کیا یہ نکاح صحیح ہو سکتا ہے؟ (ایک سائل : مسلمان بھائی)

ج یہ نکاح درست نہیں ہے اس لیے کہ عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتی اور قریبی ولی کی موجودگی میں دور والا عزیز ولی نہیں بن سکتا اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ ﴿ فَإِذَا فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (بقرہ : ۲۳۲)

"جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جبکہ وہ معروف طریقے سے باہم نکاح پر راضی ہوں"۔

اس آیت میں اولیاء کو خطاب ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو منع کر دیا ہے کہ وہ عورتوں کو ان کی مدت ختم ہونے کے بعد شادی سے روکیں۔ اگر عورت پر اولیاء کا اختیار نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو روکنے کی کیا ضرورت تھی۔ امام شافعی فرماتے ہیں :

هٰذِهٖ اٰيَةٌ فِي اشْتِرَاطِ الْوَلِيِّ اِلَّا لَمَا كَانَ لِعَضْلِهٖ مَعْنًى

"یہ آیت عورت کے نکاح میں ولی کی شرط لگانے کے لیے واضح ترین دلیل ہے"

ورنہ ﴿ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ امام ابنِ کثیرؒ ابنِ العربی اور امام قرطبی سے بھی اس طرح کا قول مذکور ہے۔ حدیث میں ہے جو کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں :

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ))

"ولی کے بغیر نکاح درست نہیں ہے"
ابوداود' ترمذی' نسائی' ابنِ ماجہ' ابنِ حبان اور امام حاکم کے علاوہ علامہ ابنِ القیم نے بھی تہذیب السنن میں اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ ناصرالدین البانی بھی اس کے صحیح ہونے کے قائل ہیں۔ دوسری حدیث میں ہے جو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں:
((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا امْرَاَةٍ نُكِحَتْ بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ))
"کہ جونسی عورت بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرتی ہے تو اس کا نکاح باطل ہے' باطل ہے' باطل ہے"۔
(صحيح الجامع الصغير' مستدرك حاكم و سنن الترمذی وقال حسن)
علامہ ناصرالدین البانی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔ مسئلہ مسئولہ میں اگرچہ لڑکی کا چچا بھی اس کے اولیاء میں شامل ہے لیکن والد کی موجودگی میں وہ ولی نہیں کیونکہ جب قریبی ولی موجود ہو تو دور والے عزیز کی ولایت کا اعتبار نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی ولایت جائز ہے جیسا کہ امام ابنِ قدامہ فرماتے ہیں:
اِنْ زَوَّجَ الْمَرْاَةَ الْوَلِيُّ الْاَبْعَدُ مَعَ حُضُوْرِ الْوَلِيِّ الْاَقْرَبِ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ فَاَجَابَتْهُ اِلٰى زَوَاجِهَا فَالْعَقْدُ فَاسِدٌ
"اگر عورت کا دور والا ولی قریبی ولی کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر عورت کا نکاح کردیتا ہے تو یہ نکاح فاسد ہے خواہ عورت اس کو قبول ہی کر لے"
(المغنی لابن قدامہ ج ۷' ص ۳۶۴' معجم الفقه الحنبلی ج ۲' ص ۹۸۴)
کیونکہ ولی ہونا تعصیب سے ہے جس طرح قریبی عصبہ کے ہوتے ہوئے دور والے عصبات محروم ہوتے ہیں اسی طرح قریبی ولی کی موجودگی میں دور والے کو اس کا اختیار نہیں ہے اور میراث میں یہ ترتیب صحیح حدیث سے ثابت ہے اور یہ بات

بھی مسلم ہے کہ قریبی ولی دوسرے اولیاء سے عورت کی مصلحت پر زیادہ حریص ہوتا ہے اور اس پر شفقت اور رحم کے لحاظ سے بھی دوسروں سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے یہ حق صرف اسی کو ہونا چاہئے ہاں اگر یہ خود کسی دوسرے کو اجازت دے دیتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم (مجلۃ الدعوۃ' دسمبر/ ۱۹۹۴ء)

بغیر ولی کے نکاح

س کیا کسی عورت کا نکاح بغیر ولی کے ہو سکتا ہے ایک عورت کی ولیہ اس کی ماں ہے لیکن وہ نکاح کے اخرجات برداشت نہیں کر سکتی تو کیا اس کی ولایت بہن کر سکتی ہے قرآن و سنت سے وضاحت کریں۔ (سہیل' مری)

ج عورت کے نکاح کے لیے ولی کا ہونا ضروری ہے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح درست نہیں اگر عورتوں کے درمیان مردوں کا واسطہ نہ ہو تو یہ بات عیاں ہے کہ ہر کام میں بے راہ روی اور عریانی و فحاشی کا خطرہ ہے۔ مغرب زدہ افراد کی حالت یہ ہے کہ ان کے ہاں مَرد و زن کا اختلاط' کھلے عام ملاقاتیں اور دیگر کئی برائیاں پائی جاتی ہیں اور اسی اختلاط وغیرہ کے باعث لڑکی اور لڑکا گھر سے فرار اختیار کر جاتے ہیں جبکہ لڑکی والوں کے گھر خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ عدالت کی طرف رجوع کر کے نکاح کر لیتے ہیں اور جو عورت اس طرح کھلے عام اپنا نکاح خود جا کر کرتی ہے اور اس میں ولی کی اجازت شامل نہیں ہوتی تو اس کا نکاح درست نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کے زانیہ ہونے کی علامت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (بقرہ : ۲۳۲)

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو تم ان کو اپنے خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو' جب وہ آپس میں اچھی طرح راضی ہوں۔"

اسی آیت کا شان نزول ہے کہ سیدنا معقل بن یسار کی بہن کو اس کے خاوند

نے طلاق دے دی حتیٰ کہ عدت گزر گئی رجوع کا موقع نہ رہا اور وہ عدت کے گزرنے کے بعد آپس میں راضی ہو گئے اور دوبارہ نکاح کرنا چاہتے تھے تو معقل بن یسار جو اپنی بہن کے ولی تھے انہوں نے نکاح کرنے سے انکار کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم ان کو نکاح سے نہ روکو۔ بخاری ۱۱/۱۹، ۹۰۸، ترمذی ۷۶/۴، ابوداؤد ۱۹۲/۲، طیالسی ۳۵/۱، دارقطنی ۲۲۳/۳، حاکم ۱۷۴/۲، ابن جریر ۴۴۸/۲۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عورت کا نکاح ولی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے فرمایا ﴿ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾

امام ابوبکر ابنِ العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" فَنَهَى اللّٰهُ تَعَالٰى اَوْلِيَاءَ الْمَرْاَةِ مَنْ مَنَعَهَا عَنْ نِكَاحِ مَنْ تَرْضَاهُ دَلِيْلٌ قَاطِعٌ عَلٰى اَنَّ الْمَرْاَةَ لَا حَقَّ لَهَا فِي مُبَاشَرَةِ النِّكَاحِ وَاِنَّمَا هُوَ حَقُّ الْوَلِيِّ خِلَافًا لِاَبِيْ حَنِيْفَةَ وَلَوْلَا ذَالِكَ لَمَا نَهَاهُ اللّٰهُ عَنْ مَنْعِهَا۔"

"اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ولیوں کو اس بات سے روکا ہے کہ جس کے ساتھ وہ برضا و رغبت نکاح کرنا چاہتی ہیں، انہیں منع نہ کرو، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ عورت کو کھلے بندوں نکاح کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ حق صرف ولی کا ہے امام ابو حنیفہ کا مذہب اس کے خلاف ہے اگر یہ حق ولی کا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ انہیں منع کرنے سے نہ روکتا۔" (احکام القرآن ۲۰۱/۱)

﴿ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ﴾ (البقرہ : ۲۲۱)

"اور اپنی عورتوں کو مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں"

مولانا عبدالماجد دریا بادی رحمہ اللہ تفسیر ماجدی ص ۸۹ حاشیہ ۸۱۸ پر رقمطراز ہیں : ﴿ لَا تُنْكِحُوْا ﴾ خطاب مردوں سے ہے کہ تم اپنی عورتوں کو کافروں کے نکاح میں نہ دو۔ حکم خود عورتوں کو براہِ راست نہیں مل رہا کہ تم کافروں کے نکاح میں نہ جاؤ۔ یہ طرزِ خطاب بہت پُر معنی ہے۔ صاف اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ مسلمان عورتوں کا نکاح مردوں کے واسطہ سے ہونا چاہئے۔

امام ابوبکر ابنِ العربی (احکام القرآن ۱۵۸/۱) پر رقمطراز ہیں :

قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ : النِّكَاحُ بِوَلِيٍّ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى ثُمَّ قَرَأَ ﴿ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ وَهِيَ مَسْئَلَةٌ بَدِيْعَةٌ وَّدَلَالَةٌ صَحِيْحَةٌ

"امام محمد بن علی بن حسین نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب کی رو سے نکاح بذریعہ ولی ہے پھر ﴿ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ والی آیت تلاوت کی"

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ((قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ)) "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ولی کے بغیر نکاح نہیں"۔

(ابوداؤد مع عون ۱۰۱/۶' ترمذی ۲۲۶/۴' ابنِ ماجه ۵۸۰/۱' دارمی ۶۱/۲' احمد ۳۹۴/۴' ۴۱۳' دارقطنی ۲۱۸/۳' بیهقی ۱۰۷/۷' شرح السنة' المنتقی لابن جارود (۷۰۱' ۷۰۲' ۷۰۳' ۷۰۴)

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَيُّمَا امْرَاَةٍ تَزَوَّجَتْ بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَاِنْ دَخَلَ بِهَا فَلَهَا الْمَهْرُ بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا وَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَّا وَلِيَّ لَهٗ))

"جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا' اس کا نکاح باطل ہے' اگر اس مرد نے اس عورت کے ساتھ دخول کیا تو اس عورت کے لیے حق مہر ہے' اس وجہ سے جو اس مرد نے اس کی فرج کو حلال سمجھا اور اگر عورت کی ولایت میں اختلاف کریں تو حاکم اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہیں"۔

یہ حدیث المنتقی لابن جارود (۷۰۰) ۳۸/۱' ابوداؤ مع عون ۹۸/۶' ترمذی ۲۲۷/۴' ابنِ ماجہ ۵۸۰/۱' ۶۲/۲' مسند احمد ۴۷/۲' ۱۶۵' حمیدی ۱۲/۱' ۱۱۳' ابنِ حبان (۱۲۴۸)' دارقطنی ۲۲۱/۳' حاکم ۱۶۸/۲' بیہقی ۱۰۵/۷' شرح السنہ ۳۹/۲' شافعی ۱۱/۲' طیالسی (۱۴۶۳) میں موجود ہے۔

علاوہ ازیں یہ روایت اور اس کی ہم معنی روایات بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں جن کی تعداد تیس (۳۰) تک پہنچ گئی ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی تلخیص الحبیر ص ۲۹۵ اور امام شوکانی نیل الاوطار ۶/۳۶ پر رقمطراز ہیں :

" قَالَ الْحَاكِمُ وَقَدْ صَحَّتِ الرِّوَايَةُ فِيهِ عَنْ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَائِشَةَ وَأُمِّ سَلَمَةَ وَزَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ ثُمَّ سَرَدَ ثَلَاثِيْنَ صَحَابِيًّا وَقَدْ جَمَعَ الدِّمْيَاطِيُّ طُرُقَهُ مِنَ الْمُتَأَخِّرِيْنَ۔"

"امام حاکم فرماتے ہیں ازواجِ مطہرات سیدہ عائشہ، سیدہ اُم سلیم، سیدہ زینب رضی اللہ عنہن سے یہ روایت صحیح ثابت ہے یہاں تک کہ ۳۰ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام ذکر کیے اور متاخرین میں سے امام دمیاطی نے اس حدیث کے تمام طرق ذکر کیے ہیں۔

امام قاضی شوکانی ایک اور مقام پر رقم طراز ہیں کہ سیدنا علی، سیدنا عمر، سیدنا ابنِ عباس، سیدنا عبداللہ بن عمر، سیدنا عبداللہ بن مسعود، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، حسن بصری، سعید بن مسیب، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ، امام احمد، امام اسحٰق بن راہویہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم اور جمہور اہل علم اس طرف گئے ہیں کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں۔

امام ابنِ منذر نے فرمایا کسی صحابی سے اس کا خلاف ثابت نہیں۔ (نیل الاوطار ۶/۱۳۶)۔ ان دلائل سے معلوم ہوا کہ عورت کے نکاح کے لیے ولی کا ہونا لازمی ہے اور ولایت کا حق صرف مردوں کو ہے۔

مذکورہ سوال میں ماں کے علاوہ ولی بنانے کے لیے بہن کا ذکر کیا گیا ہے وہ اخراجات برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ بہن بھی عورت ہے اس لیے ولایت کا حق وہ بھی نہیں رکھتی۔ رہا اخراجات کا معاملہ تو یہ دور حاضر کی رسومات ہیں وگرنہ اسلام کے اندر جہیز وغیرہ کے لیے لڑکی والوں پر کوئی پابندی نہیں، اسلامی طریقہ کی رو سے نکاح کے لیے اخراجات مرد کے ذمہ آتے ہیں جیسا کہ حق مہر اور ولیمہ وغیرہ کے اخراجات اور نکاح کے بعد عورت کے اخراجات کی ذمہ داری اس مرد پر

ہوتی ہے جس کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا جاتا ہے۔ والدین کو اس معاملہ میں کسی مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس لیے دورِ حاضر کی رسومات اور ہندووانہ طرز عمل سے ہٹ کر اگر اسلامی طریقہ کے مطابق نکاح کریں تو کسی مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بہرصورت عورت کا نکاح ولی کے بغیر جائز نہیں۔ هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ (مجلۃ الدعوۃ' دسمبر/ ۱۹۹۳ء)

ولی کے بغیر نکاح کی شرعی حیثیت

شریعت اسلامیہ میں مرد و زن کو بدکاری فحاشی' عریانی اور بے حیائی سے محفوظ رکھنے کے لیے نکاح کی انتہائی اہمیت وارد ہوئی ہے۔ شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے اسے راہ راست سے ہٹانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ موجودہ معاشرے میں بھی اُمت مسلمہ میں بدکاری و فحاشی کو عروج دینے کے لیے مختلف یہودی ادارے اور ان کے متبعین دن رات مصروف عمل ہیں جنہوں نے انسانی حقوق کے تحفظ اور آزادی نسواں کے نام پر کئی ادارے اور سوسائٹیز بنا کر مسلمان ممالک میں فحاشی اور بے حیائی کے پنجے تیز کئے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یورپ کی طرح ہمارے مسلمان معاشرے کو بھی آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے رسول مکرم ﷺ نے اس قباحت سے بچانے کے لیے آنکھ اور شرمگاہ کی حفاظت کے لیے مسلم مرد و زن کے لیے نکاح کی بڑی اہمیت بیان کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَنْكِحُوا الْأَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (النور: ۳۲)

"تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اللہ بڑی وسعت والا اور علم والا ہے"۔

آگے فرمایا:

﴿ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ﴾

"اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انہیں چاہئے کہ عفت مآبی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کردے"۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کا امر بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا کہ جنہیں نکاح کی استطاعت نہ ہو وہ اپنے آپ کو پاک و صاف رکھیں اور بدکاری و زنا سے بچے رہیں۔ اس کی مزید تشریح اس حدیث سے ہوتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ))

"اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شخص اسبابِ نکاح کی طاقت رکھتا ہو وہ نکاح کرے کیونکہ یہ نگاہ کو نیچا اور شرمگاہ کو محفوظ رکھتا ہے اور جو اس کی طاقت نہ رکھے وہ روزے رکھے کیونکہ روزے آدمی کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا کر دیتے ہیں"۔ (بخاری و مسلم)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فَمَنْ لَّمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي))

"نکاح کرنا میری سنت ہے جس نے میری سنت پر عمل نہ کیا وہ مجھ سے نہیں"

(ابنِ ماجہ: ۱۸۴۶)

اسی طرح قرآن مجید میں نکاح کو سکون اور محبت و رحمت کا باعث قرار دیا گیا ہے اور کہیں ﴿ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ﴾ "کہہ کر بدکاری سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا بدکاری اور زناکاری سے بچنے کے لیے ہمیں نکاح جیسے اہم کام کو سرانجام دینا چاہئے اور اس کے لیے طریقہ کار رسول مکرم ﷺ کے بیان کردہ احکامات سے لینا چاہئے۔ آپؐ نے نکاح کے جو اصول و ضوابط ذکر فرمائے ان میں سے ایک یہ ہے کہ لڑکی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے اگر لڑکی اپنی مرضی سے گھر سے فرار اختیار کر کے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیتی ہے تو اس کا نکاح باطل قرار پاتا

ہے۔ عورت کے لیے اولیاء کی اجازت کے مسئلہ میں کتاب و سنت سے دلائل درج ذیل ہیں :

۱) اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ﴾ (البقرہ : ۲۲۱)

"اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ایک مومن غلام 'مشرک سے بہتر ہے۔ اگرچہ تمہیں بہت پسند ہو"۔

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد القرطبی ارقام فرماتے ہیں :

فِي هٰذِهِ الْاٰيَةِ دَلِيْلٌ بِالنَّصِّ عَلٰى اَنْ لَّا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ النِّكَاحُ بِوَلِيٍّ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى ثُمَّ قَرَأَ ﴿ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ ﴾

"یہ آیت کریمہ اس بات پر بطور نص کے دلیل ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا امام محمد باقر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نکاح کا بذریعہ ولی منعقد ہونا اللہ کی کتاب میں موجود ہے پھر انہوں نے ﴿ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ آیت کریمہ پڑھی۔

(الجامع الاحکام القرآن ۴۹/۳)

مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں : ﴿ وَلَا تُنْكِحُوْا ﴾ خطاب مردوں سے ہے کہ تم اپنی عورتوں کو کافروں کے نکاح میں نہ دو۔ حکم خود عورتوں کو براہِ راست نہیں مل رہا ہے کہ تم کافروں کے نکاح میں نہ جاؤ۔ یہ طرزِ خطاب بہت پُر معنی ہے۔ صاف اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ مسلمان عورتوں کا نکاح مردوں کے واسطہ سے ہونا چاہیے۔ (تفسیر ماجدی ص ۸۹)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی رقم طراز ہیں :

"یہ خطاب یا تو (عورتوں) کے ولیوں کو ہے یا حکام کو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مشرک مردوں سے نکاح نہ کرنے دو"۔ (تفسیر مظہری ۴۵۸/۱)

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس بات کی توضیح فرما دی ہے کہ مسلمان عورت کے نکاح کا انعقاد اس کے ولی کے ذریعہ ہونا چاہیے اس لیے فرمایا:
﴿ وَلَا تُنْكِحُوْا ﴾ کہ تم اپنی عورتوں کو مشرکوں کے نکاح میں نہ دو اگر ولی کا نکاح میں ہونا لازم نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس انداز سے خطاب نہ فرماتا بلکہ عورتوں کو حکم دیتا کہ تم ان کے ساتھ نکاح نہ کرو۔ حالانکہ ایسے نہیں فرمایا۔ دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (بقرہ : ۲۳۲)

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت کو پورا کرلیں تو انہیں اپنے خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو جب وہ آپس میں اچھی طرح راضی ہو جائیں۔"

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری شرح صحیح بخاری ۹/۹۴ رقمطراز ہیں:

" وَهِيَ أَصْرَحُ دَلِيْلٍ عَلَى اعْتِبَارِ الْوَلِيِّ وَإِلَّا لَمَا كَانَ لِعَضْلِهٖ مَعْنًى وَلِأَنَّهَا لَوْ كَانَ لَهَا أَنْ تُزَوِّجَ نَفْسَهَا لَمْ تَحْتَجْ إِلَى أَخِيْهَا وَمَنْ كَانَ أَمْرُهٗ إِلَيْهِ لَا يُقَالُ إِنَّ غَيْرَهٗ مَنَعَهٗ مِنْهُ۔"

"یہ آیت ولی کے معتبر ہونے کی سب سے واضح دلیل ہے اور اگر ولی کا اعتبار نہ ہوتا تو اس کو روکنے کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا۔ اگر معقل کی بہن کے لیے اپنا نکاح خود کرنا جائز ہوتا تو وہ اپنے بھائی کی محتاج نہ ہوتی اور اختیار جس کے ہاتھ میں ہو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی نے اس کو روک دیا"۔

امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

" فَفِي الْآيَةِ دَلِيْلٌ عَلَى أَنَّهٗ لَا يَجُوْزُ النِّكَاحُ بِغَيْرِ وَلِيٍّ لِأَنَّ أُخْتَ مَعْقِلٍ كَانَتْ ثَيِّبًا وَلَوْ كَانَ الْأَمْرُ إِلَيْهَا دُوْنَ وَلِيِّهَا لَزَوَّجَتْ نَفْسَهَا وَلَمْ تَحْتَجْ إِلَى وَلِيِّهَا مَعْقِلٍ فَالْخِطَابُ إِذًا فِي قَوْلِهٖ تَعَالٰى ﴿ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾

لِلْاَوْلِیَاءِ وَاِنَّ الْاَمْرَ اِلَیْھِمْ فِی التَّزْوِیْجِ مَعَ رِضَاھُنَّ

"اس آیت کریمہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ ولی کے بغیر نکاح جائز نہیں اس لیے کہ معقل بن یسار کی بہن طلاق یافتہ تھیں اور اگر ولی کے بغیر معاملہ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اپنا نکاح خود کر لیتی اور اپنے ولی معقل کی محتاج نہ ہوتی اور اس آیت کریمہ ﴿ فَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ ﴾ میں خطاب اولیاء کو ہے نکاح میں عورت کی رضامندی کے باوجود معاملہ مردوں پر موقوف ہے"۔

مذکورہ بالا آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ معقل بن یسار کی بہن کو ان کے خاوند نے طلاق دے دی پھر عدت کے پورا ہو جانے کے بعد وہ دونوں آپس میں دوبارہ نکاح کرنے پر راضی ہو گئے تو معقل بن یسار نے اپنی بہن کا نکاح دینے سے انکار کر دیا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ مسئلہ سمجھا دیا کہ عورت کے ولی کا حق اس کے نکاح کے انعقاد میں موجود ہے اگر ایسی بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ مردوں کو منع نہ کرتا۔ مردوں کو خطاب کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ حق ولایت اللہ تعالیٰ نے مردوں کے لیے رکھا ہے اور یہی بات امام بغوی نے اپنی تفسیر معالم التنزیل ۲/۱۱۲ امام ابنِ قدامہ نے المغنی ۷/۳۳۸ اور امام ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر ۱/۳۰۲ میں لکھی ہے اور اسی بات کو امام طبری نے اپنی تفسیر طبری ۲/۴۸۸ میں صحیح قرار دیا ہے۔ فتح الباری کتاب النکاح ۹/۹۰۔

اسی طرح نکاح کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَانْكِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ ﴾ (النساء : ۲۵) ﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ (النور : ۳۲)

ان آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے عورت کے اولیاء کو خطاب کیا ہے کہ وہ نکاح کرنے کے امور کو سرانجام دیں۔ اگر نکاح کا معاملہ عورت کے ہاتھ میں ہوتا تو اللہ تعالیٰ عورتوں کو خطاب کرتے مردوں کو خطاب نہ کرتے۔ ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی ۳/۴۹۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت کئی ایک احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

دورِ جاہلیت میں ولی کی اجازت کے ساتھ نکاح کے علاوہ بھی نکاح کی کئی صورتیں رائج تھیں جن کی تفصیل صحیح بخاری میں اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں :

((فَنِكَاحٌ مِنْهَا نِكَاحُ النَّاسِ الْيَوْمَ يَخْطُبُ الرَّجُلُ إِلَى الرَّجُلِ وَلِيَّتَهُ أَوْ ابْنَتَهُ فَيُصْدِقُهَا ثُمَّ يَنْكِحُهَا))

"ان میں سے ایک نکاح جو آج کل لوگوں میں رائج ہے کہ آدمی دوسرے آدمی کے پاس اس کی زیر ولایت لڑکی یا اس کی بیٹی کے لیے نکاح کا پیغام بھیجتا۔ اسے مہر دیتا پھر اس سے نکاح کر لیتا"۔

پھر نکاح کی کچھ دوسری صورتیں ذکر کیں جو کہ ولی کی اجازت کے بغیر رائج تھیں آخر میں فرمایا :

((فَلَمَّا بُعِثَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ هَدَمَ نِكَاحَ الْجَاهِلِيَّةِ كُلَّهُ إِلَّا نِكَاحَ النَّاسِ الْيَوْمَ))

"جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا گیا تو آپ نے جاہلیت کے تمام نکاح منہدم کر دیئے سوائے اس نکاح کے جو آج کل رائج ہے"۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں نکاح کی صرف ایک صورت باقی رکھی جو کہ ولی کی اجازت پر مبنی ہے اور ولی کی اجازت کے علاوہ نکاح کی تمام صورتوں کو منہدم کر دیا۔ لہٰذا جو نکاح ولی کی اجازت کے بغیر کیا جائے وہ جاہلیت کے نکاح کی صورت ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند ایک احادیث صحیحہ مرفوعہ ملاحظہ فرمائیں :

((عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ))

"سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے"۔ (ابوداؤد مع عون ۱۰۱/۶، ۱۰۲ ۔ ترمذی ۲۲۶/۴، ابن ماجہ

۵۸۰/۱' دارمی ۲/۶۱' ابنِ حبان (۱۲۴۳)' طحاوی ۸/۴' ۹' ۳۶۴/۴' ۳' احمد ۴/۴۱۳' ۴۹۴' طیالسی (۵۲۳)' دارقطنی ۲۱۸/۳-۲۱۹' حاکم ۱۷۰/۲' بیہقی ۱۰۷/۷' المحلی ۴۵۲/۹' شرح السنہ ۳۸/۹' عقود الجواہر المنیفہ ۱۴۶/۲)

امام حاکم فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں سیدنا علی' سیدنا عبداللہ بن عباس' سیدنا معاذ بن جبل' سیدنا عبداللہ بن عمر' سیدنا ابوذر غفاری' سیدنا مقداد بن اسود' سیدنا عبداللہ بن مسعود' سیدنا جابر بن عبداللہ' سیدنا ابوہریرہ' سیدنا عمران بن حصین' سیدنا عبداللہ بن عمرو' سیدنا مسور بن مخرمہ اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں اور اکثر صحیح ہیں اور اسی طرح اس مسئلہ میں ازواج النبی سیدہ عائشہ' سیدہ اُم سلمہ اور سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہن سے بھی صحیح روایات مروی ہیں۔ (مستدرک حاکم ۱۷۲/۲)

یعنی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے علاوہ تیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس حدیث کے راوی ہیں اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان عالی شان اس بات پر نص قطعی کا حکم رکھتا ہے کہ ولی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((اَیُّمَا امْرَاَۃٍ نَکَحَتْ بِغَیْرِ اِذْنِ وَلِیِّھَا فَنِکَاحُھَا بَاطِلٌ ثَلَاثًا فَاِنْ اَصَابَھَا فَلَھَا الْمَھْرُ بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِھَا فَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَہٗ))

''جس بھی عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے۔ آپ نے یہ بات تین دفعہ ارشاد فرمائی اگر اس مرد نے اس کے ساتھ صحبت کر لی تو عورت کو مہر دینا ہے اس وجہ سے کہ جو اُس نے اس کی شرمگاہ کو حلال سمجھا اگر وہ (اولیا) جھگڑا کریں تو جس کا کوئی ولی نہ ہو حاکم اس کا ولی ہے''۔ (شرح السنہ ۳۹/۲' ابوداؤد ۹۸/۶' ترمذی ۲۲۷/۴' ابن ماجہ ۵۸۰/۱' دارمی ۶۲/۲' شافعی ۱۱/۲' احمد ۴۷/۶' ۱۶۵' طیالسی (۱۴۶۳)' حمیدی ۱۱۲/۱' ۱۱۳' ابنِ حبان (۱۲۴۱) طحاوی ۷/۳'

دار قطنی ۳/۲۲۱' حاکم ۲/۱۶۸' بیہقی ۷/۱۰۵)

اس حدیث کی شرح میں محدث عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں :

"وَالْحَدِيْثُ يَدُلُّ عَلٰى اَنْ لَّا يَصِحَّ النِّكَاحُ اِلَّا بِوَلِيٍّ۔"

"یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں"۔

آگے مزید فرماتے ہیں :

"وَالْحَقُّ اَنَّ النِّكَاحَ بِغَيْرِ الْوَلِيِّ بَاطِلٌ كَمَا يَدُلُّ عَلَيْهِ اَحَادِيْثُ الْبَابِ"

"حق یہی ہے کہ ولی کے بغیر نکاح باطل ہے جیسا کہ اس پر باب کی احادیث دلالت کرتی ہیں۔" (عون المعبود ۲/۱۹۱' طبع ملتانی)

علاوہ ازیں حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں "اَیُّمَا" کلمہ عموم ہے جس میں باکرہ' ثیبہ چھوٹی بڑی ہر طرح کی عورت داخل ہے کہ جو بھی عورت ولی کے بغیر اپنا نکاح از خود کرے اس کا نکاح باطل ہے۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث اس بات پر نص قطعی ہے کہ ایسا نکاح باطل ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں :

"وَالْعَمَلُ فِي هٰذَا الْبَابِ عَلٰى حَدِيْثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ)) عِنْدَ اَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَعَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ وَّعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبَّاسٍ وَّ اَبُوْهُرَيْرَةَ وَغَيْرُهُمْ وَهٰكَذَا رُوِيَ عَنْهُ بَعْضُ فُقَهَاءِ التَّابِعِيْنَ اَنَّهُمْ قَالُوْا ((لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ)) مِنْهُمْ سَعِيْدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ وَالْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ وَ شُرَيْحٌ وَاِبْرَاهِيْمُ النَّخْعِيُّ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِالْعَزِيْزِ وَغَيْرُهُمْ وَبِهٰذَا يَقُوْلُ سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ وَالْاَوْزَاعِيُّ وَابْنُ الْمُبَارَكِ وَمَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَاَحْمَدُ وَاِسْحَاقُ۔"

"اس مسئلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کہ "ولی کے بغیر نکاح نہیں" پر اہل علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عمر بن خطاب' علی بن ابی طالب' عبداللہ بن عباس' اور ابو ہریرہ

کا عمل ہے اور اسی طرح تابعین فقہاء میں سے سعید بن مسیب' حسن بصری' شریح' ابراہیم النخعی' اور عمر بن عبدالعزیز وغیرہ اور امام ثوری' امام اوزاعی' امام عبداللہ بن مبارک' امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل اور امام اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی موقف ہے"۔ (ترمذی ۳/۴۱۰'۴۱۱)

اب ائمہ محدثین کے چند حوالہ جات پیش خدمت ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ : صاحب بدایۃ المجتہد ۲/۷ لکھتے ہیں : " فَذَهَبَ مَالِكٌ اِلٰى اَنَّهٗ لَا يَكُوْنُ نِكَاحٌ اِلَّا بِوَلِيٍّ وَاَنَّهَا شَرْطٌ فِي الصِّحَّةِ ۔"

"امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مذہب ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے اور یہ ولایت نکاح کی صحت میں شرط ہے یعنی اگر ولایت مفقود ہوئی تو نکاح درست نہیں ہو گا"۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ : فقہ حنبلی میں بھی نکاح کے لیے ولی ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ امام ابنِ قدامہ حنبلی رقمطراز ہیں :

" اِنَّ النِّكَاحَ لَا يَصِحُّ اِلَّا بِوَلِيٍّ وَلَا تَمْلِكُ الْمَرْاَةُ تَزْوِيْجَ نَفْسِهَا وَلَا غَيْرِهَا وَلَا تَوْكِيْلَ غَيْرِ وَلِيِّهَا فِيْ تَزْوِيْجِهَا فَاِنْ فَعَلَتْ لَمْ يَصِحَّ النِّكَاحُ رُوِيَ هٰذَا عَنْ عُمَرَ وَعَلِيٍّ وَّابْنِ مَسْعُوْدٍ وَّابْنِ عَبَّاسٍ وَّاَبِيْ هُرَيْرَةَ وَعَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَاِلَيْهِ ذَهَبَ سَعِيْدُ ابْنُ الْمُسَيَّبِ وَالْحَسَنُ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ وَجَابِرُ بْنُ زَيْدٍ وَّالثَّوْرِيُّ وَابْنُ اَبِيْ لَيْلٰى وَابْنُ شُبْرُمَةَ وَابْنُ الْمُبَارَكِ وَعُبَيْدُ اللّٰهِ الْعَنْبَرِيُّ وَالشَّافِعِيُّ وَاِسْحَاقُ وَاَبُوْ عُبَيْدَةَ وَرُوِيَ عَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ وَالْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ وَالْحَسَنِ بْنِ صَالِحٍ ۔"

"یقیناً ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں اور عورت اپنے اور اپنے علاوہ کسی دوسرے کے نکاح کی مختار نہیں اور نہ ہی اپنا نکاح کرانے کے لیے اپنے ولی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو ولی بنانے کی مختار ہے اگر اُس نے ایسا کیا تو نکاح صحیح نہیں ہو گا۔

یہ بات سیدنا عمر' سیدنا علی' سیدنا ابنِ مسعود' سیدنا ابنِ عباس' سیدنا ابو ہریرہ اور سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اس کی طرف امام سعید بن المسیب' امام حسن بصری' امام عمر بن عبدالعزیز' امام جابر بن زید' امام سفیان ثوری' امام ابنِ ابی لیلیٰ' امام ابنِ شبرمہ' امام ابن مبارک' امام عبیداللہ العنبری' امام شافعی' امام اسحاق بن راہویہ اور امام ابو عبیدہ گئے ہیں اور یہی بات امام ابنِ سیرین' امام قاسم بن محمد اور امام حسن بن صالح سے بھی روایت کی گئی ہے"۔ (المغنی لابن قدامہ ۹/۳۴۵)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ : اِس آیت ﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ کے بارے میں فرماتے ہیں :

" وَهٰذِهِ أَبْيَنُ آيَةٍ فِي كِتَابِ اللّٰهِ دَلَالَةً عَلٰى أَنْ لَيْسَ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَتَزَوَّجَ بِغَيْرِ وَلِيٍّ-"

"یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس بات پر دلالت کے اعتبار سے واضح ترین ہے کہ عورت کو بغیر ولی کے نکاح کرنے کی اجازت نہیں"۔

اور آگے مزید فرماتے ہیں :

إِنَّ الْعَقْدَ بِغَيْرِ وَلِيٍّ بَاطِلٌ (کتاب الام مختصر للامام مزنی ص ۱۶۳)

"ولی کے بغیر عقد قائم کرنا باطل ہے"۔

امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ : فرماتے ہیں :

" لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَعَلٰى هٰذَا فَلَا يَجُوْزُ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تُزَوِّجَ نَفْسَهَا وَلَا يَجُوْزُ لَهَا أَنْ تُوَكِّلَ فِيْ زَوَاجِهَا غَيْرَ وَلِيِّهَا وَإِذَا كَانَ لَا يَجُوْزُ لَهَا أَنْ تُزَوِّجَ نَفْسَهَا فَلَا تَجُوْزُ لَهَا أَنْ تُزَوِّجَ غَيْرَهَا مِنْ بَابِ أَوْلٰى-"

(موسوعة فقه سفيان ثوری ص ۷۹۳)

"ولی کے بغیر نکاح نہیں اور اسی بنا پر عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنا نکاح خود کرے اور نہ یہ جائز ہے کہ اپنے نکاح کے لیے اپنے ولی کے علاوہ کسی اور کو

متعین کرے اور جب اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنا نکاح خود کر سکے تو اس کے لیے کسی دوسری عورت کا نکاح کرنا بالاولی جائز نہیں۔"

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ : فرماتے ہیں :

لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَقَالَ الَّذِيْ بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ هُوَ الْوَلِيُّ فَإِنْ زَوَّجَتِ الْمَرْأَةُ نَفْسَهَا بِغَيْرِ وَلِيٍّ أَوْ وَكَّلَتْ غَيْرَ وَلِيِّهَا فِي تَزْوِيْجِهَا فَالنِّكَاحُ بَاطِلٌ وَيُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا قَبْلَ الدُّخُوْلِ وَبَعْدَهُ

"ولی کے بغیر نکاح نہیں اور ﴿ الَّذِيْ بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴾ سے مراد ولی ہے اگر عورت نے اپنا نکاح ولی کے بغیر خود کر لیا یا نکاح کرنے میں اپنے ولی کے علاوہ کسی دوسرے کو ولی بنا لیا تو یہ نکاح باطل ہے اور ان دونوں کے درمیان صحبت کرنے سے پہلے اور بعد جدائی کرا دی جائے گی۔" (موسوعہ فقہ الحسن بصری ۸۹۷)

امام ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ : یہ امام ابو حنیفہ کے استاد الاستاد ہیں اور ان کے اقوال پر فقہ حنفی کا دار و مدار ہے جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے فرماتے ہیں :

" لَيْسَ الْعَقْدُ بِيَدِ النِّسَاءِ إِنَّمَا الْعَقْدُ بِيَدِ الرِّجَالِ۔"

"عقد قائم کرنا عورتوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ مردوں کے ہاتھ میں ہے"

(ابن ابی شیبہ ۲۰۸/۱' موسوعہ فقہ ابراہیم النخعی ۶۷۷/۱)

ان تمام حوالہ جات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کتاب و سنت اور جمہور ائمہ محدثین کے نزدیک عورت کا نکاح ولی کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ جو عورت اپنا نکاح خود کر لیتی ہے ایسا نکاح باطل ہے اور ان دونوں کے درمیان جدائی کرا دی جائے گی تاکہ وہ ناجائز فعل کے مرتکب نہ ہوں۔

موجودہ دور میں کئی ایک ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں کہ لڑکیاں گھروں سے فرار اختیار کر کے اپنے عاشقوں کے ساتھ عدالت میں جا کر نکاح کرا لیتی ہیں اور مسلم

معاشرے کے لیے بالعموم اور ان کے والدین کے لیے بالخصوص ذلت و رُسوائی کا باعث بنتی ہیں۔ صائمہ کیس کا فیصلہ جو کہ دس مارچ ۹۷ء کو لاہور ہائی کورٹ کے ججوں نے کیا وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور صریح قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ ہمارے ملک کے جن دو ججوں نے اس پر جو ریمارکس (Remarks) لکھے وہ یہودیت کی حقوقِ نسواں کے نام سے پھیلائی ہوئی تحریکوں سے مرعوبیت کا شاخسانہ ہے جیسا کہ ایک جسٹس نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ "میں اپنی کوشش کے باوجود ایسا اصول نہیں ڈھونڈ سکا جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ قرار دیا جا سکتا ہو کہ بالغ مسلم لڑکی کا اپنے ولی کی مرضی کے بغیر نکاح ناجائز ہے"۔

مندرجہ بالا صریح دلائل کی روشنی میں مذکورہ جسٹس کا یہ بیان انتہائی غلط اور قرآن و سنت کے دلائل سے لاعلمی و ناواقفیت پر مبنی ہے اور انتہائی قابل افسوس ہے مسلمانوں کا قانون کتاب و سنت ہے جس میں ایسے دلائل اور اصول تواتر کے ساتھ موجود ہیں کہ مسلم لڑکی بالغ ہو یا مطلقہ یا کنواری کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتا جیسا کہ اوپر دلائل ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے ملک میں چونکہ انگریزی قانون رائج ہے جس کی بنا پر اکثر فیصلے کئے جاتے ہیں اور قرآن و سنت کو عملاً قانون سمجھا ہی نہیں جاتا اور یہ چیز کسی بھی مسلم کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ تمام مسلمانوں کو اپنے ہر قسم کے فیصلے طاغوتی عدالتوں کی بجائے قرآن و سنت کے ذریعے کروانے چاہئیں تاکہ عند اللہ ماجور ہو سکیں۔

شادی سے قبل زنا کے مرتکب افراد کا نکاح

س: کچھ عرصہ قبل کسی آدمی کی منگنی ہوئی پھر نکاح ہو گیا۔ اب جبکہ نکاح کو دو سال ہو چکے سائل کے بتانے پر پتہ چلا ہے کہ نکاح سے قبل اس کے لڑکی سے مراسم تھے جس سے وہ گناہ کے مرتکب ہو گئے اور نکاح سے قبل لڑکی حاملہ ہو گئی جس سے ان کا نکاح فاسد ہے لڑکا اور لڑکی دونوں صاحب علم ہیں اور اپنے اس فعل سے انتہائی شرمندہ ہیں، حمل بھی ضائع کروا کر خدا کے مجرم بنے اور دو سال گزر

جانے کے بعد بقول ان کے انہوں نے خوف خدا کے تحت جماع نہیں کیا' پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا ان کا نکاح دوبارہ ہو سکتا ہے؟ جبکہ ایک صاحب نے ان کو کہا ہے کہ آپ نے نکاح سے قبل جماع کیا ہے آپ زنا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب تک آپ پر شرعی حد نہ لگے آپ کا نکاح دوبارہ نہیں ہو سکتا۔ انتہائی پریشان کن مراحل کا سامنا ہے کہ دو سال سے ایک گھر میں زندگی گزار رہے ہیں یہ بات بھی پردہ میں ہے گھر والے بھی پریشان ہیں کہ دو سال تک ناامیدی کیوں ہے۔ لہٰذا آپ سے التماس ہے کہ آپ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا بہترین حل نکال کر بتائیں کہ کیا واقعی ان کا نکاح دوبارہ نہیں ہو سکتا اور کیا لازمی ان پر حد آتی ہے؟ جواب دے کر پریشانی کا ازالہ کیجئے اور شکریہ کا موقع دیجئے۔

ج اس میں کوئی شک نہیں کہ زنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے کسی انسان سے اگر یہ گناہ سرزد ہو جائے تو وہ اس پر شرمندہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لیتا ہے تو قرآن میں اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں :

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَّكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴾ (الفرقان : ۶۸۔۷۰)

"اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ ہی ایسی جان کو قتل کرتے ہیں جس کے قتل سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی یہ کام کرتا ہے وہ اپنے کئے کی سزا بھگتے گا۔ قیامت کے دن اس کے لیے عذاب دوگنا کیا جائے گا اور وہ اس میں ذلیل ہو کر رہے گا مگر جن لوگوں نے ایسے گناہوں سے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کئے اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا اور اللہ بخشنے والا بڑا مہربان ہے"

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر زنا سے توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتے ہیں اور جب اُس نے توبہ کر لی اور اس کا معاملہ حاکم تک نہ پہنچا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تو پھر اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے دنیا میں اس پر حد لازم نہیں ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث ہے عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے بعض محرمات سے اجتناب کے لیے بیعت لی۔ ان میں ایک زنا بھی تھا۔ آخر میں آپ نے فرمایا:

((فَمَنْ وَّفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذَالِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ اَصَابَ مِنْهَا شَيْئًا فَسَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ وَاِنْ شَاءَ غَفَرَلَهٗ))

"جس نے بیعت پوری کی اس کا اجر اللہ پر ہے اور جو ان میں سے کسی چیز میں مبتلا ہو گیا اور اسے اس کی سزا دی گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ بن جائے گی اور اگر وہ کسی گناہ کو پہنچا تو اللہ نے اس پر پردہ ڈال دیا پس وہ اللہ کی طرف ہے۔ اگر چاہے اسے عذاب دے دے اور اگر چاہے تو اسے بخش دے" (بخاری مع الفتح ۷/۲۶۰ و ۱۲/۷۵ یہ حدیث ترمذی' نسائی اور دارمی میں بھی موجود ہے)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر آدمی سے زنا وغیرہ سرزد ہو گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اس کے اقرار اور اصرار کے بغیر دنیا میں اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ اس سے بڑھ کر اگر کسی کو کسی دوسرے مسلمان کے بارہ میں کوئی ایسی چیز معلوم ہوتی ہے جس سے اس پر حد لازم آتی ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس کو آپس میں معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا:

((وَتَعَافُوا الْحُدُوْدَ فِيْمَا بَيْنَكُمْ فَمَا بَلَغَنِيْ مِنْ حَدٍّ فَقَدْ وَجَبَ))

"آپس میں حدود معاف کرو جو مجھ تک پہنچ گئی وہ واجب ہو گئی"

(صحیح سنن ابی داؤد البانی ج ۳' ص ۸۲۸' صحیح سنن نسائی ج ۳' ص ۸۷۷)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ امام، حاکم یا قاضی تک نہیں تو واجب نہیں ہوئی اس لیے صورت مسئولہ میں شرعی حد سائل پر واجب نہیں ہے جب تک وہ حاکم تک نہیں پہنچتی اس کا معاملہ اس کے ساتھ ہے اور زانی کا حد لگنے کے بغیر زانیہ سے نکاح ہو سکتا ہے جب دونوں توبہ صادقہ کر لیں۔ تفسیر ابنِ کثیر میں عبداللہ بن عباس سے صحیح سند سے مروی ہے۔ کسی نے پوچھا:

((اِنِّیْ کُنْتُ اُلِمُّ بِامْرَاَۃٍ آتِی مِنْھَا مَا حَرَّمَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ عَلَیَّ فَرَزَقَ اللّٰہُ مِنْ ذَالِکَ تَوْبَۃً فَاَرَدْتُّ اَنْ اَتَزَوَّجَھَا فَقَالَ النَّاسُ اِنَّ الزَّانِیَ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً فَقَالَ اِبْنُ عَبَّاسٍ لَیْسَ ھٰذَا فِیْ ھٰذَا اِنْکِحْھَا فَمَا کَانَ ھنا فی ھنا مِنْ اِثْمٍ فَعَلَیَّ)) (تفسیر ابنِ کثیر عربی، ج ۳، ص ۲۶۴)

"ابن عباس سے کسی نے پوچھا میں ایک عورت سے حرام کا ارتکاب کرتا رہا ہوں مجھے اللہ نے اس فعل سے توبہ کی توفیق دی۔ میں نے توبہ کر لی میں نے اس عورت سے شادی کا ارادہ کر لیا تو لوگوں نے کہا زانی مرد صرف زانیہ عورت اور مشرکہ عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ ابنِ عباس نے کہا یہ اس بارے میں نہیں ہے تو اس سے نکاح کر لے اگر اس کا گناہ ہوا تو وہ مجھ پر ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد اور عورت جنہوں نے بدکاری کا فعل کیا ہے اگر توبہ کر لیتے ہیں تو بغیر شرعی حد کے ان کا نکاح ہو سکتا ہے کیونکہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے نہیں کہا کہ پہلے حد لگواؤ پھر نکاح کرو۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ حمل کے وقت جو ان دونوں کا نکاح ہوا تو وہ نکاح صحیح نہیں ہو گا کیونکہ اُس نے عدت میں نکاح کیا اور عدت میں نکاح صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُھُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَھُنَّ ﴾ (الطلاق)

"حمل والیوں کی عدت وضع حمل ہے"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتَابُ اَجَلَہٗ ﴾

(بقرہ : ۲۳۵)

"اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک عدت ختم نہیں ہو جاتی۔"

حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ

"قَدْ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلٰی اَنَّهٗ لَا یَصِحُّ الْعَقْدُ فِی مُدَّةِ الْعِدَّةِ۔"

"کہ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ عدت کے اندر نکاح صحیح نہیں ہے۔"

اس لیے سائل نکاح جدید کروائے۔ کوئی حرج نہیں یہ نکاح ہو جائے گا۔ جیسا کہ دلائل سے واضح ہو چکا ہے۔ از : (ع - ع)

نکاح میں ذات پات کی کوئی قید نہیں

س کیا کوئی سید اپنی بیٹی کی شادی غیر سید سے کر سکتا ہے؟ نبی کریم ﷺ کے دور میں ایسا کوئی واقعہ ہے؟ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر جس طرح ہندوؤں میں ذات پات کا تصور ہے تو ہم میں اور ان میں کیا فرق رہ جاتا ہے"۔

(محمد شفیق سلفی، زرعی یونیورسٹی فیصل آباد)

ج سیدہ ہاشمیہ لڑکی کا نکاح کسی بھی مسلمان سے بلاشک و شبہ درست ہے کیونکہ ترجیح اور برتری کی بنیاد نسلی امتیازات اور خاندانی حسب و نسب، جاہ و جلال، مال و زر، ذات و برادری وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ یہ تقویٰ، پرہیزگاری، خوف خدا وغیرہ جیسی صفات عالیہ پر موقوف ہے، جیسا کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اس بات کی وضاحت اچھی طرح فرما دی تھی۔ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر، سفید کو سیاہ پر کوئی برتری نہیں۔ ہر مسلمان کی حرمت برابر و مقدس ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

(۱) ﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴾

(الحجرات : ۱۳)

"اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تم سب کو مختلف قومیں اور قبیلے اس لیے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان لیا کرو' اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے' بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا خبردار ہے"

یعنی ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی بنا پر تم سب برابر ہو لہٰذا کسی بھی فرد کا اپنے حسب و نسب پر فخر کرنا اور دوسرے کو حقیر و ذلیل سمجھنا جہالت و بے وقوفی اور نادانی ہے۔ اگرچہ باعتبار اصل تم سب ایک اور یکساں ہو لیکن تمہارا مختلف خاندانوں' قبیلوں اور قوموں میں منقسم ہونا ایک فطری امر تھا۔ اس لیے ہم نے تمہاری تقسیم کر دی مگر اس تقسیم کا مقصد برتری اور کمتری نہیں۔ عزت اور ذلت کا معیار قائم کرنا نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی پہچان اور معرفت ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی ایک کو دوسرے پر خاندانی حسب و نسب اور نسلی امتیازات کی وجہ سے کوئی ترجیح نہیں بلکہ یہ ترجیح' تقویٰ' پرہیزگاری پر موقوف ہے لہٰذا سیّد اور غیر سیّد یکساں اور اولاد آدم سے ہی ہیں۔

(۲) ایک اور مقام پر فرمایا کہ :

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ ﴾ (حجرات : ۱۰)

"مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں"

(۳) سورۂ نساء میں فرمایا :

﴿ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ ﴾ (الآیہ)

"پس جو عورتیں تم کو اچھی لگیں ان سے نکاح کر لو"

(۴) اللہ تعالیٰ نے حرام عورتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا :

﴿ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ ﴾ (الآیہ)

"ان مذکورہ حرام رشتوں کے علاوہ اور عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں"

یہ چاروں آیات مقدسہ اس بات کی دلیل ہیں کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی

ہیں اور مسلم معاشرے کے یکساں فرد اور معزز ارکان ہیں۔ یعنی سید اور غیر سید سب برابر ہیں اور ایک دوسرے کا کفو ہیں پس ایک سیدہ لڑکی کا نکاح غیر سید مسلم شخص کے ساتھ جائز ہے اس کی متعدد مثالیں تاریخِ اسلام میں موجود ہیں :

۱) رسول اللہ ﷺ نے اپنی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی زینب بنت جحش کا نکاح حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیا تھا جس کا ذکر سورۂ احزاب میں موجود ہے حالانکہ زید غلام تھے اور بی بی زینب قریشی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

۲) اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا نکاح فاطمہ بنت قیس القرشیہ سے ہوا۔

۳) سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی بہن سے ہوا۔ سیدنا بلال حبشی غلام تھے جن کو سیدنا ابوبکر صدیق نے آزاد کیا تھا اور عبدالرحمٰن بن عوف قبیلہ قریش کے سربرآوردہ اور مشہور و معروف تاجر اور رئیس اور عشرہ مبشرہ کے رکن رکین تھے۔

۴) نبی کریم ﷺ نے قبیلہ بنو بیاضہ کو ابوہند کے ساتھ مناکحت (رشتہ لینا دینا) کا حکم دیا تھا اور ابوہند حجام تھا۔

۵) ابوحذیفہ بن عتبہ ربیعہ بدری نے اپنی بھتیجی ہند بنت ولید بن عتبہ بن ربیعہ کا نکاح، سیدنا سالم رضی اللہ عنہ جو ایک انصاری عورت کے آزاد کردہ غلام تھے، کے ساتھ کر دیا۔ (الروضہ الندیہ ۷/۲)

۶) سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی اُمِ کلثوم بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا تھا۔ اس نکاح کا ذکر شیعہ سنی ہر دو کی معتبر کتب میں موجود ہے۔

۷) نبی کریم ﷺ نے اپنی دونوں بیٹیوں سیدہ رقیہ، سیدہ اُم کلثوم کا نکاح یکے بعد دیگرے سیدنا عثمان سے کیا تھا جبکہ آپ ہاشمی اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اموی تھے۔

۸) سیدنا علی بن حسین جو زین العابدین کے نام سے معروف ہیں کا نکاح شہربانو بنت یزدجرد بن شہریار سے ہوا۔ (الروضہ الندیہ ۹/۲)

اس کے علاوہ بے شمار عملی ثبوت موجود ہیں کہ امویوں کے رشتے ہاشمیوں سے ہاشمیوں کے اُمویوں سے ہوئے۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ:

" قَدْ جَزَمَ بِاَنَّ اِعْتِبَارَ الْكَفَاءَةِ مُخْتَصٌّ بِالدِّيْنِ مَالِكٌ وَنُقِلَ عَنْ عُمَرَ وَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَّمِنَ التَّابِعِيْنَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ وَعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ وَيَدُلُّ عَلَيْهِ قَوْلُهُ تَعَالٰى ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ﴾

(نیل الاوطار ۱۴۶/۶)

"امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک کفو کا اعتبار دین کے ساتھ خاص ہے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے اور تابعین میں سے محمد بن سیرین اور عمر بن عبدالعزیز رحمہما اللہ کا بھی یہی مسلک ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ﴾ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی ترجیح دی ہے" (فقہ السنہ ۱۲۸/۲)

لہٰذا کتاب و سنت کی رو سے نکاح میں کفو کے لیے صرف دین کی شرط ہے اور دین کے علاوہ باقی چیزوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ ہمارے ملک میں جو یہ بات رائج اور معروف ہے کہ اپنی برادری کے علاوہ کسی دوسری برادری میں رشتہ نہیں کرنا چاہیے سراسر غلط اور جہالت پر مبنی ہے اور ذات پات کی یہ قیود اور حد بندیاں ہندوؤں سے اخذ کی ہوئی ہیں جس کی کوئی حیثیت نہیں یہ ساری باتیں قرآن و سنت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ (مجلۃ الدعوۃ' جنوری / ۱۹۹۳ء)

بے نماز کا رشتہ

س کیا کوئی آدمی بے نماز کو اپنی لڑکی کا رشتہ دے سکتا ہے؟

ج نہیں دے سکتا بشرطیکہ لڑکی صوم و صلوۃ کی پابند ہو۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوٗنَ ﴾ (السجدة : ۸)

"کیا ایک مؤمن کسی فاسق کی طرح (برابر) ہو سکتا ہے؟ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔"

چونکہ بے نماز فاسق ہے اور فاسق مرد صوم و صلوۃ کی پابند عورت کا کفو نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر لڑکی بھی بے نماز ہے تو دوسری بات ہے۔

استاذی المکرم مفتی عبیداللہ عفیف حفظہ اللہ (مجلۃ الدعوۃ' مارچ / ۱۹۹۲ء)

جہیز کا شرعی حکم

س جہیز کا اسلامی شریعت میں کیا تصور ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ (زاہد وزیر آباد)

ج شادی سے قبل رشتہ کی بات چیت کے وقت لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کے سرپرستوں سے کسی بھی چیز کا مطالبہ کرنا خواہ وہ جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ کی صورت میں ہو یا نقدی اور مختلف سامان کی صورت میں ہو اور رشتہ کی منظوری کو اس پر معلق و موقوف کرنا شرعاً ناجائز ہے اسی طرح لڑکی والوں کی طرف سے پیش قدمی کرتے ہوئے لڑکے والوں سے یہ کہنا کہ اگر آپ یہ رشتہ منظور کرلیں تو ہم جہیز میں نقد اور فلاں فلاں اشیاء دیں گے سراسر غلط اور شریعت کے خلاف ہے۔ اس لین دین کی رسم کا نام چاہے جو بھی رکھا جائے یہ شرعاً ناجائز اور واجب الترک ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں :

۱) ہر مسلمان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ پر عمل کرنا اور زندگی کے تمام معاملات کو آپ کے اسوۂ حسنہ پر پرکھنا ضروری ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴾ (الاحزاب : ۲۱)

”تم میں سے جو کوئی اللہ اور اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کی یاد کرتا ہے اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے“۔

پھر آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسوۂ حسنہ عملی نمونہ ہے جس کی پیروی اور اتباع و اقتداء سب کے لیے ضروری ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک زندگی کے تمام افعال' ختنہ' عقیقہ' منگنی اور شادی وغیرہ کی تقریبات کو رسول اللہ ﷺ اور

آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے انجام دیا ہے لیکن ان کے ایام ہائے زندگی میں یہ رسومات اور مطالبات ہمیں نہیں ملتے۔ غرضیکہ شرع میں اس کا وجود تک نہیں ہے۔

۲) ہر مسلمان کے لیے شریعت مطہرہ میں شادی کے موقعہ پر یا رشتہ طے کرتے وقت یا شادی کے بعد لڑکی والوں پر کسی قسم کا خرچ اور بوجھ نہیں رکھا گیا۔ بلکہ یہ سارا بوجھ لڑکی کا لڑکے پر رکھا گیا ہے کہ یہ اس کو ضروریات زندگی کے اسباب مہیا کرے اس لیے شوہر کو قرآن میں قوام کہا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ (النساء : ۳۴)

"مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس واسطے اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس واسطے کہ خرچ کیے انہوں نے اپنے مال"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نان و نفقہ، مہر وغیرہ تمام اخراجات بذمہ مرد ہیں بس لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کے سرپرستوں سے کسی مال و متاع کا مطالبہ شریعت کی منشاء کے خلاف ہے۔

۳) ہندو مذہب میں لڑکی کو والدین سے وراثت نہیں ملتی اس لیے لڑکے والے چاہتے ہیں کہ جیسے بھی ہو اور جس شکل میں بھی ہو لڑکی والوں سے زیادہ سے زیادہ مال و متاع حاصل کر لیا جائے اس لیے وہ شادی کے موقعہ پر مذکورہ مطالبہ کرتے ہیں اور لڑکی والے ان کے مطالبہ کو پورا کرتے ہیں ان ہی کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی اپنی بیٹیوں کو وراثت سے محروم کرتے ہیں حالانکہ وراثت کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور قرآن نے انہیں حدود اللہ کہا ہے اور اس کے ادا کرنے پر فوز عظیم کی خوشخبری سنائی ہے اور وراثت سے محروم کرنے پہ ہمیشہ جہنم میں رہنے کی وعید فرمائی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ

﴿وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾

(نساء : ۱۳، ۱۴)

"یہ اللہ کی حدیں ہیں جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا اس کو وہ جنت میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیاب ہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ اس کو جہنم میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہو گا"۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ وراثت کو ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ہے اور جو لوگ اس کی ادائیگی نہیں کرتے وہ اللہ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے ابدی جہنم کی وعید ہے اور جہیز درحقیقت وراثت کی نفی ہے۔

۴) ان وجوہات کے علاوہ جہیز کے نقصانات اس قدر ہیں کہ عام طور پر غریب لوگوں کی بیٹیوں کا نکاح جہیز کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے منعقد ہی نہیں ہوتا اور نوجوان لڑکیاں اسی طرح گھر میں بیٹھ کر اپنی عمر برباد کر دیتی ہیں اور کئی لڑکیاں نکاح نہ ہونے کے باعث مختلف جرائم کا شکار ہو جاتی ہیں جس کے معاشرے پر بہت بڑے اثرات مرتب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں خلاف شرع کاموں سے محفوظ فرمائے اور جہیز جیسی لعنت سے بچنے کی توفیق بخشے۔ (مجلۃ الدعوۃ' اکتوبر/ ۱۹۹۲ء)

غیر شعوری عمر کا نکاح

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس فیصلہ کے بارے میں کہ میرے والد نے میری بہن کا نکاح اپنے کسی عزیز سے کر دیا تھا جبکہ میری بہن اتنی کمسن تھی کہ اس کو اپنے نکاح کا ہونا بالکل یاد نہیں۔ تقریباً دو ماہ کی عمر تھی۔ بالغ ہونے کے بعد میری بہن کو جب معلوم ہوا کہ اس کا نکاح اس کے والد نے فلاں آدمی سے کیا ہوا ہے تو اس نے نکاح کو قائم رکھنے سے انکار کر دیا اب وہ اس آدمی سے نکاح نہیں رکھنا

چاہتی لہٰذا کتاب و سنت کی رو سے وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔
(رب نواز ولد محمد عاشق' میلی ضلع وہاڑی)

ج نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں' رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((لَا تُنْكَحُ الْاَيِّمُ حَتّٰى تُسْتَاْمَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَاْذَنَ قِيْلَ وَمَا اِذْنُهَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ' قَالَ اَنْ تَسْكُتَ.))

''بیوہ کا نکاح اس کا امر حاصل کئے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح اس کا اذن (اجازت) حاصل کئے بغیر نہ کیا جائے۔ کہا گیا اس کا اِذن کیا ہے اے اللہ کے رسول ﷺ ' آپ نے فرمایا چپ رہنا اس کا اذن ہے (کیونکہ وہ شرم کے مارے بول بولتی نہیں)''۔ (المنتقیٰ لابن جارود ۷۰۷' واللفظ لہ بخاری مع فتح ۱۹۱/۹' ۳۳۹/۱۲' ۳۴۰' مسلم مع نووی ۲۰۲/۹' ابوداؤد ۱۰۹۲' نسائی ۸۵/۲' ترمذی مع تحفہ ۲۴۰/۴' ابنِ ماجہ (۱۸۷۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بالغہ لڑکی سے اس کے نکاح کی اجازت لی جاتی ہے اور جب وہ نابالغہ ہوتی ہے تو بچپن میں اس سے اجازت نہیں لی جاتی۔ اس کا ولی نکاح کر سکتا ہے بعد از بلوغت اس لڑکی کو اختیار ہوتا ہے کیونکہ اس کا حق ہے وہ اپنا نکاح اگر منسوخ کرانا چاہے تو کرا سکتی ہے :

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ جَارِيَةً بِكْرًا اَتَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَتْ اَنَّ اَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ فَخَيَّرَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.))

'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک کنواری لڑکی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور بیان کیا کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح کیا ہے اور وہ ناپسند کرتی ہے تو نبی اکرم ﷺ نے اسے اختیار دے دیا۔''

(ابوداؤد (۲۰۹۶) احمد ۲۷۳/۱۔۲۳۶۵۔' ابنِ ماجہ ۱۸۷۵۔۲۰۳/۲)

علامہ احمد حسن دہلوی راقم ہیں :

" اَلْحَدِيْثُ يَدُلُّ عَلٰى تَحْرِيْمِ اِجْبَارِ الْأَبِ لابْنَتِهِ الْبِكْرِ عَلَى النِّكَاحِ وَغَيْرِهِ مِنَ الْأَوْلِيَاءِ بِالْأَوْلٰى۔"

"یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ باپ کے لیے حرام ہے کہ وہ اپنی کنواری بیٹی کو نکاح پر مجبور کرے تو باپ کے علاوہ لڑکی کے اولیاء (دیگر رشتہ داروں) کے بالاولی جبر کی ممانعت ہے" (تنقیح الرواۃ ۳/۱۰)

مذکورہ بالا حدیث صحیح سے معلوم ہوا کہ لڑکی کو بالغ ہو جانے کے بعد اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنا بچپن کا کیا ہوا نکاح فسخ کرا سکتی ہے۔ فسخ کے لیے چاہیں تو ثالثی شرعی عدالت کی طرف رجوع کرلیں تاکہ مزاحمت وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو۔

(مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۶ء)

شادی میں گانا بجانا

س: جس شادی میں ڈھولک گانا بجانا اور بدعات وغیرہ ہوں اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

ج: جس شادی میں ڈھولک' رسومات و بدعات' خرافات گانا بجانا وغیرہ ہو۔ اس میں شرکت ناجائز ہے کیونکہ یہ گناہ ہیں اور ان میں شرکت گناہ پر تعاون ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾

(المائدہ : ۲)

"نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو۔ زیادتی اور گناہ کے کاموں میں تعاون نہ کرو"

سورۂ بنی اسرائیل ۶۴ میں اللہ تعالیٰ نے شیطان سے کہا :

﴿ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ ﴾ ان میں سے جس کو تو اپنی آواز سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے۔ ﴿ بِصَوْتِكَ ﴾ کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مُراد گانا بجانا' مزامیر اور ہر وہ پکار ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو۔

چونکہ گانا بجانا ڈھولک وغیرہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اس لئے یہ دعوت قبول کرنا درست نہیں۔ (قرطبی' جلالین)

اگر دعوت قبول کرنا مستحب ہے تو دوسری طرف حصولِ منکر اس سے مانع ہے۔ مانع اور مقتضی میں جب تعارض ہو تو حکم مانع کا ہو گا۔ للذا ایسی شادی جس میں مندرجہ بالا خرافات ہوں شرکت ناجائز و ممنوع ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص تبلیغ کی نیت سے وہاں جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر تبلیغ نہیں کر سکتا تو بالکل نہ جائے۔ (مجلہ الدعوۃ' مارچ / ۱۹۹۲ء)

متعہ کیا چیز ہے؟

س متعہ کیا چیز ہے؟ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ کیا کوئی صحابی اس کا قائل تھا۔ شیعہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں اس کی کیا حقیقت ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں متعہ کا حکم واضح فرمائیں۔

ج متعہ کا لغوی معنی فائدہ حاصل کرنا ہے جیسا کہ امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن ۱۴۶/۲ میں لکھا ہے "اَلْاِسْتِمْتَاعُ هُوَ الْاِنْتِفَاعُ" اور اصطلاح میں متعہ کا معنی یہ ہے کہ خاص مدت کے لیے کسی قدر معاوضہ پر نکاح کیا جائے۔ لیکن فقہ جعفریہ کی اصطلاح میں جب کوئی مرد کسی عورت کو وقت مقررہ اور اجرت مقررہ کے عوض مجامعت کی خاطر ٹھیکہ پر حاصل کرے تو اس فعل کو متعہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ شیعہ کی کتاب فروع کافی ۱۹۱/۲ پر لکھا ہے کہ :

"اِنَّمَا هِیَ مُسْتَاجَرَةٌ"

"ممنوعہ عورت ٹھیکہ کی چیز ہوتی ہے"

ابتدائے اسلام میں متعہ حلال تھا جسے بعد میں قطعی طور پر حرام قرار دے دیا گیا شروع اسلام میں جتنی مرتبہ بھی متعہ حلال ہوا وہ صرف ضرورت شدیدہ اور غزوات وغیرہ میں حالتِ سفر میں ہوا ہے کسی موقعہ پر بھی اس کی حلت حضر میں نہیں ہوئی۔ چنانچہ امام ابوبکر محمد بن موسیٰ حازمی رحمہ اللہ کتاب الاعتبار ۳۳۱ پر رقم طراز ہیں :

" إِنَّمَا كَانَ ذٰلِكَ يَكُونُ فِي أَسْفَارِهِمْ وَلَمْ يَبْلُغْنَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبَاحَهُ لَهُمْ وَهُمْ فِي بُيُوتِهِمْ۔"

"متعہ کی حلت سفروں میں ہوئی اور ہمیں کوئی ایسی حدیث نہیں ملی جس میں یہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے حالتِ حضر میں متعہ کی اجازت دی ہو"

سیدنا ابوذر فرماتے ہیں جیسا کہ السنن الکبریٰ ۷/۲۰۷ میں ہے کہ :

" إِنَّمَا كَانَتِ الْمُتْعَةُ لِخَوْفِنَا وَلِحَرْبِنَا۔"

"حالتِ خوف اور غزوات کی وجہ سے متعہ حلال ہوا تھا"

ان حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ متعہ صرف اضطرار اور ضرورت شدیدہ کے وقت مباح تھا عام حالات میں نہیں جیسا کہ شیعہ حضرات سمجھتے ہیں۔ قرآنی نصوص اور احادیث صحیحہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ متعہ قطعی طور پر حرام ہو چکا ہے اور اسلام نے نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے دو ہی طریقے روا رکھے ہیں چنانچہ ارشاد خداوندی ہے :

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ ﴾ (المومنون : ۵-۷، ۲۳ المعارج : ۲۹-۳۱، ۷۰)

"وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین (لونڈیاں) ہوں وہ قابل ملامت نہیں البتہ جو ان کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن نے حلت جماع کو دو چیزوں (زوجیت و ملک یمین) میں منحصر کر دیا ہے زن متعہ ان دو صورتوں میں سے کسی بھی میں بھی داخل نہیں۔ زوجہ اس لیے نہیں کہ لوازم زوجیت، میراث، طلاق، عدت، نفقہ، ایلاء و ظہار، لعان وغیرہ کی یہاں مستحق نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مملوکہ بھی نہیں کیونکہ اس

کی بیع، ہبہ اور اعتاق وغیرہ بھی جائز نہیں۔

علماء شیعہ بھی اس بات کے معترف ہیں کہ زن متعہ زوجیت میں داخل نہیں چنانچہ کتاب اعتقادات ابنِ بابویہ میں تصریح ہے کہ :

" اَسْبَابُ حِلِّ الْمَرْاَةِ عِنْدَنَا اَرْبَعَةٌ اَلنِّكَاحُ وَمِلْكُ الْيَمِيْنِ وَالْمُتْعَةُ وَالتَّحْلِيْلُ، وَقَدْ رَوٰى اَبُوْبَصِيْرٍ فِى الصَّحِيْحِ عَنْ اَبِىْ عَبْدِ اللّٰهِ الصَّادِقِ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنِ الْمُتْعَةِ اَهِىَ مِنَ الْاَرْبَعَةِ قَالَ لَا۔"

"ہمارے ہاں عورت کی حلت کے چار اسباب ہیں (۱) نکاح (۲) ملک یمین (۳) متعہ (۴) حلالہ اور ابوبصیر نے صحیح میں امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ کیا متعہ چار سے ہے تو فرمایا نہیں"۔

امام قرطبی اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن ۱۲/۷۲ پر رقمطراز ہیں :

" هٰذَا يَقْتَضِىْ تَحْرِيْمَ ـــــ نِكَاحِ الْمُتْعَةِ لِاَنَّ الْمُتَمَتَّعَ بِهَا لَا تَجْرِىْ مَجْرَى الزَّوْجَاتِ لَا تَرِثُ وَلَا تُوْرَثُ وَلَا يَلْحَقُ بِهٖ وَلَدُهَا وَلَا يَخْرُجُ مِنْ نِكَاحِهَا بِطَلَاقٍ يُسْتَاْنَفُ لَهَا وَاِنَّمَا يَخْرُجُ بِانْقِضَاءِ الَّتِىْ عُقِدَتْ عَلَيْهَا وَصَارَتْ كَالْمُسْتَاجَرَةِ۔"

"یہ آیت حرمت متعہ پر دلالت کرتی ہے کیونکہ متوعہ عورت زوجات کے حکم میں نہیں ہے۔ متوعہ عورت نہ خود کسی کی وارث ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی وارث ہوتا ہے اور نہ بچے کا الحاق متعہ کرنے والے کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ ہی طلاق کے ساتھ اس سے جدا ہوتی ہے بلکہ طے شدہ مدت کے ختم ہوتے ہی خود بخود اس سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ بیوی کے حکم میں نہیں بلکہ یہ اجرت پر حاصل شدہ چیز ہے"

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ (النساء : ۳)

"جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین اور چار چار سے نکاح کرو
لیکن اگر تمہیں ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو پھر ایک ہی بیوی کرو
یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں ہیں"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نکاح چار تک محدود ہے اور متعہ میں کوئی عدد مقرر نہیں ہوتا جیسا کہ شیعہ کی معتبر کتاب تہذیب الاحکام کتاب النکاح میں ہے :

تَزَوَّجْ مِنْهُنَّ اَلْفًا فَاِنَّهُنَّ مُسْتَاْجَرَاتٌ

"چاہے ہزار سے متعہ کرے کیونکہ وہ تو ٹھیکہ کی چیز ہے"

اس آیت سے دوسرا مقصود ایسی صورتوں کا بیان کرنا ہے جس میں حق تلفی کا خوف نہ ہو اور یہ معنی متعہ و حلالہ میں بہ نسبت منکوحہ و مملوکہ کے زیادہ ہے کیونکہ مملوکہ کے کچھ ایسے حقوق ہیں جن کو ادا نہ کرنا ظلم ہے بخلاف زن متعہ کے کہ اس کا سوائے اُجرت مقررہ کے اور کوئی حق نہیں اور حلالہ میں تو یہ بھی نہیں ہے مفت کا سودا ہے پس اگر متعہ و حلالہ مباح ہوتے تو اس موقعہ پر ان کا ذکر ضرور ہوتا کیونکہ ان میں حق تلفی کا کوئی خوف نہیں۔ حرمت متعہ کے متعلق قرآنی دو آیات کے بعد اب چند ایک صحیح احادیث ملاحظہ فرمائیں :

((عَنْ سَبْرَةَ الْجُهَنِيِّ اَنَّهُ كَانَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّي قَدْ كُنْتُ اَذِنْتُ لَكُمْ فِي الْاِسْتِمْتَاعِ مِنَ النِّسَاءِ وَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ ذٰلِكَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَمَنْ كَانَ عِنْدَهٗ مِنْهُنَّ شَيْئٌ فَلْيُخَلِّ سَبِيْلَهَا وَلَا تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا))

"سبرۃ جہنی سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے سو آپ نے فرمایا اے لوگو میں نے تم کو عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور اب اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت کے دن تک کے لیے حرام کر دیا ہے سو جن کے پاس ان میں کوئی ہو تو چاہئے کہ اس کو چھوڑ دے اور جو چیز تم ان کو دے چکے ہو وہ واپس نہ لو" (ابوداؤد ۲۹۰، مسلم ۴۵۱/۱، نیل الاوطار ۱۳۴/۴)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

((اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ نِكَاحِ الْمُتْعَةِ يَوْمَ خَيْبَرَ وَعَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ.))

"رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن متعہ سے منع فرما دیا اور گھریلو گدھوں کے گوشت سے" (مسلم ۱۴۰۷/۲، ۱۰۲۷)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((حَرَّمَ الْمُتْعَةَ الطَّلَاقُ وَالْعِدَّةُ وَالْمِيْرَاثُ.)) (سنن دارقطنی ۲۵۸/۳)

"طلاق، عدت اور میراث نے متعہ کو حرام کر دیا ہے"

امامیہ شیعہ کی معتبر کتاب فروع کافی اور تہذیب الاحکام میں بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

((عَنْ عَلِيٍّ قَالَ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ خَيْبَرَ لُحُوْمَ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ وَنِكَاحَ الْمُتْعَةِ.))

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن گھریلو گدھوں کا گوشت اور متعہ حرام کر دیا"۔

(تہذیب الاحکام ۲/ ۱۸۶، استبصار ۳/ ۱۴۲، فروع کافی ۲/ ۱۹۲)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق جو کہا جاتا ہے کہ وہ متعہ کو حلال سمجھتے تھے اس کی حقیقت یہ ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ تک متعہ کو اضطرار اور شدید ضرورت میں جائز سمجھتے رہے پھر بعد میں انہیں اس کے نسخ و حرمت کے بارے میں پتہ چلا تو انہوں نے اس سے بھی رجوع کر لیا تھا اور اس کے بعد ہمیشہ متعہ کو حرام ہی سمجھتے رہے۔ امام ترمذی نے ترمذی شریف میں باب ما جاء في نكاح المتعة کا باب قائم کر کے دو حدیثیں نقل کی ہیں پہلی حدیث سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جو اوپر ذکر کر دی گئی ہے اور دوسری حدیث یہ ہے:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّمَا كَانَتِ الْمُتْعَةُ فِي اَوَّلِ الْاِسْلَامِ حَتّٰى اِذَا نَزَلَتِ الْاٰيَةُ ﴿ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ﴾ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَكُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا فَهُوَ حَرَامٌ.))

"سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ متعہ اول اسلام میں جائز تھا یہاں تک کہ آیت ﴿ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ﴾ نازل ہوئی تو وہ منسوخ ہو گیا اس کے بعد ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ زوجہ اور مملوکہ کے علاوہ ہر طرح کی شرمگاہ سے اِسْتِمْتَاع حرام ہے" (ترمذی ۱/۱۳۳)

امام ابوبکر جصاص ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے رجوع کے متعلق فرماتے ہیں :

" وَلَا نَعْلَمُ اَحَدًا مِنَ الصَّحَابَةِ رُوِيَ عَنْهُ تَجْرِيْدُ الْقَوْلِ فِي اِبَاحَةِ الْمُتْعَةِ غَيْرَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَقَدْ رَجَعَ عَنْهُ حِيْنَ اسْتَقَرَّ عِنْدَهُ تَحْرِيْمُهَا بِتَوَاتُرِ الْاَخْبَارِ مِنْ جِهَةِ الصَّحَابَةِ۔"

"تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں سوائے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے کوئی بھی حلت متعہ کا قائل نہیں اور انہوں نے بھی متعہ کے جواز سے اس وقت رجوع کر لیا تھا جب تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعہ کی حرمت ان کے ہاں تواتر کے ساتھ ثابت ہو گئی۔"

(احکام القرآن ۲/۱۵۲)

مندرجہ بالا دلائل سے ثابت ہوا کہ متعہ النساء قیامت تک حرام ہے۔

حلالہ کی شرعی حیثیت

جب سے جسٹس شفیع محمدی کا روزنامہ جنگ ۴/ جنوری ۱۹۹۶ء و دیگر اخبارات میں حلالہ شکن فیصلہ شائع ہوا ہے' ملک کے طول و عرض میں حلالہ موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ ہر خاص و عام حلالہ کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لئے محو جستجو ہے۔ کئی ایک جرائد و رسائل نے اس کی موافقت و مخالفت میں قلم اٹھایا ہے۔ مدیر مجلّہ الدعوۃ نے بڑے ہی بہترین پیرایہ میں حلالہ کی تباہ کاریوں سے پردہ اٹھایا۔ اس مضمون کے بعد ہمارے چند قارئین نے کچھ سوالات بھیجے جن کا جواب زیر نظر

مضمون میں تحریر کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ جنگ اخبار میں حنفی مولوی محمد صدیق ہزاروی نے اپنے مضمون میں حلالہ کے حق میں قرآن و سنت سے ہٹ کر جو عجیب و غریب ولائل اختیار کیے' ان کا تفصیلی جواب بھی اس میں شامل ہے۔

مسنون طریقہ طلاق

اس سے قبل کہ سائل کے سوالات کا مفصل جواب تحریر کیا جائے ہم دوبارہ طلاق کا صحیح طریقہ ایک بار پھر بیان کرتے ہیں :

اسلام کے طریقہ طلاق میں مسلم مرد کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ تین طلاقیں تین مرتبہ اس طریقے سے دے کہ حالتِ طہر جس میں اس نے مجامعت نہیں کی' میں ایک طلاق دے اور بیوی کو اسی حالت میں چھوڑ دے اور یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے۔ اگر خاوند دورانِ عدت اسے رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے لیکن اگر وہ رجوع نہ کرے اور عدت ختم ہو جائے تو پھر وہ نئے نکاح کے ساتھ اس کو واپس لا سکتا ہے اور اگر شوہر ضرورت نہ سمجھے تو عورت کسی اور مرد کے ساتھ نکاح کرنے کی مجاز ہے اور اگر پہلی طلاق کے بعد شوہر نے اسے دوبارہ اپنی زوجیت میں لے لیا اور پھر دونوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے اور صلح صفائی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو وہ دوسری مرتبہ طلاق دے سکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہے اور اس دوسری طلاق کے بعد عدت کے اندر شوہر کو رجوع کا حق ہے اور عدت گزر جانے کے بعد اگر رکھنا چاہے تو تجدید نکاح ہو گا۔ لیکن اگر تیسری طلاق بھی دے دی تو پھر یہ عورت قطعی طور پر اس خاوند کے لیے حرام ہو جائے گی۔ اب رجوع کا حق ختم ہے۔ عورت عدت گزار کر کسی اور مرد سے نکاح کر سکتی ہے اور یہ نکاح صحیح شرعی طریقے کے مطابق مستقل بسنے کی نیت سے ہو گا نہ کہ شوہر اوّل کے لیے حلال ہونے کی غرض سے... اب اگر اس کا یہ خاوند بھی فوت ہو گیا یا اس نے گھریلو ناچاقی کی بنا پر اسے طلاق دے دی تو یہ عورت اگر دوبارہ شوہر اوّل کی طرف لوٹنا چاہے تو عدت کے بعد اس کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے اور ایسا واقعہ ہزاروں میں سے شاید کوئی ایک آدھ

ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ کا ذکر سورۃ البقرۃ میں فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾

(البقرۃ : ۲۲۹)

"طلاق (جس کے بعد خاوند رجوع کر سکتا ہے) دوبار ہے۔ پھر دو طلاقوں کے بعد یا تو دستور کے موافق اپنی بیوی کو رہنے دی یا اچھی طرح سے رخصت کر دے"۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایات کے بموجب ابتداء ہجرت میں جاہلی دستور کے مطابق مرد عورتوں کو کئی کئی بار طلاق دیتے اور عدت کے اندر رجوع کرتے رہتے تھے۔ مقصد بیوی کو تنگ کرنا ہوتا تھا اس صورتحال کو روکنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ رجعی طلاق (جس میں رجوع کی گنجائش ہو) زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ ہے۔ اس کے بعد ﴿ اِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ یعنی یا تو عدت کے اندر رجوع کرنا ہے اوریا ﴿ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ یعنی حسن سلوک کے ساتھ تیسری طلاق دینا ہے۔ یہ تفسیر مرفوعاً مروی ہے اور ابنِ جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے اور بعض نے تو ﴿ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ سے یہ مُراد لی ہے کہ دو طلاق کے بعد رجوع نہ کرے حتیٰ کہ عدت گزارنے کے بعد وہ عورت خود بخود اس سے الگ ہو جائے۔ (ابنِ جریر' ابنِ کثیر)

سائل مذکور لکھتا ہے کہ آپ نے مجلہ الدعوۃ کے ص ۳۹ پر لکھا ہے کہ:

"یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب پہلی طلاق کے بعد تین حیض کی مدت ختم ہو جائے گی تو اب عورت آزاد ہو گی۔ وہ جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ مرد کو رجوع کا حق اب ختم ہو گیا۔ ہاں البتہ دونوں عدت کے ختم ہونے کے بعد نئے سرے سے پھر ملنا چاہیں تو نیا نکاح کر کے مل سکتے ہیں لیکن اب دونوں فریقوں کی رضامندی ضروری ہے۔ صرف خاوند کی رضامندی سے نیا نکاح نہ ہو سکے گا"۔

اوپر والے پیراگراف کے حق میں آپ نے دلیل کے طور پر نہ کوئی قرآن کی آیت لکھی ہے اور نہ ہی کوئی حدیث مبارکہ اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کا کوئی واقعہ درج کیا ہے؟

ج اس سوال کا جواب قرآن مجید میں سورۃ بقرۃ کے اندر ہی موجود ہے۔ ملاحظہ کیجئے ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ (بقرہ : ۲۳۲)

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو' پھر ان کی عدت پوری ہو جائے تو ان کو (اگلے) خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو۔ اگر دستور کے موافق آپس میں رضامندی ہو جائے"۔

اس آیت کریمہ سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ طلاق رجعی جو دو مرتبہ ہے' اس پیریڈ میں اگر عورت کی عدت مکمل ہو چکی ہو اور وہ مرد و عورت دوبارہ آپس میں رضامندی کے ساتھ بسنا چاہیں تو انہیں نکاح کرنے سے منع نہیں کرنا چاہیے۔ اب اس آیت کریمہ کا شان نزول بھی ملاحظہ فرمالیں تاکہ آپ کی مزید تشفی ہو جائے :

((عَنِ الْحَسَنِ اَنَّ مَعْقِلَ بْنَ يَسَارٍ زَوَّجَ اُخْتَهُ رَجُلاً فَطَلَّقَهَا تَطْلِيْقَةً فَبَانَتْ مِنْهُ ثُمَّ جَاءَ يَخْطُبُهَا فَاَبٰى عَلَيْهِ وَقَالَ اَفْرَشْتُكَ كَرِيْمَتِيْ ثُمَّ طَلَّقْتَهَا ثُمَّ جِئْتَ تَخْطُبُهَا لاَ وَاللّٰهِ لاَ اُزَوِّجُكَهَا قَالَ وَكَانَتِ الْمَرْاَةُ قَدْ هَوِيَتْ اَنْ تُرَاجِعَهُ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ ﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ ﴾ اِلٰى آخِرِ الآيَةِ (البقرہ : ۲۳۲) فقال نَعَمْ اُزَوِّجُكَهَا))

"سیدنا حسن بصری سے مروی ہے کہ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کا نکاح ایک آدمی کے ساتھ کیا۔ اس نے اسے ایک طلاق دے دی (عدت گزر گئی) تو معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن اس سے علیحدہ ہو گئی۔ پھر وہ پیغام نکاح لے کر آیا تو معقل نے انکار کیا اور کہا میں نے اپنی معزز بہن کا نکاح تجھے دیا تھا۔ تو نے اسے طلاق دے دی اب تو پھر پیغام نکاح لے کر آگیا ہے۔ اللہ کی قسم اب میں تجھے نکاح کر کے نہیں دوں گا اور معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن لوٹنا چاہتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ

بقرہ کی یہ آیت اتار دی : "جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو ان کو اپنے (پہلے) خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو" اس کے بعد معقل رضی اللہ عنہ نے کہا' ہاں تجھے نکاح کر دیتا ہوں" (بخاری ۵۱۳۱' بیہقی ۱۳۸/۷' المعجم الکبیر للطبرانی ۴۶۷/۲۰' الجزء الثالث والعشرین من حدیث ابی الطاہر القاضی محمد بن احمد الزسلی ص ۲۹' رقم الحدیث ۶۵ واللفظ لہ)

مذکورہ بالا حدیث صحیح کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ جب عورت کو اس کا شوہر ایک طلاق دے دیتا ہے اور خاوند عدت کے اندر رجوع نہیں کرتا تو اختتام عدت کے بعد اگر وہ مرد اور عورت باہم رضامندی سے رہنا چاہتے ہوں تو تجدید نکاح سے دوبارہ اپنا گھر آباد کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری مرتبہ کبھی زندگی میں تعلقات کی کشیدگی ہو گئی اور مرد نے اپنی منکوحہ کو طلاق دے دی تو پھر اسی طرح عدت کے اندر رجوع کا حق ہے اور اختتام عدت کے بعد نئے نکاح سے جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ دو حق رجعی اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ میں ذکر کیے ہیں پھر ﴿ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ﴾ میں تیسری مرتبہ طلاق کے بعد یہ حق ختم کر دیا گیا ہے۔ مفسرین نے اس سے اس بات کی توضیح کی کہ اکٹھی تین طلاقیں دینے سے تینوں واقع نہیں ہوتیں بلکہ ایک ہی طلاق رجعی واقع ہوتی ہے۔ حنفی حضرات جو اکٹھی تین طلاقوں کو تین ہی نافذ کرتے ہیں اور پھر اگلی صورت جو حلالہ والی بتاتے ہیں' یہ قابل غور ہے اور مطلوب ہے۔

تین طلاقوں کے بعد....

قرآن مجید نے تین طلاقیں (وقفہ بعد وقفہ) واقع ہونے کے بعد جو بتایا ہے کہ اب وہ عورت کسی دوسرے مرد سے جب تک نکاح نہ کر لے' وہ پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہوتی۔ اس کی تفسیر تمام مفسرین نے یہی لکھی ہے کہ جس طرح پہلے خاوند کے ساتھ مقصد نکاح کو مدنظر رکھتے ہوئے مستقل بسنے اور گھر کی آبادی کی نیت

سے نکاح کیا تھا' اسی طرح دوسرے مرد سے بھی مستقل بسنے کی نیت سے نکاح ہو نہ کہ نکاح سے پہلے ہی یہ طے کر لیا جائے کہ ایک دو راتوں بعد اس خاوند نے مجھے طلاق دے دینی ہے۔

ہاں پھر وہ بھی اگر اپنی مرضی سے طلاق دے دے یا فوت ہو جائے تو وہ عورت اپنے پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہو تو کر سکتی ہے۔ اس صورت کو حلالہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اسی طرح نکاح صحیح کہلائے گا جس طرح پہلے خاوند کے ساتھ نکاح تھا۔ موجودہ حنفی حضرات آج کل اپنے دوسرے طریقے سے چشم پوشی کرتے ہوئے اسے حلالہ قرار دے رہے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ.))

"حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے' دونوں پر اللہ کی لعنت ہو"

(مسند احمد ۲/ ۳۲۳' بیہقی ۷/ ۲۰۸' نسائی ۶/ ۱۴۹' ترمذی ۱۱۲۰' دارمی ۲/ ۱۸' ابوداؤد ۲۰۷۶)

اسی طرح فرمایا حلالہ کرنے والا اُدھار مانگے ہوئے سانڈھ کی طرح ہے۔

(ابنِ ماجہ ۱۹۳۶' مستدرک حاکم ۲/ ۱۹۸' بیہقی ۷/ ۲۰۸)

اس مُحَلِّلْ (حلالہ کرنے والے) کی تشریح ائمہ لغت اور شارحین حدیث رحمہم اللہ کے حوالے سے ملاحظہ کیجئے اور اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ حلالہ کس آفت و مصیبت کا نام ہے۔ حدیث کی لغت کی معروف کتاب النهايه في غريب الحديث والاثر ۱/ ۴۳۱ پر مرقوم ہے:

((هُوَ اَنْ يُّطَلِّقَ الرَّجُلُ امْرَاَتَهُ ثَلَاثًا فَيَتَزَوَّجَهَا رَجُلٌ آخَرُ عَلٰى شَرِيْطَةِ اَنْ يُّطَلِّقَهَا بَعْدَ وَطْئِهَا لِتَحِلَّ لِزَوْجِهَا الْاَوَّلِ.))

"حلالہ یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دے۔ پھر دوسرا آدمی اس عورت کے ساتھ اس شرط پر نکاح کرے کہ وہ اس کے ساتھ وطی کرنے کے بعد اسے طلاق دے دے گا تاکہ پہلے کے لیے حلال ہو جائے"

احناف کی فقہی اصطلاحات پر شائع شدہ کتاب القاموس الفقهي ص ۱۰۰

مطبوعہ ادارہ القرآن کراچی میں مُحَلِّلْ کی تعریف یہ لکھی ہے کہ :

((المحلل: مُتَزَوِّجُ الْمُطَلَّقَةِ ثَلَاثًا لِتَحِلَّ لِلزَّوْجِ الْاَوَّلِ وَ فِی الْحَدِیْثِ الشَّرِیْفِ لَعَنَ اللّٰہُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَہٗ.))

"مُحَلِّلْ سے مُراد حلالہ کرنے والا وہ شخص ہے جو مطلقہ ثلاثہ کے ساتھ اس لیے نکاح کرے تاکہ وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے اور حدیث شریف میں وارد ہے حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے ان دونوں پر اللہ کی لعنت ہو"

یہی معنی لغت کی مشہور کتب القاموس المحیط ۱۷۱/۳ اور المعجم الوسیط ص ۱۹۴ پر بھی موجود ہے۔

حلالہ کی تشریح احناف کے مشہور امام اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن الشیبانی کی زبانی ملاحظہ کیجئے۔ محمد بن حسن شیبانی اپنی کتاب کتاب الاثار رقم ۸۷۸ پر مُحَلِّلْ اور مُحَلَّلْ لَہٗ کی توضیح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

فَالرَّجُلَ یُطَلِّقَ امْرَاَتَہٗ ثَلَاثًا فَیَسْئَالُ رَجُلًا اَنْ یَتَزَوَّجَھَا لِیُحَلِّلَھَا لَہٗ

"مُحَلِّلْ (حلالہ کرنے والا) اور مُحَلَّلْ لَہٗ (جس کے لیے حلالہ کیا جائے) کا بیان یہ ہے کہ ایک مرد اپنی عورت کو تین طلاقیں دے۔ پھر چاہے کہ اس کا کسی دوسرے مرد سے نکاح کردے تاکہ وہ اس کو اس کے لیے حلال کردے"۔

(ص ۳۷۹، مترجم ابوالفتح عزیزی، مطبوعہ سعید اینڈ کمپنی کراچی)

یہی معنی اور مفہوم شارح حدیث امام بغوی شرح السنہ ۱۰۱/۹، حافظ ابنِ حجر عسقلانی التلخیص الحبیر ۱۷۱/۳، امام ابنِ حزم المحلی، امام عبدالرحمٰن مبارکپوری تحفہ الاحوذی ۱۸۵/۲ اور علامہ معلمی یمانی سبل السلام میں تحریر فرماتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے عبارات درج نہیں کر رہے۔ یہ ہے وہ حلالہ جسے فقہ حنفی میں مختلف حیلوں اور بہانوں سے روا رکھا گیا۔

کیا پہلے سے طلاق لینے کی فاسد شرط کے ساتھ نکاح جائز ہو سکتا ہے؟

حلالہ کے متعلق ۱۴ جنوری ۱۹۹۶ء کے جنگ اخبار میں ایک حنفی مولوی محمد صدیق ہزاروی کا مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے امام ابو حنیفہ کا موقف یہ لکھا کہ:

"اختلاف کی صورت میں یہ ہے کہ اگر اس شرط پر نکاح کیا جائے کہ دوسرا خاوند اسے طلاق دے دے گا تو کیا یہ نکاح ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ شرط بے کار ہو گی یا نکاح ہی نہیں ہو گا۔ اب اگر یہ نکاح صحیح قرار پائے تو طلاق کے بعد عورت کا پہلے خاوند سے نکاح جائز ہو گا اور اگر یہ نکاح صحیح قرار نہیں پاتا تو عورت پہلے خاوند کے لیے بدستور حرام رہے گی۔ سیدنا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ نکاح صحیح ہو گا کیونکہ فاسد شرائط سے نکاح کے انعقاد میں کوئی فرق نہیں پڑتا"۔

یہ عبارت من و عن ہم نے نقل کر دی ہے۔ اب اس کی وضاحت ملاحظہ کیجئے۔ مولوی صدیق ہزاروی نے اس عبارت میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک حلت (عورت کو حلال کروانے) کی شرط پر نکاح صحیح ہو گا۔ اور یہی بات فقہ حنفی کی معتبر کتب کنز الدقائق ص ۱۲۶ مع فتح القدیر ۴/ ۳۴، ۳۵ فتاویٰ شامی ۲/ ۵۴۰، الجوہرة النیرة علی مختصر القدوری ص ۲/ ۱۲۹ اور دیگر کتب فقہ میں موجود ہے۔ یہ تو آپ نے پیچھے پڑھ لیا کہ نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق حلالہ کرنے والا اور کروانے والا ملعون ہیں اور حلالہ کرنے والا اُدھار سانڈ کی مانند ہے۔ یہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نکاح حلالہ صحیح نہیں بلکہ نکاح فاسد ہے۔ صاحب سبل السلام راقم ہیں:

" اَلْحَدِیْثُ یَدُلُّ عَلٰی تَحْرِیْمِ التَّحْلِیْلِ لِاَنَّهٗ لَا یَكُوْنُ اللَّعْنُ اِلَّا عَلٰی فَاعِلِ الْمُحَرَّمِ وَكُلُّ مُحَرَّمٍ مَنْهِیٌّ عَنْهُ وَالنَّهْیُ یَقْتَضِی الْفَسَادَ۔"

"مذکورہ حدیث حلالہ کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ اس لیے کہ لعنت کا اطلاق فعل حرام کے مرتکب پر ہی ہوتا ہے اور ہر حرام چیز پر شریعت میں نہی وارد ہے اور نہی فساد کا تقاضا کرتی ہے"

لہٰذا جب حلالہ حرام اور منہی عنہ ہے' اس لیے یہ نکاح فاسد قرار پاتا ہے۔ یہی مفہوم دیگر صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نکاح حلالہ نکاح فاسد ہے' زنا اور بدکاری ہے' نکاح صحیح نہیں ہے۔

سیرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے

((جَاءَ رَجُلٌ اِلَى ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَسَئَالَهُ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَاَتَهُ ثَلَاثًا فَتَزَوَّجَهَا اَخٌ لَهُ عَنْ غَيْرِ مُوَامَرَةٍ مِنْهُ لِيُحِلَّهَا لِاَخِيْهِ هَلْ تَحِلُّ لِلْاَوَّلِ قَالَ لَا اِلَّا نِكَاحَ رَغْبَةٍ كُنَّا نَعُدُّ هٰذَا سَفَاحًا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.))

"ایک آدمی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ایک ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ پھر اس (طلاق دینے والے آدمی) کے بھائی نے اس کے مشورے کے بغیر اس سے اس لیے نکاح کر لیا تاکہ وہ اس عورت کو اپنے بھائی کے لیے حلال کر دے۔ کیا یہ پہلے کے لیے حلال ہو سکتی ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ صحیح نکاح کے بغیر یہ حلال نہیں ہو سکتی ہم اس طریقے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بدکاری (زنا) شمار کرتے تھے"

(مستدرک حاکم ۲۸۰۶' ۲/۲۱۷ ط' قدیم' ۲/۱۹۹' بیہقی ۷/۲۰۸' التلخیص الحبیر باب موانع النکاح ۱۰۳۹' ۳/۱۷۱۔ تحفۃ الاحوذی ۲/۱۷۵' امام حاکم نے فرمایا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر ہے اور امام ذہبی نے تلخیص مستدرک میں امام حاکم کی موافقت کی ہے)

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((وَاللّٰهِ لَا أُوْتٰى بِمُحَلِّلٍ وَّلَا مُحَلَّلٍ اِلَّا رَجَمْتُهُمَا.))

"اللہ کی قسم میرے پاس حلالہ کرنے والا اور کروانے والا لایا گیا تو میں دونوں کو سنگسار کردوں گا"۔

(مصنف عبدالرزاق ۲/۲۶۵' سنن سعید بن منصور ۲/۴۹'۵۰' بیہقی ۷/۲۰۸)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی مزید تائید سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے اس فتوے سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی لایا گیا جس نے حلالے کی غرض سے نکاح کیا تھا تو انہوں نے ان دونوں کے درمیان جدائی کرا دی اور فرمایا ((لَا تَرْجِعُ اِلَيْهِ اِلَّا بِنِكَاحِ رَغْبَةٍ غَيْرِ دَلْسَةٍ)) کہ "یہ عورت حلالہ کے ذریعے پہلے خاوند کی طرف نہیں لوٹ سکتی بلکہ ایسے نکاح کے ذریعے لوٹ سکتی ہے جو رغبت کے ساتھ ہو اور دھوکہ دہی کے علاوہ ہو"۔ (بیہقی ۷/۲۰۸'۲۰۹)

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ:

((لَا يَزَالَانِ زَانِيَيْنِ وَاِنْ مَكَثَا عِشْرِيْنَ سَنَةً.))

"کہ حلالہ کرنے والا مرد و عورت اگرچہ بیس سال اکٹھے رہیں' وہ زنا ہی کرتے رہیں گے" (مغنی ابنِ قدامہ ۱۰/۵۱)

مذکورہ بالا احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ نکاح حلالہ صحیح نہیں بلکہ نکاح فاسد' زنا اور بدکاری ہے۔ امام ابوحنیفہ سے منسوب یہ موقف کہ "شرط فاسد ہے لیکن نکاح صحیح ہے اور زوجِ اوّل کے لیے حلال ہو سکتی ہے" حدیث کے خلاف' غلط اور باطل ہے۔ اس کے لیے کوئی بھی شرعی دلیل موجود نہیں۔ امام ابوحنیفہ کے دونوں شاگردوں کا موقف بھی امام ابوحنیفہ کے خلاف ہے۔ صاحبین کے نزدیک حلالے والی عورت پہلے خاوند کی طرف نہیں لوٹ سکتی۔ مولوی صدیق ہزاروی نے امام ابوحنیفہ کا موقف صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کی ہے کہ:

"آیت کریمہ میں دوسرے آدمی کو مُحَلِّل قرار دیا گیا ہے۔ اب اگر اس کے ساتھ نکاح جائز نہیں اور پھر طلاق کی صورت میں عورت پہلے خاوند کے لئے حلال قرار نہ پائے تو اس کو مُحَلِّل کہنے کا کوئی مقصد نہیں رہتا۔ یہ نکاح صحیح ہو گا' البتہ یہ لوگ گنہگار ہوں گے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اندھی تقلید کی وجہ سے حنفی علماء جب حیلوں اور بہانوں کے دروازے کھولنے پر آتے ہیں تو پھر قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ کا حلیہ بگاڑتے ہوئے خوف خدا کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی جس آیت کریمہ کی طرف مولوی صدیق ہزاروی نے یہ بات منسوب کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں دوسرے آدمی کو مُحَلِّلْ کہا ہے۔ اگر اس پر غور کریں تو اس صورت کا زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں اور اپنے مضمون میں کئی مفسرین کی تفسیروں کے حوالے سے جو یہ بات درج کی ہے' وہ اس صورت میں قطعاً مختلف ہے۔ قرآن مجید کی آیت میں اگر ان کے بقول بشرط تحلیل نکاح کو جائز رکھا گیا ہے تو میرے بھائیو کیا جائز کام کرنے پر لعنت مرتب ہوتی ہے اور انسان گناہگار ہوتا ہے جبکہ مولوی صاحب اقراری ہیں کہ نکاح صحیح ہے البتہ لوگ گنہگار ہوں گے۔

رہا حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے جو دوسرے شخص کو مُحَلِّلْ قرار دیا تو یہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کے اس غلط فعل کرنے سے وہ عورت کو پہلے خاوند کے لیے حلال کر سکتا ہے بلکہ اس لیے مُحَلِّلْ کہا ہے کہ اس نے عورت کو پہلے خاوند کے لئے حلال کرنے کا قصد کیا ہے اور یہی وجہ ہے اسے مُحَلِّلْ کہنے کی۔ یہی معنی اوپر سیدنا عبداللہ بن عمر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کردہ احادیث میں ہے۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے میں قرآن کریم پیش کرتا ہوں۔ غور کیجیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا ﴾ (توبہ : ۳۷)

"مہینے کا آگے پیچھے کرنا کفر میں زیادتی ہے۔ کافر اس وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں ایک سال تو اس مہینہ میں لڑنا حلال کر لیتے ہیں اور ایک سال اس میں لڑنا حرام کرتے ہیں"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو ﴿ مُحِلُّوْنَ ﴾ اور ﴿ مُحَرِّمُوْنَ ﴾

قرار دیا ہے تو کیا کفار کے یہ فعل کرنے سے واقعی حلت و حرمت ثابت ہو جاتی تھی یا کہ ان کے زعم باطل میں یہ حلال و حرام سمجھے جاتے تھے۔ جس طرح کفار کو حلال کرنے والے اور حرام کرنے والے کہنے سے کسی چیز کی حلت و حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ کفر کا غلط مقصد و ارادہ ہی مُراد ہوتا ہے' اسی طرح حلالہ کرنے والے کو مُحَلِّلْ کہہ دینے سے عورت پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہوتی بلکہ اس بنا پر اسے مُحَلِّلْ کہا کہ اس نے اسے حلال کرنے کا ارادہ و قصد کیا ہے۔ یہی مفہوم ائمہ لغت اور شارحین حدیث نے بیان کیا ہے۔ النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ص ۴۳۱/۱ پر ہے کہ :

سُمِّیَ مُحَلِّلاً بِقَصْدِهٖ اِلَی التَّحْلِیْلِ کَمَا یُسَمّٰی مُشْتَرِیًا اِذَا قَصَدَ الشِّرَاءَ

"اس کو مُحَلِّلْ اس لیے کہا گیا کہ اُس نے حلال کرنے کا قصد کیا ہے جیسا کہ سودا خریدنے والے کا ارادہ کرنے والے کو مشتری کہا جاتا ہے"

یہی معنی امام بغوی نے شرح السنہ ۱۰۱/۹ پر لکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ.))

"جس شخص نے قرآنِ مجید کی حرام کردہ اشیاء کو حلال گردانا' وہ قرآن پر ایمان نہیں لایا" (ترمذی باب فضائل قرآن)

اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے قرآن کی حرام کردہ اشیاء کو حلال کرنے والے کے لیے اِسْتَحَلَّ لفظ استعمال کیا تو کیا اس کو مُسْتَحِلٌّ کہہ دینے سے واقعی قرآن مجید کی حرام کردہ اشیاء حلال قرار پائیں گی۔

مندرجہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ کا بیان کیا گیا استدلال لفظ مُحَلِّلْ سے باطل ہے۔ حنفی حضرات نے حلالہ کو جائز رکھنے کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے بنا رکھے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے فقہ حنفی کی کتاب کبیرا اور الکفایہ میں ہے :

" وَلَوْ خَافَتِ الْمَرْاَۃُ اَنْ لَّا یُطَلِّقَھَا الزَّوْجُ الثَّانِی فَالْحِیْلَۃُ اَنْ تَقُوْلَ

زَوَّجْتُ نَفْسِي عَلٰى اَنْ يَّكُوْنَ اَمْرِيْ بِيَدِيْ كُلَّمَا شِئْتُ فَيَقْبَلُ الرَّجُلُ جَازَ النِّكَاحُ وَصَارَ الْاَمْرُ بِيَدِهَا۔"

"تین طلاقوں کے بعد جب حلالہ کے لیے عورت کا نکاح کسی دوسرے مرد سے کر دیا جائے اور عورت کو یہ ڈر ہو کہ دوسرا خاوند اسے طلاق نہیں دے گا تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ عورت کہے میں نے اپنے آپ کو تیرے نکاح میں اس شرط پر دیا کہ طلاق کا معاملہ میرے ہاتھ میں ہو گا' جب بھی میں چاہوں گی تو مرد اس بات کو قبول کر لے تو جائز ہے اور معاملہ عورت کے ہاتھ میں ہو گا"

مذکورہ بالا فقہی نکتہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حنفی حضرات کے ہاں جو مروجہ حلالہ ہے اسے یہ بالکل جائز سمجھتے ہیں اور اس بدکاری کو جاری رکھنے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں انکے ہاں فقہ حنفیہ میں موجود ہیں۔ حنفی حضرات کے ہاں تو حلالہ اگر اس غرض سے کیا جائے کہ حلالہ کرنے والا یہ قصد کر لے کہ یہ عورت میرے پہلے بھائی کے لیے حلال ہو جائے تو اس کی اس نیت پر اسے اجر ملے گا۔ ملاحظہ کیجئے فتح القدیر شرح ہدایہ ۳۴/۴' البحر الرائق شرح کنز الدقائق ۵۸/۴' فتاویٰ شامی ۵۴۰/۲' چلپی حاشیہ شرح وقایہ۔ اردو دان حضرات ملاحظہ کریں نور الہدایہ ترجمہ شرح وقایہ ۴۹/۲ اور تقریری ترمذی اردو محمد تقی عثمانی ۳۹۹/۳۔

حنفیوں کا حلالہ اور شیعوں کا متعہ

حلالہ اور متعہ تقریباً دونوں ایک ہی ہیں جیسا کہ امام بغوی نے شرح السنہ ۱۰۱/۹ پر لکھا ہے اور قاضی ابویوسف جو فقہ حنفیہ کے سرتاج ہیں ان کے نزدیک حلالہ وقتی نکاح ہے اور فاسد ہے ملاحظہ کیجئے الجوہرۃ النیرہ شرح قدوری ۱۲۹/۲' فتح القدیر ۳۴/۴' فتاویٰ شامی ۵۴۰/۲ وغیرہ۔ فقہ جعفریہ کے نزدیک متعہ بڑی بابرکت چیز ہے اور اس کے بہت سے فضائل ہیں جیسا کہ شیعہ کی تفسیر منہج الصادقین اور برہان المتعہ میں مرقوم ہے کہ ایک بار متعہ کرنے والا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے درجہ پر' دوبار کرنے والا سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے درجہ پر' تین بار متعہ کرنے والا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے

درجہ پر اور چار بار متعہ کرنے والا نبی ﷺ کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے اور حنفیہ کے نزدیک پہلے بھائی کے لیے حلال کرنے کی غرض سے یہ کام کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر پائے گا۔ متعہ اور حلالہ دونوں صورتوں میں طے شدہ مدت کے لیے نام نہاد نکاح کیا جاتا ہے اور دونوں صورتوں میں بدکاری کو خوب فروغ ملتا ہے۔

"لعنت سے مُراد رحمت ہے"

اللہ کے رسول ﷺ سے منسوب ایک اور جھوٹی تاویل

ان حضرات کے حیلے اور بہانوں کے لیے حلالہ کی تاویل فاسد پر مبنی یہ حوالہ بھی مد نظر رکھیے۔ حنفی فقہ کی مشہور کتاب کنز الدقائق کی شرح مستخلص الحقائق صفحہ ۱۲۶ پر اللہ کے نبی ﷺ کی اس حدیث ((لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ)) "حلالہ کرنے والے اور کروانے والے دونوں پر اللہ کی لعنت ہو" کی تاویل یہ لکھی ہے کہ "وَإِنْ كَانَ بِشَرْطِ التَّحْلِيْلِ فَيَحْتَمِلُ أَنْ أَرَادَ بِاللَّعْنِ الرَّحْمَةَ" اگر یہ حدیث نکاح بشرط تحلیل کے متعلق ہے تو اس میں اس معنی کا احتمال ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے لعنت کا لفظ بول کر رحمت مُراد لی ہو۔ حنفی حضرات کی اس دیدہ دلیری پر غور کیجئے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی لعنت کو رحمت میں بدل دیا یعنی حلالہ کرنے والا اور کروانے والا دونوں رحمت کے مستحق ہیں۔ اس منطق کو مان لیا جائے تو پھر اور بھی بہت سے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے :

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدَيْهِ وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ.)) (مسلم ۱۵۹۸)

"رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، سود لکھنے والے اور اس کے گواہ بننے والوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا یہ سارے برابر ہیں"

سود خور حضرات کہہ سکتے ہیں کہ فقہ حنفی ہمیں سود کھانے کی اجازت دیتی ہے۔ ممکن ہے اللہ کے نبی ﷺ نے لفظ لعنت کا استعمال کیا ہو اور مُراد رحمت لی ہو۔ اسی

طرح ایک حدیث میں وارد ہے :

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْخَمْرِ عَشَرَةً عَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَشَارِبَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ اِلَيْهَا وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَالْمُشْتَرِي لَهَا وَالْمُشْتَرَى لَهٗ))

"رسول اللہ ﷺ نے شراب کے بارے میں دس افراد پر لعنت کی ہے نچوڑنے والا' نچڑوانے والا' پینے والا' اس کو اٹھانے والا' جس کی طرف اسے اٹھایا جائے' شراب پلانے والا' بیچنے والا' اس کو خریدنے والا جس کے لیے اس کو خریدا جائے" (ترمذی)

شرابی حضرات کے لیے نادر موقع ہے کہ کہہ دیں' ممکن ہے اللہ کے نبی ﷺ نے لفظ لعنت ہی استعمال کیا ہو۔ مُراد رحمت لی ہو اسی طرح دیگر اُمورِ ملعونہ کے بارے میں بھی اس طرح کے احتمالات پیدا کر کے جواز کی گنجائش نکالنے والے نکال سکتے ہیں۔ فقہ حنفیہ میں اس طرح کے بے شمار حیلے موجود ہیں جو مختلف امور محرمہ سرانجام دینے کے لیے بڑے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ انکے متعلق کسی دوسرے موقع پر گفتگو کریں گے ان شاء اللہ

آخر میں صرف اتنی عرض ہے کہ حنفی علماء کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہ ہونے کے باوجود صرف اس لیے ایک حرام چیز کو بھی تاویلیں کر کے حلال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ یہ انکی اندھی تقلید کا تقاضا ہے۔ مقلدوں نے اپنے اپنے اماموں کے ناموں پر فرقے کھڑے کر دیئے اور پھر اپنے امام کی ہر بات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں.... حالانکہ یہ نبی ﷺ کا مقام ہے کہ ان کی ہر بات کو صحیح سمجھا جائے۔ یہ مقام امتیوں کو دینے کا نتیجہ ہے کہ آج ہم خرافات میں ڈوب گئے ہیں اور انہی خرافات کی وجہ سے دشمنان اسلام کو مسلمانوں پر طعن کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صرف کتاب و سنت کے راستے پر چلائے۔ آمین

حلالہ کے بارے میں

س: وضاحت کریں کہ حلالہ کیا ہوتا ہے کچھ دنوں پہلے سنا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے جب کہ دیوبندی حضرات اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ (محمد امین' بہاولپور)

ج: خاوند جب اپنی بیوی کو تیسری طلاق دے دے تو وہ عورت اس پر حرام ہو جاتی ہے جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے مجامعت نہ کرلے اور وہ خاوند اسے خود بخود طلاق دے تو پھر یہ عورت اگر پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے کہ :

﴿ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ ﴾

(البقرہ : ۲۳۰)

"اب اگر پھر تیسری بار اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت اس پر حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔ اب اگر دوسرا خاوند اس کو طلاق دے دے تو پہلا خاوند اور یہ بیوی آپس میں ملاپ کر سکتے ہیں (یعنی نیا نکاح پڑھا کر) اگر دونوں یہ سمجھیں کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے"

اس کے برعکس جو لوگوں نے یہ طریقہ ایجاد کر رکھا ہے کہ دوسرے خاوند سے اس غرض سے نکاح کیا جائے کہ وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے اور یہ دوسرا خاوند اس کے ساتھ ایک رات یا اس سے کم و بیش حصہ گزار کر طلاق دے دے تو یہ حلالہ ہے۔ اس پر اللہ کے رسول نے لعنت فرمائی ہے جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ :

((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ.))

"بے شک رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے اور کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔" (ترمذی ۳/۴۲۸(۱۱۹)' ابوداود ۲/۵۶۳(۲۰۵۶)' ابن ماجہ ۱/۶۲۲)

یہی حدیث ابنِ مسعود ' ابنِ عباس اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے بلکہ عقبہ بن عامر کی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِالتَّيْسِ الْمُسْتَعَارِ؟ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْمُحَلِّلُ لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ.))

"کیا میں تمہیں مستعار سانڈھ کی خبر نہ دوں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں نہیں؟ تو آپ نے فرمایا حلالہ کرنے والا اُدھار لئے ہوئے سانڈھ کی طرح ہے اللہ تعالیٰ حلالہ کرنے اور کرانے والے پر لعنت کرے" (ابنِ ماجہ ۱/ ۶۲۳)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حلالہ کرنا اور کرانا حرام ہے۔ اور جو لوگ اسے جائز سمجھتے ہیں ان کا نظریہ ان صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

کتاب

الطَّلَاقِ

طلاقِ ثلاثہ کا شرعی حکم

س: مسمی محمد نواز بن اسماعیل مہاجر نے گھریلو ناچاقی کی بنا پر اپنی بیوی بشریٰ کو تین دفعہ یہ الفاظ کہے : میں نے تمہیں طلاق دی' طلاق دی' طلاق دی۔ پھر اس عمل پر ندامت کے باعث اگلی ہی رات اپنی بیوی سے رجوع کر لیا اور اس واقعہ سے ڈیڑھ ماہ بعد مولوی عطاء اللہ حنفی نے محمد نواز کے چھوٹے بھائی محمد یار سے جو کہ نابالغ تھا نکاح کر دیا جبکہ بیوی محمد نواز کے پاس ہی رہی۔ ۵ دن بعد مولوی صاحب نے خاوند کی والدہ کی موجودگی میں اس نابالغ خاوند سے تینوں طلاقیں اکٹھی واپس لے لیں۔ نیز مولوی صاحب نے ہدایت کی کہ حلالہ کے دوران بیوی اپنے پہلے خاوند محمد نواز ہی کے پاس رہے گی۔ کتاب و سنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں۔

(سائل محمد نواز بن اسماعیل مہاجر مقام و ڈاک خانہ چک نمبر ۴۴ تحصیل پھالیہ ضلع منڈی بہاؤ الدین)

ج: اَلْجَوَابُ بِعَوْنِ الْوَهَّابِ وَمِنْهُ الصِّدْقُ وَالصَّوَابُ وَإِلَيْهِ الْمَرْجَعُ وَالْمَآبُ = اللہ تعالیٰ نے شریعت اسلامیہ میں مرد و زن کے درمیان ناچاقی کی بناء پر جو تفریق ہو جاتی ہے اس کا حل بڑے ہی احسن انداز میں فرمایا ہے۔ جب ایک خاوند اور بیوی کے درمیان کسی وجہ سے تنازع اور اختلاف جنم لیتا ہے اور ان میں مودت و محبت ختم ہو جاتی ہے اور مرد اپنی منکوحہ کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا تو اسے شریعت کی رو سے حق حاصل ہے کہ وہ اسے طلاق دے کر فارغ کر دے۔ طلاق کا صحیح طریق کار یہ ہے کہ مرد اپنی زوجہ کو اس طہر میں جس میں اُس نے مجامعت نہیں کی ایک طلاق دے دے اور بیوی کو اسی حال میں چھوڑ دے یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے۔ اختتامِ عدت پر بیوی کو ایک طلاق بائن پڑ جاتی ہے۔ دوران عدت اگر خاوند کو ندامت وغیرہ ہو اور وہ اپنی بیوی سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو اسے رکھ سکتا ہے اور اگر عدت گزرنے کے بعد دونوں میں صلح ہو جائے تو نکاح جدید کے ساتھ دوبارہ اپنا گھر آباد کر سکتے ہیں اور اگر شوہر عدت کے بعد بیوی کو بسانا نہ چاہے تو عورت آزاد ہے وہ کہیں اور اپنا عقد کروا سکتی ہے۔ اگر پہلی طلاق کے بعد شوہر اپنی

مطلقہ کو زوجیت میں لے لیتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے تعلقات بحال کر لیتا ہے اور پھر کسی وقت دونوں میں شیطانی وساوس و خطرات کی بنا پر حالات کشیدہ ہو گئے اور صلح و صفائی نہ ہو سکی تو دوسری طلاق دے سکتا ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اور دوسری طلاق کے بعد عدت کے دوران مرد کو رجوع کا حق ہے اور عدت کے بعد نکاح جدید سے دوبارہ خانہ آبادی ہو سکتی ہے اس کے بعد پھر کبھی تیسری طلاق دے ڈالی تو عورت قطعی طور پر حرام ہو جائے گی اور رجوع کا حق ختم ہو جائے گا۔ عورت عدت گزار کر کسی دوسرے مرد سے نکاح کروا سکتی ہے اور یہ نکاح شرعی طریقے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی نیت سے ہو نہ کہ شوہر اول کے لیے حلال ہونے کی غرض سے..... اب اگر زوجِ ثانی فوت ہو گیا یا زندگی میں کبھی اس نے طلاق دے دی اور یہ عورت دوبارہ اگر شوہر اول کی طرف لوٹنا چاہے تو عدت کے بعد اس کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے اور ایسا واقعہ ہزاروں میں سے شاید کوئی ایک آدھ ہوا ہو۔

زمانۂ جاہلیت میں لوگ اپنی بیویوں کو کئی کئی بار طلاق دیتے اور عدت کے اندر رجوع کرتے رہتے تھے نہ عورت کو صحیح بساتے اور نہ ہی آزاد کرتے۔ مقصد زوجہ کو تنگ کرنا ہوتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے اس دستور کو ختم کر کے دو بار رجوع کا حق دے دیا اور تیسری بار بالکل ان کا رشتہ ختم کر ڈالا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾

(البقرہ : ۲۲۹)

"طلاق (جس کے بعد خاوند رجوع کر سکتا ہے) دوبار ہے پھر دو طلاقوں کے بعد یا تو دستور کے موافق اپنی بیوی کو رہنے دے یا اچھی طرح سے رخصت کر دے"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ فرمایا ہے اور مَرَّتَانِ مَرَّةٌ کا تثنیہ ہے جس کا مطلب صاف ہے کہ طلاق دو مرتبہ وقفہ بعد وقفہ ہے نہ کہ اکٹھی دو طلاقیں اور اس کی کئی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ ایک مقام پر فرمایا :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ﴾ (نور : ۵۸)

"اے ایمان والو تم سے تین مرتبہ تمہارے غلام اور نابالغ بچے بھی اذن طلب کیا کریں نماز فجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتارتے ہو۔ اور عشاء کی نماز کے بعد اور یہ تین اوقات تمہارے لیے پردے کے ہیں"۔

مذکورہ بالا آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ثَلٰثَ مَرّٰتٍ کا لفظ استعمال کیا ہے جو کہ مرۃ کی جمع ہے اور ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی کر دی کہ یہ تین اوقات وقفہ بعد وقفہ ہیں جس سے معلوم ہوا کہ مرۃ میں دفعہ کا مفہوم شامل ہے۔ لہٰذا ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ کا معنی یہ ہوا کہ دو مرتبہ وقفہ بعد وقفہ طلاق ہے جس میں مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے۔ اگر بیک وقت ان طلاقوں کو نافذ کر دیا جائے تو مرد کو اللہ نے جو سوچ بچار کا وقفہ فراہم کیا تھا وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اِس لیے شریعت اسلامیہ میں بیک وقت اکٹھی تین طلاقیں دینے کو شرع سے مذاق قرار دیا گیا ہے جیسا کہ سنن نسائی کتاب الطلاق میں حدیث ہے کہ ایک آدمی نے عہدِ رسالت (ﷺ) میں تین اکٹھی طلاقیں دے دیں تو اللہ کے نبی ﷺ اس پر ناراض ہوئے اور فرمایا :

((اَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ اَوْ كَمَا قَالَ؟))

"کیا میری موجودگی میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔"

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ اکٹھی تین طلاقیں دے دینا شریعت کے ساتھ مذاق ہے اور حرام و ناجائز ہے۔

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ کے بعد پھر آگے ارشاد فرمایا :

﴿ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ﴾

(البقرہ : ۲۳۰)

"پھر اگر وہ اس کو طلاق دے دے (یعنی تیسری طلاق) تو اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے پھر اگر وہ (شوہر ثانی) اس کو طلاق دے دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں رجوع کر لیں اگر انھیں یقین ہے کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے"

یعنی اس طرح وقفہ بعد وقفہ تیسری طلاق واقع ہو جائے تو عورت مرد کے لیے قطعی طور پر حرام ہو جائے گی تاوقتیکہ عورت کا خانہ آبادی کی خاطر کسی دوسرے مرد سے نکاح ہو اور حسب دستور زندگی گزاریں اور پھر کبھی ناچاقی ہو تو زوج ثانی طلاق دے دے یا فوت ہو جائے تو پھر شوہر اول کی طرف بیوی لوٹ سکتی ہے۔ بیک وقت اکٹھی تین طلاقیں دے دینے سے صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوتی ہے شریعت اسلامیہ کا یہی فتویٰ ہے اور عہدِ رسالت (ﷺ) میں یہی طریق کار تھا جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ :

((كَانَ الطَّلَاقُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِيْ بَكْرٍ وَّسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةٌ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِيْ اَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيْهِ اَنَاةٌ فَلَوْ اَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِم فَاَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ))

"رسول اکرم ﷺ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو سالوں میں اکٹھی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھی۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس کام میں لوگوں کے لیے سوچ و بچار کی مہلت دی گئی تھی اس میں انہوں نے جلدی کی۔ اگر ہم ان پر تینوں لازم کر دیں... تو انہوں نے اس فیصلے کو ان پر لازم کر دیا" (صحیح مسلم ۱/۴۷۷، مسند احمد ۱/۳۱۴)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عہدِ رسالت (ﷺ) اور عہدِ ابو بکر (رضی اللہ عنہ) اور عمر (رضی اللہ عنہ) کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں اکٹھی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھی اور عہدِ رسالت (ﷺ) کا فیصلہ شرعی فیصلہ تھا کیونکہ دین رسول اکرم ﷺ پر مکمل ہوا

آپ کے بعد کسی شخص پر وحی نازل نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جو فیصلہ کیا وہ تہدیداً اور بطورِ سزا کے تھا نہ کہ شرعاً اس طرح درست تھا۔

اور یہ فیصلہ اگر شرعی تھا سیاسی و تعزیری نہ تھا تو عہدِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم)، عہدِ ابی بکر اور خود ان کے ابتدائی دو سالوں میں جو فیصلہ تھا پھر اس کی کیا حیثیت بنتی ہے یہی بات ہے کہ حنفی علماء نے بھی اس کو تعزیری اور سیاسی فیصلہ ہی تسلیم کیا ہے جو کہ ایک حاکم وقت بعض اوقات جاری کر دیتا ہے اس بات کی تفصیل فقہ حنفی کی معروف کتاب جامع الرموز کتاب الطلاق اور حاشیہ طحطاوی ۱۱۵/۲ پر موجود ہے۔

لہٰذا سائل مذکور نے جو اپنی زوجہ کو تین اکٹھی طلاقیں دے دیں وہ شرعاً ایک طلاق رجعی واقع ہوئی ہے اور سائل نے ایک دن بعد جو اپنی زوجہ سے رجوع کر لیا یہ اس کا شرعی حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ میں عنایت فرمایا اور اس کے بعد حنفی مولوی کا سائل کی بیوی کو حلالہ کے لیے اس کے بھائی سے نکاح پڑھنا شرعاً فعل حرام ہے اور مولوی مذکور کی جہالت، نادانی، بے وقوفی اور حماقت ہے ایسے ہی جاہل مولوی لوگوں کی گمراہی کا باعث بنتے ہیں۔ سائل کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی مذکور اپنے مذہب سے بھی بے خبر اور جاہل ہے۔ دورانِ عدت نکاح پڑھنا کسی بھی مکتب فکر کے نزدیک جائز نہیں فقہ حنفی کی رو سے جو طلاقِ ثلاثہ کا وقوع ہوتا ہے اس کی اجازت نہیں کہ عدت کے دوران ہی نکاح حلالہ کیا جائے اور عورت کو پہلے خاوند کے پاس ہی رہنے دیا جائے اور نکاح دوسرے شوہر سے پڑھ دیا جائے۔ یہ ایک لطیفہ سے کم نہیں۔ بہرکیف حلالہ کروانا شرعاً ناجائز و حرام ہے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل پر لعنت ذکر کی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے زنا سمجھتے تھے:

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ))

"سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ حلالہ

کرنے والے اور کروانے والے پر لعنت کرے"۔ (مسند احمد ۲/ ۳۲۳، بیہقی ۷/ ۲۷)

علاوہ ازیں یہی حدیث سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نسائی، ابنِ ابی شیبہ، جامع ترمذی اور سنن داری میں موجود ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح اور امام ابنِ قطان نے بخاری کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ ملاحظہ کیجئے التلخیص الحبیر لابن حجر عسقلانی علاوہ ازیں سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِالتَّيْسِ الْمُسْتَعَارِ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هُوَ الْمُحَلِّلُ لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ))

"کیا میں تمہیں ادھار سانڈھ کی خبر نہ دوں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کیوں نہیں اے اللہ کے رسول؟ (صلی اللہ علیہ وسلم) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ حلالہ کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ حلالہ کرنے اور کروانے والے پر لعنت کرے۔"

(ابنِ ماجہ ۱۹۳۶، مستدرک حاکم ۲/ ۱۹۸، بیہقی ۷/ ۲۰۸)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((وَاللّٰهِ لَا اُوْتٰى بِمُحَلِّلٍ وَّلَا مُحَلَّلٍ اِلَّا رَجَمْتُهُمَا))

"اللہ کی قسم میرے پاس حلالہ کرنے والا اور کروانے والا لایا گیا تو میں دونوں کو سنگسار کردوں گا"

(مصنف عبدالرزاق ۲/ ۲۶۵، سنن سعید بن منصور ۲/ ۴۹، ۵۰، بیہقی ۷/ ۲۰۸)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

((لَا يَزَالَانِ زَانِيَيْنِ وَاِنْ مَكَثَا عِشْرِيْنَ سَنَةً))

"حلالہ کرنے والا مرد و عورت اگرچہ بیس سال اکٹھے رہیں، وہ زنا ہی کرتے رہیں گے" (المغنی ابنِ قدامہ ۱۰/ ۵۱)

((جَاءَ رَجُلٌ اِلَى ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَسَاَلَهٗ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَاَتَهٗ ثَلَاثًا فَتَزَوَّجَهَا اَخٌ لَهٗ عَنْ غَيْرِ مُؤَامَرَةٍ مِّنْهُ لِيُحِلَّهَا لِاَخِيْهِ هَلْ تَحِلُّ

لِلْأَوَّلِ قَالَ لَا إِلَّا نِكَاحَ رَغْبَةٍ كُنَّا نَعُدُّ هٰذَا سَفَاحًا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ))

"ایک آدمی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ایک ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ پھر طلاق دہندہ کے بھائی نے اس کے مشورے کے بغیر اس عورت سے نکاح کر لیا تاکہ وہ اس کو اپنے بھائی کے لیے حلال کر دے۔ کیا یہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو سکتی ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نکاح شرعی کے بغیر یہ حلال نہیں ہو سکتی ہم اس طریقے (یعنی حلالہ) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بدکاری (زنا) شمار کرتے تھے" (ملاحظہ ہو : مستدرک حاکم ۲۸۶، ۲/۲۱۷، بیہقی ۷/۲۰۸ التلخیص الحبیر ۳/۱۷۱۔ تحفۃ الاحوذی ۲/۱۷۵، امام حاکم نے اس روایت کو بخاری مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے ان کی اس پر موافقت کی ہے)

مذکورہ بالا احادیث و آثار صحیحہ سے معلوم ہوا کہ حلالہ کرنا زنا ہے اور فعل حرام حلالہ کرنے اور کروانے والا لعنتی ہے۔ لہٰذا مولوی مذکور کا سائل کی زوجہ کو حلالہ کے لیے دعوت دینا بلکہ نکاح حلالہ پڑھنا فعل حرام کا ارتکاب ہے اور شریعت اسلامی کی رو سے بدکاری و فحاشی کو پھیلانا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لعنتی عمل سے محفوظ رکھے مذکورہ بالا دلائل کی رو سے سائل مذکور نے جو اپنی زوجہ کو تین طلاقیں اکٹھی دے ڈالیں وہ شرعاً ایک طلاق رجعی ہے جس میں اسے رجوع کا حق حاصل ہے اور سائل نے اپنے اس حق کو استعمال کر کے اپنی زوجہ سے رجوع کر لیا اور دوبارہ خانہ آبادی کر لی ہے۔ اب یہ بلا تردد و شبہ اپنا گھر آباد رکھیں رجوع کے بعد حنفی مولوی کا نکاح حلالہ پڑھنا پھر تین طلاقیں دلوانا سارا کام عبث، ناجائز و حرام ہے اور یہ نکاح باطل ہے جس کی تنفیذ نہیں ہو سکتی۔

نوٹ : بریلوی علماء میں سے چیف جسٹس پیر کرم شاہ بھیروی کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ تفصیل کے لیے ان کی تفسیر ضیاء القرآن سورۃ البقرۃ ملاحظہ کریں اس طرح کئی

حنفی علماء کے فتاویٰ اس موقف کی تائید میں "مجموعہ مقالاتِ علمیہ' ایک مجلس کی تین طلاق" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

حالتِ حمل میں دی ہوئی طلاق کا حکم

س میرے ایک دوست محمد سلیم ولد شہاب الدین نے اپنی بیوی کو اس کی والدہ اور بھائی کے روبرو تین مرتبہ یہ کہہ کر کہ "میں تجھے طلاق دیتا ہوں" چلا گیا جبکہ اس کی بیوی سات آٹھ ماہ سے حاملہ بھی ہے اس کے بارے میں فتویٰ صادر فرمائیں کہ آیا صلح صفائی کی کوئی صورت ہو سکتی ہے یا کہ طلاق کامل ہو چکی ہے؟

(خواجہ رشید' لاہور)

ج حالتِ حمل میں ہونے والی طلاق کو طلاق سنی کہا جاتا ہے۔ اس طلاق میں عدت کے اندر رجوع کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہ والی روایت صحیح مسلم (۱۰۴۵/۲) (۱۴۷۱) میں ہے جس میں یہ الفاظ مروی ہیں کہ ((مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا ثُمَّ لِيُطَلِّقْهَا طَاهِرًا أَوْ حَامِلًا)) سیدنا ابنِ عمر نے حالت حیض میں طلاق دی تو سیدنا عمر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے حکم دیں کہ وہ رجوع کرے پھر حالت طہر یا حمل میں طلاق دے۔ معلوم ہوا کہ حالت حمل میں دی ہوئی طلاق کا وقوع ہو جاتا ہے اور مرد کو رجوع کا حق ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ﴾

(البقرہ : ۲۲۸)

"یعنی ان کے خاوند اگر موافقت چاہیں تو اس (مدت) میں وہ ان کو اپنی زوجیت میں لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔"

صورتِ مسئولہ میں عدت چونکہ وضع حمل ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ (الطلاق : ۴)

"اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے۔"

تین بار اکٹھی طلاق دینے سے ایک ہی طلاق رجعی واقع ہوتی ہے اور قرآن و

سنت سے یہی ثابت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ﴾

(بقرہ : ۲۲۹)

"رجعی طلاقیں دو ہیں اس کے بعد یا تو بیوی کو آباد رکھنا ہے یا پھر شائستگی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے"۔

اس آیت میں لفظ مَرَّتَانِ کا مطلب مَرَّةٌ بعد مَرَّةٍ یعنی ایک دفعہ کے بعد دوسری دفعہ طلاق دینا' نہ کہ محض لفظی تکرار اگر دو طلاقیں ہوتا تو آیت یوں ہوتی اَلطَّلَاقُ طَلْقَتَانِ جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے اس کی مثالیں قرآن مجید میں مذکور ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ اَوَلَا يَرَوۡنَ اَنَّهُمۡ يُفۡتَنُوۡنَ فِىۡ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوۡ مَرَّتَيۡنِ ﴾ (توبہ : ۱۲۶)

"کیا لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ انہیں آزمائش میں ڈالا جاتا ہے"

اور دوسری جگہ فرمایا :

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لِيَسۡتَاۡذِنۡكُمُ الَّذِيۡنَ مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ وَالَّذِيۡنَ لَمۡ يَبۡلُغُوا الۡحُلُمَ مِنۡكُمۡ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ﴾ (نور : ۵۸)

"اے ایمان والو تمہارے مملوک اور تمہارے نابالغ بچے تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں"۔

اس آیت کے بعد ان تین اوقات کی تفصیل بیان کر دی۔ ظاہر ہے یہاں ثلاث کا مطلب الگ الگ تین اوقات ہیں نہ کہ ایک ہی زمانہ میں تین اوقات کا اجتماع۔ اس سے واضح ہوا کہ مَرَّتَانِ کا مطلب ہے کہ طلاق رجعی دو دفعہ ہے نہ کہ دو طلاقیں اکٹھی۔

اب چند ایک صحیح احادیث ملاحظہ فرمائیں :

((عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ الطَّلَاقُ عَلٰى عَهۡدِ رَسُوۡلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ وَاَبِىۡ بَكۡرٍ وَّسَنَتَيۡنِ مِنۡ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ

الثَّلَاثِ وَاحِدَةً)) الخ

"سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے خلافت کے دو سال تک تین طلاقیں (اکٹھی) ایک ہی شمار ہوتی تھیں" (مسلم ۱۰۹۹/۲)

اب اس کے بعد ایک صحیح اور سچا واقعہ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ملاحظہ کریں :

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ طَلَّقَ رُكَانَةُ بْنُ عَبْدِ يَزِيْدَ اَخُوْ بَنِي مُطَّلِبٍ امْرَاَتَهٗ ثَلَاثًا فِي مَجْلِسٍ وَّاحِدٍ فَحَزِنَ عَلَيْهَا حَزَنًا شَدِيْدًا قَالَ فَسَاَلَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ طَلَّقْتَهَا؟ قَالَ : طَلَّقْتُهَا ثَلَاثًا قَالَ، فَقَالَ : فِيْ مَجْلِسٍ وَّاحِدٍ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاِنَّمَا تِلْكَ وَاحِدَةٌ فَارْجِعْهَا اِنْ شِئْتَ قَالَ فَرَجَعَهَا))

"رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں اور اس پر بہت رنجور اور غمگین ہوا۔ تو اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے پوچھا کہ تو نے کیسے طلاق دی اُس نے کہا میں نے اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہیں۔ آپ نے پوچھا کیا ایک ہی مجلس میں اُس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا یہ ایک ہی واقع ہوئی ہے اگر تو چاہتا ہے تو رجوع کرلے تو اُس نے رجوع کر لیا" (مسند احمد ۲۶۵/۱، مسند ابی یعلیٰ (۲۴۹۵) ۲۵/۳، بیہقی ۳۳۹/۷، فتح الباری ۳۶۳/۹، اغاثۃ اللھفان ۳۰۵/۱)

تین اکٹھی طلاقوں میں یہی مسلک طاؤس، ابنِ اسحاق، حجاج بن ارطاۃ، محمد بن مقاتل تلمیذ امام ابوحنیفہ اور ظاہریہ کا ہے۔ علامہ عینی حنفی نے عمدۃ القاری ۵۳۷/۹ پر ایسے ہی درج کیا ہے۔

قاضی شوکانی نے نیل الاوطار ۲۴۵/۶ پر لکھا ہے کہ اہل علم کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ طلاق، طلاق کے پیچھے واقع نہیں ہوتی اور ایسی صورت میں صرف ایک ہی طلاق پڑتی ہے۔ صاحب بحر نے اس کو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے اور ایک

روایت سیدنا علی اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہم سے طاؤس' عطاء بن جابر بن یزید' ہادی قاسم' ناصر احمد بن عیسیٰ و عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ اور زید بن علی اور متاخرین ائمہ فقہاء محدثین میں سے امام ابنِ تیمیہ' ابنِ قیم رحمہما اللہ وغیرہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ مشائخ قرطبہ میں محمد بن بقی' محمد بن عبدالسلام وغیرہ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔

لہٰذا مذکورہ بالا صورت میں محمد سلیم ولد شہاب الدین اپنی بیوی سے وضع حمل سے قبل رجوع کر سکتا ہے۔ ایک ہی طلاق رجعی واقع ہوئی ہے حلالہ جیسے ملعون فعل کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ (مجلۃ الدعوۃ' جنوری/ ۱۹۹۳ء)

ایک محفل میں غلطی سے تین دفعہ طلاق کہنے کے بعد کیا کرے؟

س کسی نے ایک محفل میں اپنی بیوی کو تین مرتبہ طلاق کہہ دیا پھر اس کو غلطی کا احساس ہوا۔ اب وہ دونوں اکٹھے رہنا چاہتے ہیں کیا یہ طلاق ہو گی یا نہیں؟ اگر طلاق ہو گئی ہے تو واپس میاں بیوی کے ملنے کا طریقہ کیا ہے؟ اگر طلاق نہیں ہوئی تو طلاق دینے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

(عبدالواحد کٹھی بدین شہر سندھ)

ج مذکورہ صورت میں طلاق واقع ہو گئی ہے لیکن یہ ایک ہی طلاق ہو گی۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں :

((كَانَ الطَّلَاقُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِىْ بَكْرٍ وَّسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً)) الخ

" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں' ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے دو سالوں تک تین مرتبہ طلاق کہنے سے ایک طلاق واقع ہوتی تھی۔"

(صحیح مسلم ۱/۴۷۷)

اب اگر اس مطلقہ عورت کی عدت گزر چکی ہے تو نیا نکاح کر سکتا ہے۔ ورنہ عدت

کے اندر بغیر نکاح کے رجوع کر سکتا ہے۔ ﴿ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلاثَةَ قُرُوْءٍ ﴾ آگے ہے ﴿ وَبُعُولَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلاَحًا ﴾ (بقرہ : ۲۲۸) کہ طلاق دی گئی عورتیں تین حیض انتظار کریں اور اس مدت کے اندر ان کے خاوند ان کو لوٹانے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ دوسری آیت میں ہے :

﴿ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلاَ تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (البقرہ : ۲۳۲)

"کہ جب تم نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی' پھر وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو انہیں اپنے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو"

باقی شریعت میں صحیح طلاق کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی منکوحہ' مدخولہ کو ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس نے مجامعت نہ کی ہو یا حمل کی حالت میں اور ایک مرتبہ طلاق کا لفظ منہ سے نکالے۔ یہ طلاق سنی کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی صورتیں ہیں وہ طلاق بدعی میں داخل ہیں اور اگر غیر مدخول بہا ہے (یعنی ابھی تک بیوی کا حق زوجیت ادا نہیں کیا) تو جب چاہے حیض میں طہر میں طلاق دے سکتا ہے کیونکہ اس کی عدت نہیں ہے۔ از : (ع۔ع) مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۵ء)

الگ الگ تین طلاقوں کے بعد؟

س کیا فرماتے ہیں علماءِ دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص زید اور اس کی بیوی کے درمیان ساڑھے پانچ سال سے تنازعہ چل رہا تھا جس کی بنا پر زید نے عرصہ چار سال ہوئے اپنی بیوی کو ایک طلاق زبانی دی۔ پھر لوگوں نے صلح کرا دی اور شوہر نے بیوی سے رجوع کر لیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد زید نے دوسری مرتبہ ایک طلاق زبانی دے دی لیکن اہل محلّہ کی مداخلت پر پھر صلح ہو گئی اور زید نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا۔ اب مورخہ ۵/۵/۹۶ کو پھر تین طلاق یکدم تحریر کر کے بذریعہ رجسٹری ڈاک زید نے اپنی بیوی کو ارسال کر دی ہیں۔ بیوی اپنے ذاتی مکان میں رہتی ہے۔ شوہر بھی اسکے ہمراہ رہتا ہے۔ اب ایسی صورت میں کیا بیوی کو

تین طلاقیں واقع ہو گئیں یا پھر کوئی صلح کی گنجائش باقی ہے؟ اور اس صورت میں شوہر بیوی کے ہمراہ رہ سکتا ہے یا نہیں؟ جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

(رفیع حیدر زیدی مکان نمبر ۳۔ اے 'گلی حبیب اللہ نمبر ۴۴ اسلام پورہ لاہور)

ج زمانۂ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ خاوند جتنی چاہتا اپنی بیوی کو طلاقیں دے دیتا اور عدت کے اندر رجوع کر لیتا۔ اس سے مقصود عورتوں کو تنگ کرنا ہوتا تھا۔ عورتوں کی جان غضب میں تھی کہ خاوند نے طلاق دی اور عدت گزرنے کے قریب آئی تو رجوع کر لیا پھر طلاق دے دی پھر عدت کے اندر رجوع کر لیا۔ اسی طرح ساری زندگی بیوی کو ظلم و ستم کی چکی میں پیستے رہنا ان کی عادت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ کار کو ختم کر کے طلاق کی تعداد کی حد بندی کر دی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں :

((وَ کَانَ النَّاسُ وَالرَّجُلُ یُطَلِّقُ امْرَاَتَهٗ مَا شَاءَ اَنْ یُّطَلِّقَهَا وَهِیَ امْرَاَتُهٗ اِذَا ارْتَجَعَ وَهِیَ فِی الْعِدَّةِ وَاِنْ طَلَّقَهَا مِائَةَ مَرَّةٍ اَوْ اَکْثَرَ حَتّٰی قَالَ رَجُلٌ لِامْرَاَتِهٖ وَاللّٰهِ لَا اُطَلِّقُكِ فَتَبِیْنِی مِنِّی وَلَا آوِیْكِ اَبَدًا قَالَتْ وَ کَیْفَ ذٰلِكَ قَالَ اُطَلِّقُكِ فَکُلَّمَا هَمَّتْ عِدَّتُكِ اَنْ تَنْقَضِیَ رَاجَعْتُكِ فَذَهَبَتِ الْمَرْاَةُ حَتّٰی دَخَلَتْ عَلٰی عَائِشَةَ فَاَخْبَرَتْهَا فَسَکَتَتْ عَائِشَةُ حَتّٰی جَاءَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَتْهُ فَسَکَتَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی نَزَلَ الْقُرْآنُ ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ قَالَتْ عَائِشَةُ فَاسْتَاْنَفَ النَّاسُ الطَّلَاقَ مُسْتَقْبِلًا مَّنْ کَانَ طَلَّقَ وَمَنْ لَّمْ یَکُنْ طَلَّقَ))

''کہ مرد اپنی منکوحہ کو جتنی چاہتا طلاقیں دے دیتا اور دوران عدت وہ جب بھی اس سے رجوع کر لیتا' وہ اس کی بیوی ہی رہتی خواہ اسے سو یا اس سے زائد طلاقیں دے دیتا یہاں تک کہ ایک شوہر نے اپنی بیوی سے کہا اللہ کی قسم نہ میں تمہیں ایسی طلاق دوں گا کہ تو مجھ سے جدا ہو جائے اور نہ ہی تجھ کو اپنے پاس

رکھوں گا۔ اس نے کہا وہ کیسے؟ خاوند نے کہا جب تیری عدت ختم ہونے لگے گی، میں تجھ سے رجوع کر لوں گا۔ وہ عورت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی اور ان کو اس واقعہ کی خبر دی۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ یہاں تک کہ نبی مکرم ﷺ تشریف لائے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بات کی اطلاع انہیں دی تو آپ ﷺ بھی خاموش رہے یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا : "طلاق دو مرتبہ ہے (وقفہ بعد وقفہ) معروف طریقے پر رجوع کرنا ہو گا یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہو گا۔"

(ترمذی ۱/۲۲۴، مستدرک حاکم ۲/۲۷۹)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ لوگوں نے مستقبل میں اس طریقہ طلاق کو جاری کر دیا جس نے پہلے طلاق دی تھی یا نہیں دی تھی۔ ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ کے شانِ نزول سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت کے طریقہ طلاق جس میں مرد کئی بار طلاق دیتا اور رجوع کرتا تھا کو محدود کر کے دو مرتبہ طلاق تک رجوع کا حکم رکھا۔ یعنی مرد اپنی بیوی کو وقفہ بعد وقفہ دو طلاقیں دے سکتا ہے اور ان کے دوران مرد کو اپنی بیوی سے تعلقات بحال رکھنے کی اجازت ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ دورانِ عدت رجوع کر لے یا عدت کے گزرنے کے بعد دوبارہ نکاح کر لے اور اگر دوبارہ طلاق دے کر پھر دوبارہ تعلقات بحال کر لینے کے بعد تیسری مرتبہ طلاق دے تو یہ عورت اس مرد پر قطعی طور پر حرام ہو جائے گی۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ﴾ (البقرہ)

"اگر اس نے (تیسری) طلاق دے دی تو وہ اس کے لیے اتنی دیر تک حلال نہیں جب تک وہ کسی دوسرے آدمی سے نکاح نہ کر لے"

یعنی وہ عورت نکاح کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی دوسرے مرد سے نکاح کر لے اور وہ مرد فوت ہو جائے یا اپنی مرضی سے طلاق دے دی تو یہ عورت اور پہلا خاوند اگر دونوں رضامند ہو جائیں اور یقین ہو کہ وہ حدود اللہ کو قائم رکھ سکیں گے تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" وَالْمَقْصُوْدُ مِنَ الزَّوْجِ الثَّانِي اَنْ يَكُوْنَ رَاغِبًا فِي الْمَرْاَةِ قَاصِدًا لِدَوَامِ عِشْرَتِهَا كَمَا هُوَ الْمَشْرُوْعُ مِنَ التَّزْوِيْجِ۔"

"یعنی دوسرا خاوند عورت میں رغبت رکھنے والا اور اس کے ساتھ ہمیشہ زندگی گزارنے کا ارادہ رکھنے والا ہو جیسا کہ مقاصد نکاح میں یہ افعال جائز رکھے گئے ہیں" (تفسیر ابن کثیر ۱/۲۹۹)

آگے فرماتے ہیں:

فَاِذَا كَانَ الثَّانِي اِنَّمَا قَصْدُهُ اَنْ يُحِلَّهَا لِلْاَوَّلِ فَاِذَا هُوَ الْمُحَلِّلُ الَّذِيْ وَرَدَتِ الْاَحَادِيْثُ بِذَمِّهِ وَلَعْنِهِ

"اگر دوسرے خاوند نے اس عورت کو پہلے خاوند کے لیے حلال کرنے کی غرض سے نکاح کیا تو یہ شخص محلل (حلالہ کرنے والا) ہے جس کی مذمت اور لعنت کے بارے میں احادیث وارد ہوئی ہیں" (ابن کثیر ۱/۲۹۹)

اور دوسرے خاوند کے ساتھ جب زندگی گزارنے کی غرض سے نکاح کیا تو اس میں یہ شرط ہے کہ اس خاوند نے طلاق دینے سے قبل اس عورت کے ساتھ جماع کیا ہو وگرنہ یہ عورت پہلے خاوند کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ رفاعہ قرظی نے جب اپنی بیوی تمیمہ بنت وہب کو آخری (تیسری) طلاق بھیجی تو اس کا نکاح عبدالرحمٰن بن زبیر سے ہو گیا۔ وہ عورت رسولِ مکرم ﷺ کے پاس شکایت لے کر آئی کہ عبدالرحمٰن اس کے مطلب کا آدمی نہیں۔ میں تو اپنے پہلے خاوند کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ تم سے اور تم اس سے بذریعہ مجامعت لطف اندوز نہ ہو جاؤ۔ یہ حدیث مسند احمد اور ابنِ ماجہ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ تین طلاقیں وقفہ بعد وقفہ ہو جانے کے بعد عورت پہلے خاوند پر قطعی حرام ہو جاتی ہے۔ اب ان دونوں کے دوبارہ تعلقات بحال ہونے کی ایک ہی شکل ہے کہ اس عورت کا نکاح کسی

دوسرے آدمی سے مقاصد نکاح یعنی عفت و پاکدامنی' خانہ آبادی وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جائے اور وہ مرد اس کے حقوق زوجیت ادا کرے۔ پھر کبھی ان میں ناچاقی ہو جائے جس کی بنا پر وہ طلاق دے دے یا فوت ہو جائے اور عدت کے اختتام کے بعد اگر یہ عورت اور پہلا خاوند آپس میں رضامند ہو جائیں اور یقین ہو کہ اب وہ مل کر حدود اللہ کو قائم رکھ سکیں گے تو دوبارہ آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اور اگر دوسرے خاوند کے ساتھ پہلے کے لیے حلال ہونے کی غرض سے نکاح کیا تو یہ فعل حرام ہو گا اور لعنت کے مستحق ٹھہریں گے اور عورت پہلے خاوند کی طرف دوبارہ واپس نہیں لوٹ سکتی۔

صورت مسئولہ میں زید اپنی بیوی کو وقفہ بعد وقفہ تین طلاقیں پوری دے چکا ہے جو کہ تینوں لاگو ہو چکی ہیں۔ اب اس کے بعد زید کو اس عورت کے ساتھ رہنے کا شرعاً کوئی حق نہیں رہا۔ یاد رہے کہ مرد اپنی عورت کو اکٹھی تین طلاقیں ایک مجلس میں اگر دے تو از روئے شریعت ایک ہی سمجھی جائے گی جس میں رجوع ممکن ہے۔ صورت مسئولہ میں زید چونکہ پہلے دو طلاقیں الگ الگ دے چکا ہے' اب وہ آخری طلاق ایک مجلس میں چاہے ایک مرتبہ چاہے اکٹھی تین یا تین سے زائد مرتبہ دے' وہ ایک ہی ہو گی۔ لیکن پہلی دو طلاقوں کے ساتھ یہ طلاق شامل ہونے کی وجہ سے اب تینوں طلاقیں پوری ہو گئیں۔ اب عورت مرد پر یقینی طور پر حرام ہے اور مرد اب اس عورت سے کسی صورت رجوع نہیں کر سکتا۔ سوائے اس صورت کے کہ جو اوپر بیان کی گئی ہے کہ وہ عورت نئے خاوند کے ساتھ نکاح کرے۔ یہ نکاح عارضی طور پر پہلے خاوند کے لیے حلال ہونے کی غرض سے نہ کیا جائے کیونکہ یہ حلالہ ہے اور حلالہ پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت فرمائی ہے البتہ نیا خاوند اگر اتفاقاً اسے طلاق دے دے یا وہ فوت ہو جائے تو تب وہ عورت پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' جولائی / ۱۹۹۶ء)

سابقہ دی ہوئی طلاقیں رجوع کے بعد مستقبل میں شمار ہونگی؟

س ایک آدمی اپنی بیوی کو دو طلاقیں بیک وقت دیتا ہے اور دوسری طلاق کے بعد رجوع کرتا ہے کیا یہ طلاق رجوع کے بعد آئندہ زندگی میں شمار ہو گی یا نہیں؟ اس کے بعد وہ پھر طلاق دے دیتا ہے تو کیا یہ تیسری طلاق ہو گی یا پہلی؟ یعنی پہلی دو ختم ہو جائیں گی یا برقرار رہیں گی؟ اس تیسری طلاق کا کئی لوگوں کے سامنے اقرار کرنے کے بعد باپ کی لعن طعن سے وہ بیوی کو گھر لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تیسری طلاق نہیں دی۔ قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔ یہ بیوی اس کے لیے حلال ہے یا نہیں؟ (محمد رشید' گارڈن ٹاؤن فیصل آباد)

ج طلاق دینے کا شرعی طریقہ پہلے سوال میں گزر چکا ہے۔ بغیر رجوع کے ایک مجلس میں ایک سے زیادہ دی گئی طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی' کیونکہ جب اُس نے ایک مرتبہ طلاق کا کلمہ کہہ دیا عورت کو طلاق ہو گئی۔ عدت ختم ہونے پر وہ دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔ اب دوسری مرتبہ جب بغیر رجوع کے طلاق کا لفظ کہتا ہے تو یہ مطلقہ عورت کو طلاق دے رہا ہے اور یہ بالکل لغو بات ہے۔ مذکورہ صورت میں پہلے دو طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی اور رجوع کے بعد آئندہ زندگی کیلئے بھی رہیں گی۔ اب اگر رجوع کے بعد دوبارہ طلاق دیتا ہے تو یہ دوسری شمار ہو گی۔ عدت کے اندر اسکو رجوع کا حق ہے اور عدت کے بعد نیا نکاح بھی کر سکتا ہے۔ اب رجوع یا نکاح جدید کے بعد یہ شخص پھر سے طلاق دے گا تو یہ تیسری شمار ہو گی۔ جس کے بعد اس کیلئے رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۵ء)

زبردستی خلع

س میرے بھائیوں نے میرے خاوند سے اپنی ذاتی رنجش کی بنا پر مجھے اس سے الگ کرنے کے لیے خلع نامہ لکھ کر مجھ سے زبردستی دستخط کروا لیے اور ساتھ تین مرتبہ طلاق کا لفظ بھی لکھا۔ جسے پڑھ کر اُس نے مجھے طلاق دے دی۔ میں نے طلاق کے ایک ماہ بعد رابطہ کی کوشش کی لیکن نہ ہو سکا۔ اب تقریباً ۵ ماہ بعد ہم ملے

اکٹھے رہنا چاہا تو معلوم ہوا کہ طلاق ہو گئی ہے۔ اب میرے سسر ہمارے درمیان رکاوٹ بنے ہوئے ہیں جبکہ میرا خاوند بھی ان کی بات مانتا ہے۔ ہمیں قرآن و سنت کی روشنی میں اس کا حل بتائیں کہ جس سے ہمارے سابقہ رشتے جڑ جائیں ساتھ یہ بھی وضاحت کر دیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں باہر اکٹھے گھومتے پھرتے بھی ہیں کیا یہ ٹھیک ہے؟ (اس ش' شاہ فیصل کالونی کراچی)

ج صورتِ مسئولہ میں عورت کو طلاق رجعی ہوئی ہے جس میں خاوند کو عدت گزرنے سے پہلے رجوع کرنے کا حق تھا لیکن رجوع نہ کر سکا۔ اب خاوند کو نیا نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ اور وہ نیا نکاح کر کے اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے گھر بسا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ وَّلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا ﴾

(البقرہ : ۲۲۸)

"اور مطلقہ عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں اور اللہ نے جو کچھ ان کے پیٹوں میں پیدا کر رکھا ہے۔ اس کو نہ چھپاویں اگر وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں اور ان کے خاوندوں کو اس مدت کے اندر لوٹانے کا حق ہے"۔

دوسری آیت کریمہ میں ہے:

﴿ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (البقرہ : ۲۳۲)

"کہ جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو پس وہ اپنی عدت پوری کر چکی ہیں تو

انہیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکا کرو جب وہ دستور کے مطابق آپس میں راضی ہو جائیں۔ اس معاملہ کی تم میں سے اس کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ حکم تمہارے لیے بڑا ستھرا اور بڑا ہی پاکیزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

اس آیت کریمہ میں عورتوں کے ولیوں کو خطاب ہے کہ ان کا اپنی عورتوں کو دوبارہ اپنے خاوندوں کے نکاح میں جانے سے نہ روکنا بہت ہی زیادہ مفید ہے۔ اگرچہ یہ خطاب عورتوں کے اولیاء کو ہے مگر اللہ تعالیٰ کا اس مسئلہ میں اندازِ بیان اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ میاں بیوی اگر شرعی حدود کے اندر اکٹھا رہنے کے لیے دوبارہ اس سابقہ تعلق کو دوبارہ استوار کرنا چاہیں تو کوئی حرج نہیں۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن کو طلاق ہو گئی۔ عدت گزرنے کے بعد دوبارہ نکاح کے پیغامات آنا شروع ہوئے تو پہلے خاوند نے پھر نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ لیکن معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کا دوبارہ اسی شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے انکار کر دیا اور قسم اٹھائی کہ اس سے نکاح نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیت نازل فرما دی۔ انہوں نے جب یہ آیت سنی تو دوبارہ اسی کے ساتھ نکاح پر آمادہ ہو گئے اور اپنی قسم کا کفارہ دیا۔ یہ ہے اطاعت کا جذبہ اور مومن ہونے کی علامت جسے اس صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنایا۔ قطعاً اپنی آنا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ اس لیے طرفین کو چاہیے کہ اگر خاوند بیوی دوبارہ نکاح پر متفق ہو گئے ہیں تو اپنی آنا کا مسئلہ بنانے اور دوبارہ اکٹھا ہونے میں رکاوٹ ڈالنے کی بجائے ان سے تعاون کیا جائے۔

باقی عورت کا طلاق اور عدت کے بھی گزر جانے کے بعد نیا نکاح کرنے سے پہلے اپنے خاوند (مرد) کے ساتھ گھومنا پھرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے اگرچہ وہ میاں بیوی تھے' اب ان کا وہ تعلق ختم ہے اور نیا نکاح ہونے تک دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ خلوت اختیار کرنا حرام ہے۔ حدیث میں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی مرد کسی اجنبی عورت سے علیحدگی میں نہ ملے کیونکہ ان کے ساتھ اس

وقت تیسرا شیطان ہوتا ہے۔" واللہ تعالیٰ اعلم۔

(ع - ع) (مجلۃ الدعوۃ' اکتوبر/ ۱۹۹۵ء)

خلع اور مبارات طلاق ہے کہ فسخ نکاح؟

س خلع اور مبارات طلاق ہے کہ فسخ نکاح؟

ج فقہائے اسلام کے ہاں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے' بعض اسے فسخ شمار کرتے ہیں اور بعض طلاق اور بعض کہتے ہیں اگر طلاق کے لفظ سے ہو تو طلاق ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی اور لفظ سے ہو گا تو فسخ ہے لیکن صحیح شرعی دلائل جس بات کے موید ہیں وہ یہی ہے کہ خلع فسخ ہے طلاق نہیں کیونکہ :

۱) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے سوال کیا کہ کسی نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دے دیں پھر اُس نے خلع کروا لیا۔ کیا وہ اس سے نکاح کر سکتا ہے؟ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ہاں نکاح ہو سکتا ہے کیونکہ خلع طلاق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ (البقرہ) کو آیت کے شروع میں خلع کو درمیان میں کہ ﴿ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْ مَا افْتَدَتْ بِهٖ ﴾ اور تیسری طلاق کو بعد میں ذکر کیا اگر اس خلع کو بھی طلاق شمار کیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ﴿ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ ﴾ چوتھی طلاق بن جائے گی۔

۲) خلع والی عورت کی عدت ایک حیض ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کی بیوی کو ایک حیض مدت گزارنے کا حکم دیا تھا۔ حدیث میں ہے :

((اِنَّ امْرَاَةَ ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ اخْتَلَعَتْ مِنْهُ فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِدَّتَهَا حَيْضَةً))

"ثابت بن قیس کی بیوی نے خلع کروایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ایک حیض مقرر کی" (سنن ابوداؤد کتاب الطلاق باب الخلع حدیث ۲۲۲۹)

امام خطابی فرماتے ہیں :

((فِيْ هٰذَا اَقْوٰى دَلِيْلٌ لِمَنْ قَالَ اِنَّ الْخُلْعَ فَسْخٌ وَّلَيْسَ بِطَلَاقٍ))

"یہ قوی دلیل ہے کہ بے شک خلع فسخ ہے طلاق نہیں۔"
(معالم السنن مع سنن ابی داؤد)

امام محمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی فرماتے ہیں :

((إذ لو كان طلاقًا لم يكتف بحيضة للعدة))

"اگر خلع طلاق ہوتی تو ایک حیض عدت پر اکتفا نہ ہوتا بلکہ اسے تین حیض عدت گزارنا پڑتی"۔ (سبل السلام)

۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ صحیح شرعی اور سنی طلاق وہ ہوتی ہے جو ایسے طہر میں دی جائے جس طہر میں عورت سے جماع نہ کیا گیا ہو خلع کا مطالبہ کرنے والی ثابت بن قیس کی بیوی جب نبی کریم ﷺ کے پاس آئی تو نبی کریم ﷺ نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ حائضہ ہے یا طہر کی حالت میں۔ نبی کریم ﷺ کا اسے یہ چیز نہ پوچھنا واضح دلیل ہے کہ خلع حیض اور جس طہر میں جماع ہوا دونوں میں واقع ہو سکتا ہے جبکہ طلاق صرف خاص طہر میں واقع ہوتی ہے تو ثابت ہوا کہ خلع طلاق نہیں۔

از : (ع - ع)

﴿۱۳﴾
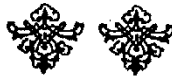
كتاب
الْبُيُوعِ

جی پی فنڈ کا مسئلہ

س: ایک آدمی گورنمنٹ کی ملازمت کرتا ہے اس کو گورنمنٹ جو تنخواہ دیتی ہے اس میں سے کچھ حصہ کٹوتی کرتی ہے جس کو جی پی فنڈ کہتے ہیں۔ یہ فنڈ ریٹائر ہونے پر ملتا ہے اس کی مقدار تقریباً دو تین لاکھ روپے ہوتی ہے جبکہ کٹوتی سو روپے سے لے کر تین چار سو تک ہوتی ہے لیکن فنڈ جو ملتا ہے اس حساب سے زیادہ ہوتا ہے کیا یہ فنڈ جس کو جی پی فنڈ کہتے ہیں لینا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ (محمد عباس' مرکز صالحوال اوکاڑہ)

ج: سرکاری ملازمین کی تنخواہ سے حکومت جو ہر ماہ مخصوص حصہ کاٹتی ہے اسے جی پی فنڈ کہتے ہیں پھر بینک کاری کے طریقہ کے مطابق اس فنڈ پر سالانہ منافع یا سود جمع ہوتا رہتا ہے۔ یہ رقم سرکاری ملازم کو ریٹائرمنٹ کے موقع پر اصل رقم مع سود دی جاتی ہے تو اس میں قابل غور چند باتیں ہیں :

۱) تنخواہ سے کاٹی گئی رقم سے زائد رقم وصول کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

۲) اگر ناجائز ہے تو اس کو وصول کرے یا نہ کرے؟

۳) اگر وصولی نہیں کرنی تو کیا متعلقہ محکمہ کے افسران وہ رقم کھا جائیں گے؟

۴) اگر وصول کر چکا ہے تو کہاں خرچ کرے؟

قرآن و سنت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل رقم سے زائد رقم وصول کرنا سود ہے اور اللہ تعالیٰ نے سود کھانے سے منع فرمایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴾

(البقرہ : ۲۷۸'۲۷۹)

"اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود سے باقی رہ گیا ہے، چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو بس اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے تمہارا اصل مال ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اصل رقم لینے کا حکم دیا اور زائد رقم کی وصولی سے منع فرما دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ سودی رقم کا حاصل کرنا ایمان کے منافی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ سود کھانے والے اور کھلانے والے اور لکھنے والے اور گواہی دینے والے کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

((عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أٰكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهٗ وَكَاتِبَهٗ وَشَاهِدَيْهِ وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ))

"سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی سود کھانے والے کھلانے والے اور اس کے لکھنے اور گواہی دینے والے پر اور فرمایا کہ یہ سب برابر کے لعنتی ہیں" (مسلم)

((عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ حَنْظَلَةَ غَسِيْلِ الْمَلاَئِكَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِرْهَمُ الرِّبٰوا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَّثَلاَثِيْنَ زَنْيَةً))

"عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک درہم سود اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر کھائے تو وہ چھتیس دفعہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔" (مجمع الزوائد ۴/۱۱۷، دار قطنی ۳/۱۶، مسند احمد بیہقی فی شعب الایمان)

((عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرِّبٰوا سَبْعُوْنَ جُزْءً أَيْسَرُهَا أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهٗ))

"سیدنا ابو ہریرہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سود کے ستر (۷۰) حصے ہیں سب

سے چھوٹا حصہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے نکاح کرے"

(صحیح ابن ماجہ ۲/۲۷ التعلیق الرغیب ۳/۸۰۔۵۱)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سود مطلقاً حرام ہے۔ سود لینے والا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اعلان جنگ کرتا ہے۔ یہ ایمان کے منافی جہنمی اور ملعون بننے کا سبب ہے۔ اس کا ایک ایک درہم چھتیس چھتیس زنا کے برابر ہے اور سب سے کم گناہ ماں کے ساتھ نکاح کرنا ہے۔ ایک آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے :

﴿ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾

(البقرہ : ۲۷۵)

"جو پھر سود لے تو یہ لوگ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں"

جی پی فنڈ جو ایک ملازم آدمی وصول کرتا ہے اس میں قابل غور بات یہ بھی ہے کہ ملازم کو جو سودی رقم ملتی ہے اس کا مالک کون ہے۔ کیونکہ ملازم کی تنخواہ سے جو رقم کاٹی جاتی ہے وہ اُسی کا ہی مالک ہے' اس سے زائد کا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : ﴿ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ﴾ تم صرف اصل مال کے مالک ہو۔ لہٰذا جب ملازم سودی رقم کا مالک ہی نہیں تو اس کو حاصل کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس زائد رقم کو چھوڑ دینے کا حکم دے رہا ہے ﴿ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴾ جو سود باقی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔

جو ملازم اس سود سے بچنا چاہتا ہے تو اس کے لیے طریقہ موجود ہے۔ حکومت جب کسی ملازم کے پراویڈنٹ فنڈ کی کٹوتی کرتی ہے تو اس ملازم سے ایک فارم پر کرایا جاتا ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ درخواست دہندہ جمع شدہ رقم چاہتا ہے یا نہیں۔ گورنمنٹ اکاؤنٹ سے جو فارم ملتا ہے' اس سے خانہ نمبر ۱۴ میں یہ عبارت درج ہے :

" Whether The Applicant Dasires Interst On His Accumulation Or Not."

"کیا ملازم اپنی جمع شدہ رقم پر سود کا خواہش مند ہے یا نہیں؟" اگر ملازم لکھ دے کہ میں سود نہیں لیتا تو اس کی جمع شدہ رقم پر سود نہیں لگایا جاتا اور ایسے افراد

موجود ہیں جنہوں نے درخواست دے کر اپنی جمع شدہ رقم پر سودی اضافہ ختم کرا دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ جی پی فنڈ کی صورت میں جمع شدہ رقم پر جو سود لگایا جاتا ہے اگر محکمہ کے افسران زائد رقم کھاتے ہیں تو اس کا گناہ ان کے ذمہ ہے۔ بعض علماء کا یہ موقف ہے کہ زائد رقم وصول کر کے وہاں صرف کر دینی چاہئے جہاں گورنمنٹ کسی پر زیادتی کرتی ہے۔ رشوت کے بغیر چھوڑتی نہیں وغیرہ۔ خود استعمال نہ کرے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ایسی رقم کی وصولی سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ فَلَكُمْ رُؤُسُ اَمْوَالِكُمْ ﴾ کہہ کر اصل مال لینے کا حکم دیا ہے اور ﴿ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا ﴾ کہہ کر باقی سود چھوڑنے کا حکم فرمایا ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' فروری / ۱۹۹۳ء)

جی پی فنڈ کی شرعی حیثیت

س ایک آدمی گورنمنٹ کا ملازم ہے اس کی تنخواہ سے گورنمنٹ ہر ماہ کٹوتی کرتی ہے جسے جی پی فنڈ کہتے ہیں۔ پھر ریٹائرمنٹ پر اصل رقم جو اس کی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے اس سے کافی زائد رقم ملازم کو دی جاتی ہے کیا یہ رقم لینا جائز ہے؟

(محمد احمد۔ مسئول طلباء چونیاں)

ج سرکاری ملازمین کی ہر ماہ تنخواہ سے جو رقم کاٹ لی جاتی ہے اور پھر اس کی ریٹائرمنٹ (Retirement) پر بمع اضافہ اس کو رقم دی جاتی ہے اسے جی پی فنڈ کہا جاتا ہے۔ قرآن وسنت کی رو سے زائد وصول شدہ رقم سود ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴾

(البقرہ : ۲۷۸'۲۷۹)

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ اور جو کچھ سود سے باقی رہ گیا ہے' چھوڑ دو

اگر تم ایماندار ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو بس اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ اگر تم نے توبہ کرلی تو تمہارے لیے تمہارا اصل مال ہے' نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے"۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اصل مال لینے کا حکم فرمایا ہے اور زائد رقم کی وصولی سے روک دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ سودی رقم لینا ایمان کے منافی ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے مترادف ہے۔ اس طرح احادیث میں سود لینے والوں پر لعنت مذکور ہوئی ہے۔ لہٰذا ملازم آدمی صرف اپنی اصل رقم جو اس کی کاٹی جاتی ہے وہی وصول کر سکتا ہے۔ زائد رقم اگر لیتا ہے تو وہ اس کا مالک نہیں۔ وہ یقیناً سود کھا کر لعنت کا مستحق بنتا ہے اور یہ بات حکومتی طبقہ جانتا ہے کہ جی پی فنڈ میں جو زائد رقم دی جاتی ہے وہ سود ہے جیسا کہ گورنمنٹ اکاؤنٹ میں جو فارم ملتا ہے اس کے خانہ نمبر ۱۴ میں یہ بات درج ہے کہ "کیا ملازم اپنی جمع شدہ رقم پر سود کا خواہش مند ہے یا نہیں؟" اگر ملازم لکھ دے کہ میں سود وصول نہیں کروں گا تو اس کی جمع شدہ رقم کو سود کی آلائش و آمیزش سے صاف رکھا جاتا ہے اِس لیے تمام ملازمین کو اس رقم کی وصولی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

(مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۶ء)

بیمہ زندگی کی شرعی حیثیت

قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں کہ انشورنش (بیمہ زندگی) وغیرہ کا اسلام میں کیا حکم ہے؟ اسٹیٹ لائف انشورنش کارپوریشن کے نمائندے گھر گھر پھرتے ہیں۔ دلائل دیتے ہیں اور بہت سے علماء کے فتاویٰ بھی ان کے پاس موجود ہیں۔ ان کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ مستقبل کے لیے ایک احتیاطی تدبیر ہے' جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی مرتے وقت اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ جائے' وہ بہتر ہے اس سے جو ان کو محتاج اور فقیر چھوڑ کر جائے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسٹیٹ لائف کا کاروبار بالکل سود سے پاک ہے اور اس کا شراکت دار

اس کے نفع اور نقصان میں شریک ہوتا ہے۔ (محمد عمران نگری بالا ایبٹ آباد' اصغر محمود راولپنڈی' محمد یوسف عدیل پنڈ گجرال' محمد صدیق یوسف چک نمبر ۱۰۳ رحیم یار خان)

ج بیمہ مطلقاً ناجائز اور حرام ہے خواہ زندگی کا ہو یا مکان اور گاڑیوں وغیرہ کا کیونکہ جوئے اور سود کا مرکب ہے۔

۱) یہ اپنی اصل وضع میں جوئے اور سود کا مرکب ہے اور اسلام میں سود اور جوا دونوں حرام ہیں۔ اگر مدت مقررہ سے پہلے بیمہ دار کی موت یا املاک کا نقصان ہو جائے تو کمپنی کو نقصان ہوتا ہے اگر وہ پوری قسطیں جمع کرا دے تو کمپنی کو فائدہ ہوتا ہے اور یہ کسی کو معلوم نہیں کہ قسطیں پوری ادا ہو سکیں گی یا نہیں؟ اور سود اس لیے ہے کہ بیمہ دار اگر پوری قسطیں جمع کِروائے تو اس کو اس رقم کے ساتھ سود دیا جاتا ہے۔

۲) بیمہ سے وراثت کا شرعی نظام ختم ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ بیمہ کی رقم بیمہ دار کے مرنے کے بعد اس کے نامزد کردہ شخص کو دی جاتی ہے' جبکہ ہر شرعی وارث ترکہ کا مستحق ہوتا ہے' جو چیز قرآن و سنت کے نظام کو درہم برہم کرنے والی ہو' وہ کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

۳) عقیدۂ تقدیر پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جائز اور شرعی اسباب بروئے کار لانے کے بعد مستقبل میں پیش آنے والے حوادث اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیئے جائیں اور بیمہ اس سے فرار ہے' کیونکہ وہ پہلے سے حوادث کی پیش بندیاں ناجائز طریقوں سے کر رہے ہوتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ بھی تو دنیا میں رہ چکے ہیں۔ انہوں نے بھی آل اولاد چھوڑی تھی۔ جب انہوں نے ایسے ناجائز تحفظات کا انتظام نہیں کیا تو آج کے مسلمانوں کو کیوں اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے؟

باقی جس حدیث کا آپ نے سوال میں حوالہ دیا ہے وہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیحین میں موجود ہے۔ اس فرمان رسول کو غور سے پڑھ لیں تو بات بالکل

واضح ہو جائے گی کہ اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمان مستقبل کی احتیاطی تدبیر کے متعلق نہیں' بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جائز موجود جائیداد کو بلاوجہ خرچ کر ڈالنا مناسب نہیں بعد میں وہ وارثوں کے کام آئے گی۔ باقی اسٹیٹ لائف والوں کا یہ کہنا کہ ہمارا شراکت دار نفع و نقصان میں شریک ہوتا ہے۔ یہ جھوٹ و دروغ گوئی اور سادہ لوح انسانوں کو اپنے شکنجے میں پھنسانے کا ایک حیلہ ہے۔ کیونکہ بیمہ کمپنی اگرچہ اس رقم سے تجارت بھی کرتی ہو لیکن اس کے منافع میں سے ایک معین اور طے شدہ حصہ بیمہ دار کے کھاتے میں جمع کرتی ہے اور یہ بلاشبہ سود ہے۔ کیونکہ اصل رقم کے علاوہ معین اور طے شدہ منافع کے ادا کرنے کا ہی نام سود ہے۔ اگر یہ نفع اور نقصان کی بنیاد پر ہی قائم ہو تو پھر بھی بیمہ کرانے والوں کو ایک طے شدہ معینہ رقم نہیں ملنی چاہئے بلکہ کمی بیشی کے ساتھ نفع اور نقصان دونوں میں شریک رہنا چاہئے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے بلکہ بیمہ کمپنیاں عام طور پر اصل رقم سے زائد جو کچھ دیتی ہیں۔ اس کی شرح اور مقدار پہلے ہی سے متعین کر دیتی ہیں۔ اگر کوئی کمپنی اس کو معین نہ بھی کرتی ہو بلکہ زائد رقم کو سالانہ نفع اور نقصان کا لحاظ کر کے فیصد پر رکھتی ہو' تب بھی یہ طریقہ بیمہ کے جائز ہونے کی وجہ نہیں بن سکتا کیونکہ اس کاروبار میں نقصان کا سوال ہی نہیں آنے دیا جاتا۔ پھر یہ بات بالکل واضح ہے کہ بیمہ کمپنیاں تمام حاصل شدہ سرمایہ سود پر آگے دے دیتی ہیں اور سودی معاملہ میں واقع نقصان کی ذمہ داری قبول نہیں کی جاتی۔ پھر ان کمپنیوں کے متفقہ اصولوں میں سے بعض ایسے اصول بھی ہیں جن کی وجہ سے یہ سارا کاروبار اور ڈھانچہ ہی شرعاً ناجائز بن جاتا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ نظام یہودیوں کا ایجاد کردہ ہے جن کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ تاکہ مسلمانوں کو اسلام نے جو سرمایہ کے محفوظ رکھنے اور مال میں اضافہ کرنے' حوادث کی صورت میں مالی معاونت اور پسماندگان کی مالی امداد کے بارے میں جو ربانی ہدایات دی ہیں ان سب چیزوں سے محروم کر کے اسلام سے دور کر دیا جائے۔

ایسے تعلیم یافتہ اور نام نہاد علماء جنھوں نے یہودیوں کے غزو فکری سے شکست خوردہ ہو کر یورپ کے موجودہ اقتصادی نظام کی چند خوبیاں اور خوشنما پہلوؤں کو دیکھ کر بیمہ کی حلت اور جواز کا فتویٰ دیا ہے جو سراسر جوا اور سود ہے' ایسے لوگوں کا کردار انتہائی قابل مذمت ہے اور بعض تو اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ یورپ کی ذہنی غلامی نے ان کے دماغوں پر یہ عقیدہ مسلط کر دیا ہے کہ سود کے بغیر معاشی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ ایسے علماء کو ایسا فتویٰ دینے سے پہلے اس آیت کریمہ کو اچھی طرح پڑھ لینا چاہئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴾ (النحل : ۱۱۶)

"اور اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھو۔ یقیناً اللہ پر جھوٹ باندھنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے"۔ واللہ تعالیٰ اعلم از : (ع۔ع) (مجلۃ الدعوۃ' جولائی / ۱۹۹۵ء)

انعامی بانڈز اور انکے نمبروں کی فوٹو کاپیوں کا کاروبار

❁ س ❁ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی طرف سے پرائز بانڈ جاری کئے جاتے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟ علاوہ ازیں موجودہ دور میں ان بانڈز کے صرف نمبرز کی فوٹو کاپیاں بازار سے ملتی ہیں۔ ان پر بھی انعامات نکلتے ہیں اور انعام نہ نکلنے کی صورت میں خریدنے والے کے پیسے ضائع ہو جاتے ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں واضح کریں کہ بانڈز بیچنے اور بانڈز خریدنے والے شخص کے متعلق کیا حکم ہے؟ قرعہ اندازی کے نتیجہ میں ملنے والے پیسوں سے تیار ہونے والے کھانے اور برپا ہونے والی تقاریب کا کیا حکم ہے؟ (ابو مسعود محمد امیر مجاہد' ہیڈ ماسٹر ایس پی موضع جنڈ پاک پتن)

❁ ج ❁ انعامی بانڈز جو حکومت کی طرف سے جاری کئے جاتے ہیں سود ہی کی

ایک صورت ہے جس کے ساتھ جوئے کی آمیزش کی گئی ہے۔ حکومت انعامی بانڈز فروخت کر کے بہت سے لوگوں سے رقم جمع کرتی ہے اور ان کو گارنٹی دیتی ہے کہ آپ کی اصل رقم محفوظ ہے۔ اگر آپ کا نمبر نکل آیا تو انعام دیا جائے گا یہ انعام اس ساری جمع شدہ رقم کا سود ہے جو حرام ہے اور اگر جائز بھی ہو تو ان تمام لوگوں کا حق ہے جنہوں نے رقم جمع کروائی ہے مگر وہ ان سب کا حق صرف اتفاق سے نکل آنے والے نمبروں کو دیتے ہیں جس کی بنیاد کسی استحقاق یا قاعدے پر نہیں' صرف بخت و اتفاق ہے اور اسی کا نام جوا ہے۔ اس لیے انعامی بانڈز خریدنا حرام ہے۔ بانڈز کی دوسری صورت جس میں انعام نہ نکلنے کی صورت میں خریدنے والے کے پیسے ضائع ہو جاتے ہیں۔ صاف جوا اور حرام ہے جس طرح قسمت کی پڑیا' لاٹری کی تمام صورتیں' اخبارات کے پزل (معمے) مختلف قسم کے ریفل ٹکٹ' سب جوئے کی صورتیں ہیں اور حرام ہیں۔ ایسے انعامات سے تیار ہونے والے کھانے اور برپا کی جانے والی تقریبات حرام ہیں اور اس میں شرکت بالکل ناجائز ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' اگست/ ۱۹۹۵ء)

شیو کی کمائی کا حکم

س کیا شیو کی کمائی حلال ہے؟ یعنی ڈاڑھی مونڈ کر جو شخص رقم وصول کرتا ہے' اس کی کمائی کا شرعاً کیا حکم ہے؟ (ابو اسد اللہ' سیالکوٹ)

ج اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی تخلیق بہترین سانچے میں کی ہے اور مرد و عورت میں جو امتیازات رکھے ہیں' ان میں سے ایک امتیاز اور فرق ڈاڑھی ہے۔ ڈاڑھی مرد کی زینت ہے اور یہ ایسی زینت ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کو مزین فرمایا ہے۔ اگر یہ بدصورتی اور قبح کا باعث ہوتی تو یہ کسی نبی اور رسول کو اللہ تعالیٰ عطا نہ کرتا۔ ڈاڑھی فطرتِ اسلام میں داخل ہے جیسا کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ

الشَّارِبِ وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ))

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دس خصلتیں فطرت سے ہیں۔ ان میں سے مونچھیں تراشنا اور ڈاڑھی بڑھانا ہے" (صحیح مسلم ۱/ ۲۲۳ کتاب الایمان)

اعفاء اللحیہ کا معنی یہ ہے کہ داڑھی کو اس کے حال پر چھوڑ دے اس میں کانٹ چھانٹ نہ کرے۔

امام نووی شرح مسلم ۱/ ۱۲۹ پر اَعْفُوْا اَوْفُوْا اَرْخُوْا اَرْجُوْا اور وَفِّرُوْا پانچ طرح کے الفاظ نقل کر کے فرماتے ہیں' ان سب کا معنی "تَرْكُهَا عَلٰى حَالِهَا" یعنی ڈاڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دینا ہے۔ قاضی امام شوکانی ایک مقام پر رقمطراز ہیں:

((إِنَّ هٰذِهِ الْأَشْيَاءَ إِذَا فُعِلَتْ اُتُّصِفَ فَاعِلُهَا بِالْفِطْرَةِ اللَّتِيْ فَطَرَهُ اللّٰهُ الْعِبَادَ عَلَيْهَا وَحَثَّهُمْ عَلَيْهَا وَاسْتَحَبَّهَا لَهُمْ لِيَكُوْنُوْا عَلٰى أَكْمَلِ الصِّفَاتِ وَأَشْرَفِهَا صُوْرَةً))

"ان اشیاء پر جب عمل کیا گیا تو ان کا عامل اس فطرت سے موصوف ہوا جس پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو پیدا کیا اور ان کو اس پر رغبت دلائی اور ان کے لیے پسند فرمایا تاکہ وہ صورت کے لحاظ سے کامل ترین اور اعلیٰ صفات کے مالک بن جائیں۔" (نیل الاوطار ۱/ ۱۳۰)

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

((هِيَ السُّنَّةُ الْقَدِيْمَةُ الَّتِي اِخْتَارَهَا الْأَنْبِيَاءُ وَاتَّفَقَتْ عَلَيْهَا الشَّرَائِعُ فَكَأَنَّمَا أَمْرٌ جِبِلِّيٌّ يَنْطُوُوْنَ عَلَيْهَا))

"یہ سنت قدیمہ ہے جس کو تمام انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا اور تمام شریعتیں اس پر متفق ہیں کیونکہ یہ پیدائشی اور طبعی چیز ہے جس پر سب اکٹھے ہیں" (نیل الاوطار ۱/ ۱۳۰)

صحیح مسلم کی اس حدیث سے واضح ہوا کہ ڈاڑھی بڑھانا فطری اور جبلی اَمر ہے۔ اس کو منڈوانا یا کتروانا فطرت کو بدلنا ہے اور شیطانی عمل ہے کیونکہ جب

شیطان کو باری تعالیٰ نے دھتکارا اور ملعون قرار دیا تو اُس نے انسان کو گمراہ کرنے کے جو راستے اور طرق ذکر کیے ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اُس نے کہا:

﴿ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ﴾ (النساء : ۱۱۹)

"اور میں انہیں بالضرور حکم دوں گا' وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی (صورت) کو بدل ڈالیں گے"

علاوہ ازیں مرد کا ڈاڑھی کو مونڈنا' یہ عورتوں کے ساتھ مشابہت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایسے مردوں پر لعنت کی ہے جو عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ اور جس فعل پر شریعت میں لعنت ہوئی ہے' وہ کبیرہ گناہوں میں شامل ہے' اسی لیے علامہ ابنِ حجر ہیثمی نے اپنی کتاب "الزَّوَاجِرُ عَنِ اقْتِرَافِ الْكَبَائِر" ۱۵۵/۱ پر اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بے شمار احادیث میں ڈاڑھی کے بڑھانے کا حکم موجود ہے اور ڈاڑھی کٹانا یا مونڈنا اہل کتاب کی علامت ہے جیسا کہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ اَوْفِرُوا اللُّحٰى وَاَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَفِي رِوَايَةٍ اِنْهَكُوا الشَّوَارِبَ وَاَعْفُوا اللُّحٰى.))

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشرکوں کی مخالفت کرو۔ ڈاڑھی کو بڑھاؤ اور مونچھوں کو پست کرو۔" (متفق علیہ' مشکوۃ)

اسی طرح مسند احمد ۲۶۴/۵ میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اہل کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

((فَقُلْنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَهْلَ الْكِتَابِ يَقُصُّوْنَ عَثَانِيْنَهُمْ وَيُوَفِّرُوْنَ سِبَالَهُمْ قَالَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُصُّوْا سِبَالَكُمْ وَوَفِّرُوْا عَثَانِيْنَكُمْ وَخَالِفُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ))

"ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ اہل کتاب داڑھیوں

کو کاٹتے ہیں اور مونچھوں کو چھوڑتے ہیں' آپ نے فرمایا تم مونچھوں کو کاٹو اور داڑھیاں بڑھاؤ اور اہل کتاب کی مخالفت کرو"

حافظ ابنِ حجر نے فتح الباری ۱۰/۳۵۴ پر اور علامہ عینی نے عمدۃ القاری ۲۲/۵۰ پر اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ نیل الاوطار ۱/۱۳۲ پر ہے

((وَ كَانَ مِنْ عَادَةِ الْفُرْسِ قَصُّ اللِّحْيَةِ))

"داڑھی تراشنا فارسیوں کی عادت سے ہے۔"

ان احادیث میں ڈاڑھی کو بڑھانے کا حکم کیا گیا ہے اور شرعی قاعدہ ہے الامر للوجوب لہٰذا ڈاڑھی بڑھانا واجب ہے اور اس کو تراشنا یا منڈوانا اللہ کے رسول ﷺ کے امر کی مخالفت ہے۔ آپ کے امر کی مخالفت عذابِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (النور : ٦٣)

"پس جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں' ان کو اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ ان پر کوئی آفت آن پڑے یا ان پر کوئی دردناک عذاب اترے۔"

اس بات پر تمام اہل اسلام فقہاء و محدثین کا اتفاق ہے کہ داڑھی مونڈنا حرام ہے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی ڈاڑھی مونڈتا ہے تو وہ اس کے ساتھ گناہ پر تعاون کرتا ہے جو شرعاً بالکل منع ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ (المائدہ : ٢)

"نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو۔ گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے"

جب ڈاڑھی مونڈنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے تو اس پر تعاون کرنا گناہ پر تعاون ہے

اور شرعاً حرام ہے۔ شریعت اسلامیہ نے جس فعل کو حرام قرار دیا اس فعل پر اُجرت لینا بھی حرام ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى إِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا ﴾ (الاسراء : ۳۲)

"زنا کے قریب نہ جاؤ اس لیے کہ یہ بہت بڑا گناہ اور برا راستہ ہے"

حدیث میں ہے :

((عَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدٍ قَالَ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ وَمَهْرِ الْبَغِيِّ))

"ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت' نجومی کی کمائی اور زانیہ عورت کی اُجرت سے منع فرمایا ہے"

(بخاری ۸۰۵/۲ ـ ۳۰۵/۱' ابوداؤد ۲۶۷/۳' ۲۳۵ا احمد ۱۴۷/۱' ۲۹۹/۲' ۵۰۰/۲' ۱۱۸/۴' ۱۲۰)

ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں' آپ نے فرمایا :

((مَهْرُ الْبَغِيِّ خَبِيْثٌ))

"زانیہ عورت کی اُجرت پلید ہے" (مسلم ۱۱۹۹/۳' ترمذی ۵۷۴/۳ (۱۲۷۰)

ابوداؤد ۲۶۶/۳ (۳۴۲۱)' مسند احمد ۴۶۴/۳' ۴۶۵' داری ۱۸۰/۲ (۲۶۶۴)

اس آیت کریمہ اور حدیث سے معلوم ہوا زنا حرام ہے اور اس کی اُجرت بھی حرام ہے۔ دوسری مثال یہ سمجھ لیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾

(المائدہ : ۹)

"اے ایمان والو! شراب' جوا' بتوں کے تھان اور فالنامے یہ سب پلید ہیں۔ شیطانی کام ہیں۔ ان (سب) سے اجتناب کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ"

حدیث میں ہے :

((عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا نَزَلَتِ الْاٰيَاتُ مِنْ آخِرِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فِيْ

الرِّبَا خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَرَّمَ التِّجَارَةَ فِي الْخَمْرِ))

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب سورۃ بقرۃ کی آخری آیات سود کے متعلق نازل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نکلے آپ نے شراب کی تجارت حرام قرار دے دی۔" (ابن ماجہ ۱۱۲۲/۲ (۳۳۸۲)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے :

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْخَمْرِ عَشَرَةً عَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَشَارِبَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ إِلَيْهَا وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَالْمُشْتَرِي لَهَا وَالْمُشْتَرَى لَهُ))

"رسول اللہ ﷺ نے شراب کے متعلق دس آدمیوں پر لعنت کی ہے شراب بنانے والا' نچوڑنے والا' پینے والا' اس کو اٹھانے والا' جس کی طرف اس کو اٹھایا جائے' پلانے والا' بیچنے والا' اس کی قیمت کھانا والا' خریدنے والا جس کے لیے خریدی جائے"۔

(ترمذی ۵۸۹/۳ (۱۲۹۵)' ابن ماجہ ۱۱۲۲/۲ (۳۳۸۱)' مسند احمد ۷۱/۲' ۹۷)

ان دونوں مثالوں سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ جس کام کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اس کی اُجرت اور کمائی بھی حرام ہے بعینہٖ ڈاڑھی مونڈنا' پھر اس پر اُجرت لینا حرام ہے۔ اسی طرح ڈاڑھی مونڈنے والے کو دُکان کرایہ پر دینا اس کے ساتھ فعل حرام پر تعاون ہے' یہ بھی حرام ہے۔ لہٰذا میرے وہ بھائی جو ڈاڑھیاں مونڈتے اور اس پر اُجرت لیتے ہیں انہیں اس فعل حرام سے باز آ جانا چاہیے اور فعل حرام کو ترک کر کے حلال رزق کمانا چاہیے۔ بعض علاقوں میں مساجد کی دُکانوں میں یہ فعل حرام کیا جاتا ہے ائمہ مساجد اور مساجد کی کمیٹی پر مبنی افراد کو خصوصاً اس طرف توجہ دینی چاہیے کہ مسجد عبادت کے لیے بنائی جاتی ہے اور اس کے متعلقات کو بھی ایسے کاموں کے لیے استعمال کریں جو شریعت کے مطابق ہوں نہ کہ مساجد جو اسلام کے

قلعے ہیں، ان کی دکانوں اور متعلقات میں فعل حرام کا ارتکاب کیا جائے۔ لہٰذا اس فعل حرام سے اجتناب اختیار کرتے ہوئے صحیح سنت پر عمل کی طرف توجہ دی جائے۔ کہیں اس فعل حرام کے ارتکاب کی وجہ سے اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن نہ بنالیں۔ (مجلّہ الدعوۃ، نومبر/ ۱۹۹۵ء)

گندم کا سٹاک (STOCK) کرنا

س: اگر غلہ منڈی میں گندم وافر مقدار میں موجود ہو تو کیا اس کا سٹاک کیا جا سکتا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں مفصل جواب دیں مہربانی ہو گی۔

(عبدالخالق مغل، تحصیل چشتیاں گلشن اقبال)

ج: ذخیرہ اندوزی بہت بڑا گناہ ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَحْتَکِرُ اِلَّا خَاطِئٌ)) (صحیح مسلم، کتاب البیوع)

"ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا مگر نافرمان۔"

ذخیرہ اندوزی کا مطلب مہنگا کرنے کے لیے کسی چیز کا ذخیرہ کرنا ہے۔ جس طرح آج کل کئی لوگ بازار سے کوئی جنس خرید کر اس کی قلت پیدا کر دیتے ہیں اور جب وہ چیز لوگوں کو نہیں ملتی تو قیمت بڑھا کر بازار میں لے آتے ہیں۔ اگر کوئی چیز بازار میں نایاب ہو یا کم ملتی ہو تو اسے ذخیرہ بنانا حرام ہے۔ اگر کوئی جنس بازار میں وافر مقدار میں موجود ہے اور ذخیرہ کرنے سے لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں تو ذخیرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ بنو نضیر کی کھجوروں میں سے اپنے اہل و عیال کے لیے ایک سال کا خرچ رکھ لیتے۔ باقی فروخت کر دیتے۔

(صحیح بخاری، باب النفقات) از: (ع۔ع)۔ (مجلّہ الدعوۃ، اگست/ ۱۹۹۵ء)

معدوم کی بیع کا حکم؟ (کیا مجلّہ الدعوۃ کی بیع سود نہیں؟)

س: سود کی حرمت کے بارہ میں مجلّہ الدعوۃ کئی مرتبہ پڑھا ہے۔ میرا اس کی وضاحت کے بارے میں یہ سوال ہے کہ معدوم کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ قرآن و

سنت کی روشنی میں جواب دیں۔ اگر ناجائز ہے تو آپ کے مجلہ الدعوۃ کا طریقہ کار کیسا ہے؟ جبکہ آپ سو روپے پہلے جمع کر لیتے ہیں اور مجلہ ابھی چھپا بھی نہیں ہوتا۔ کیا یہ معدوم کی بیع نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ فی پرچہ ۱۰ روپے لیتے ہیں اور سالانہ سو (۱۰۰) روپے یہ ایک ہی چیز میں قیمت کا فرق کیوں ہے کیا یہ سود میں شامل نہیں؟ (ماسٹر محمد اسلم گوندلانوالہ گوجرانوالہ)

ج معدوم (غیر موجود) کی بیع جائز ہے۔ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سنت صحیحہ میں یا کسی صحابی رسول سے اس کی ممانعت وارد نہیں ہوئی۔ ہاں جس طرح بعض موجودہ اشیاء کی بیع حرام ہے' اسی طرح بعض معین معدوم چیزوں کی بیع سے روکا گیا ہے۔ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو لفظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ)) (ترمذی' ابنِ ماجہ' دارقطنی)

"جو تیرے پاس نہیں اس کی بیع نہ کر۔"

یہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان کسی معین چیز کی بیع کے بارے میں ہے' جیسا کہ امام بغوی فرماتے ہیں:

((هٰذَا بُيُوْعُ الْاَعْيَانِ دُوْنَ بُيُوْعِ الصِّفَاتِ))

"کہ یہ نہی معین چیزوں کی بیع میں ہے صفات کی بیع میں نہیں (یعنی جس میں عدم (نہ ہونے) کی صفات پائی جائے' اس کیلئے نہیں" (شرح السنہ ج ۸' ص ۱۴۰)

یا اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز فروخت نہ کر جس کے دینے پر قدرت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔

(مجموعہ فتاویٰ ج ۲۰' ص ۵۳۰)

باقی رہا مجلۃ الدعوۃ کی بیع کا طریق کار تو یہ بیع سلم ہے' جسے شریعت نے جائز قرار دیا ہے (بیع سلم یہ ہے کہ کوئی صاحب جنس ضرورت کی بنا پر اپنی جنس تیار ہونے سے پہلے ہی بیع کر لیتا ہے کہ مجھے اتنی قیمت ابھی ادا کر دو تو جنس کے تیار

ہونے پر میں اتنی جنس آپ کو دے دوں گا)۔ اس کے بارے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے' دیکھا کہ لوگ ایک ایک' دو دو اور تین تین سالوں تک بیع سلم کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا :

((مَنْ اَسْلَفَ فِی شَیْیءٍ فَلْیُسْلِفْ فِی کَیْلٍ مَعْلُوْمٍ وَوَزْنٍ مَعْلُوْمٍ اِلٰی اَجَلٍ مَعْلُوْمٍ))

"جو شخص بیع سلم کرتا ہے وہ ماپے جانے اور تولے جانے والی معلوم چیزوں میں معلوم مدت تک بیع کرے" (متفق علیہ)

اس حدیث رسول ﷺ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس بیع پر برقرار رکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے بعد بھی یہ بیع کرتے رہے جیسا کہ بخاری شریف کی کئی احادیث سے واضح ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی آیت سے استدلال کیا ہے :

﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ ﴾

(البقرہ : ۲۷۹)

"اے ایمان والو جب تم آپس میں ایک مقررہ مدت تک لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو"

فرماتے ہیں' میں گواہی دیتا ہوں بیع سلم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حلال کیا ہے اور اس کی اجازت دی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی۔ (المستدرك على الصحيحين) امام حاکم کہتے ہیں صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے ایسی چیز کی بیع کی اجازت دی ہے جو معدوم ہو۔ جب اس کے اوصاف وزن اور مدت وغیرہ معلوم ہو جائیں اور اس میں کسی قسم کی جہالت باقی نہ رہے۔ اپنے دوسرے سوال کا جواب علامہ ابن القیم رحمہ اللہ کی زبانی سنئے'

فرماتے ہیں :

اِذِ الْحَاجَةُ الَّتِی لِاَجْلِهَا شَرَعَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ السَّلَمَ الْاِرْتِفَاقُ مِنَ الْجَانِبَیْنِ هٰذَا یَرْتَفِقُ بِتَعْجِیْلِ الثَّمَنِ وَهٰذَا یَرْتَفِقُ بِرَخْصِ الثَّمَنِ

''کہ جس ضرورت کی بنا پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بیع سلم کو جائز قرار دیا ہے' وہ یہ ہے کہ دونوں جانبوں سے ایک فریق کو جلدی قیمت حاصل ہو جانے کی سہولت حاصل ہو جائے اور دوسرے کو چیز سستی حاصل ہونے کی سہولت مل جاتی ہے'' (اعلام الموقعین ج۱' ص ۳۰۲)

اسلام نے جب اس بیع کو جائز قرار دیا ہے تو اسے سود نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ تو ایک اسلامی تدبیر ہے جس کی وجہ سے انسان سود پر قرض لینے سے بچ سکتا ہے۔ لوگ اس کو اپنا لیں تو سود پر قرض لینے سے مسلمانوں کی جان چھوٹ سکتی ہے۔ ویسے بھی مجلہ الدعوۃ کے بارہ میں یہ بیع اس وقت ہے جب اس کو بیع قرار دیا جائے حالانکہ یہ قطعاً بیع نہیں ہے بلکہ تھوڑا سا زر تعاون ہے جو لوگوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ اصل مقصد مخلوق خدا کو اللہ کی توحید اور اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے روشناس کرا کے نبوی منہج پر چلانا ہے' تاکہ لوگ ذلت و پستی سے نکل کر عزت و رفعت کا راستہ اپنا لیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم از : (ع۔ع)

قرآن پاک کی تعلیم پر معاوضہ لینا

س قرآن کی تعلیم دینے پر اس کا معاوضہ ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟ کوئی اپنی خوشی سے تحفہ یا مٹھائی وغیرہ دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں جو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کی جاتی ہے کہ ان کے ایک شاگرد نے ان کو ایک کمان تحفہ دی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ آگ کا طوق ہے' اگر پہننے کی طاقت ہے تو قبول کر لو؟ کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ اس کے علاوہ جمعہ اور امامت پر تنخواہ لینا کیسا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کریں؟ (محمد صدیق خان گلشن پارک لاہور' محمد ارشد سیالکوٹ' مولوی محمد یاسین' ڈاکٹر عبدالوہاب خان' حاجی محمد ابراہیم سرگودھا)

ج قرآن مجید کی تعلیم ' خطبہ جمعہ ' امامت وغیرہ پر اُجرت لینے میں کوئی حرج نہیں ' کیونکہ اس کی ممانعت کے بارے میں قرآن و سنت کے اندر کوئی صریح نص موجود نہیں ہے۔ جبکہ اس کے جواز کے دلائل موجود ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ فرماتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا ایک بستی سے گزر ہوا بستی والوں نے مانگنے پر بھی ان کی مہمان نوازی نہ کی۔ اچانک ان کے سردار کو کسی زہریلی چیز نے کاٹ لیا۔ ان کے افراد صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور پوچھا تم میں کوئی دَم کرنے والا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض نے اُجرت لے کر دَم کی حامی بھری۔ تو انہوں نے بکریوں کے ایک ریوڑ کا وعدہ کر لیا۔ سورۂ فاتحہ پڑھ کر اس پر دَم کیا اور متاثرہ جگہ پر اپنا لعاب لگایا تو وہ آدمی بالکل تندرست ہو گیا۔ وہ صحابی رسول رضی اللہ عنہ بکریاں لے کر واپس آیا تو دوسرے ساتھیوں نے کہا تو نے تو کتاب اللہ پر اُجرت لی ہے۔ گویا اس چیز کو انہوں نے ناپسند کیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر بھی یہی کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ((اَخَذَ عَلٰی کِتَابِ اللّٰهِ اَجْرًا)) تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ((اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ)) سب سے زیادہ جس چیز پر تم اُجرت لینے کا حق رکھتے ہو' وہ اللہ کی کتاب ہے۔
(صحیح بخاری کتاب الاجارہ باب الشروط فی الرقیہ)

بخاری ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں : ((وَاضْرِبُوْا لِیْ بِسَهْمٍ)) کہ میرے لیے بھی حصّہ نکالو۔ بخاری شریف کی اس صحیح حدیث سے ثابت ہو گیا کہ قرآن پر اُجرت لی جا سکتی ہے۔ اس میں قرآن کی تعلیم' امامت اور خطبہ جمعہ بھی داخل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ عام ہیں اور ان میں وہ شامل ہیں۔ اگر اُجرت درست نہ ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ کہتے کہ میرا بھی حصّہ نکالو۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمیشہ حلال اور پاکیزہ چیز ہی استعمال کرتے تھے۔

دوسری دلیل نکاح میں خاوند پر بیوی کے لیے حق مہر دینا ضروری ہے' جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا نکاح قرآن مجید کی تعلیم کو حق مہر ٹھہرا کر کر دیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذْهَبْ فَقَدْ اَنْكَحْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْاٰنِ))

(بخاری کتاب النکاح باب التزویج علی القرآن)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے خود قرآن مجید کی تعلیم کی اُجرت دلوائی ہے۔ اگر اُجرت درست نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کبھی بھی قرآن کی تعلیم کو حق مہر مقرر نہ کرتے۔ امام مالک نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے:

وَبِذٰلِكَ جَازَ اَخْذُ الْاُجْرَةِ عَلٰى تَعْلِيْمِ الْقُرْاٰنِ (فتح الباری ج ۹' ص ۱۳۱)

"کہ اس سے قرآن کی تعلیم پر اُجرت لینا جائز ہو گیا۔"

(فتح الباری ج ۹' ص ۱۳۱)

اس کے علاوہ محمد بن سیرین کبار تابعین سے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں ایک تعلیم دینے والا تھا' اس کے پاس بڑے بڑے لوگوں کے بیٹے پڑھتے تھے اور وہ اس معلم کا حق ادا کرتے تھے۔ (محلی ابن حزم)

محمد بن سیرین نے اُبی بن کعب اور ابو قتادہ جیسے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ پایا ہے اور ان سے روایات بھی لی ہیں۔ اگر قرآن کی تعلیم پر اُجرت جائز نہ ہوتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم کرام ضرور ایسے شخص کو روک دیتے۔ اس طرح پہلے احناف کا یہ مذہب تھا:

((لَا يَجُوْزُ الْاِسْتِيْجَارُ عَلَى الْاَذَانِ وَالْحَجِّ وَكَذَا الْاِمَامَةِ وَتَعْلِيْمِ الْقُرْاٰنِ))

"کہ اذان' حج' قرآنی تعلیم اور امامت پر اُجرت لینا جائز نہیں"

(ہدایہ اخریہ ص ۳۰۳)

مگر احناف اپنے ائمہ کی اس بات پر قائم نہیں رہ سکے۔ اس وقت امام ابو حنیفہ کی تقلید کو نظر انداز کر کے دارالعلوم دیوبند سمیت تمام مدارس میں اساتذہ تنخواہ وصول کرتے ہیں چنانچہ ہدایہ میں لکھا ہے کہ اس دور میں ہمارے بعض مشائخ نے قرآن کی تعلیم پر اُجرت لینے کو اچھا سمجھا ہے کیونکہ دینی امور پر عمل میں سستی ظاہر

ہو چکی ہے۔ اجرت کے جائز نہ رکھنے میں قرآن کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے اور اسی پر آج فتویٰ ہے (یعنی اجرت لینا جائز ہے)۔

باقی استاد کو تحفہ نہ دینے کے بارے میں جو روایت آپ نے ابوداؤد کے حوالہ سے ذکر کی ہے وہ صحیح نہیں۔ اس کی سند میں اسود بن ثعلبہ مجہول راوی ہے۔ ابن المدینی کہتے ہیں: ((فَاِنَّا لَا نَحْفَظُ عَنْهُ اِلَّا هٰذَا الْحَدِيْثَ)) "کہ ہم اس کے لیے اس کے سوا کوئی حدیث نہیں جانتے"۔ تقریب میں ہے ((مَجْهُوْلٌ مِنَ الثَّالِثَةِ)) میزان الاعتدال میں ہے ((لَا يُعْرَفُ)) غیر معروف آدمی ہے۔ اس کی متابعت میں جو سند پیش کی جاتی ہے' وہ بھی صحیح نہیں۔ اس کے بارہ میں امام بیہقی فرماتے ہیں ((هٰذَا حَدِيْثٌ مُخْتَلَفٌ فِيْهِ عَلٰى عُبَادَةَ بْنِ نُسَيٍّ كَمَا تَرٰى)) کہ عبادہ بن نسی پر اس حدیث میں اختلاف ہے۔ ایک شخص اس کے استاد کا نام اسود بن ثعلبہ بتاتا ہے اور دوسرا جنادہ بن ابی امیہ بتاتا ہے۔ پھر ابنِ حزم کہتے ہیں اس میں بقیہ راوی ہے اور وہ بھی ضعیف ہے۔ اس بنا پر حدیث قابل اعتبار نہیں بلکہ ابنِ حزم نے تو یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ((اَمَّا الْاَحَادِيْثُ فِيْ ذٰلِكَ (فِيْ عَدَمِ جَوَازِ اَخْذِ الْاُجْرَةِ) فَلَا يَصِحُّ مِنْهَا شَيْئٌ)) کہ جن احادیث سے قرآنی تعلیم کی ممانعت پر استدلال کرتے ہیں' ان میں سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ باقی علامہ ناصرالدین البانی کا اس حدیث کو اس سند کے لحاظ سے صحیح قرار دینا اس بنا پر ہے کہ ممکن ہے ابنِ نسی کے دو استاد ہوں اسود بن ثعلبہ بھی اور جنادہ بن امیہ بھی دونوں استاد ہیں۔ لیکن اس احتمال کی مجھے کوئی دلیل نہیں ملی ہے اور نہ ہی البانی صاحب نے کوئی دلیل اس احتمال کو ثابت کرنے کے لیے پیش کی ہے۔ لہٰذا صرف احتمال سے اس حدیث کو صحیح قرار دینا نظر سے خالی نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

از: (ع۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۵ء)

کام کی اُجرت مقرر کرنا

کسی کام کی اُجرت یا محنت کس حد تک وصول کی جا سکتی ہے؟
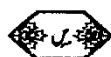
ج: شریعت نے کسی کاریگر یا مستری کی مزدوری اور محنت مقرر نہیں کی بلکہ فریقین کے باہمی اتفاق سے ہی مقرر کی جا سکتی ہے البتہ مستری اور کاریگر کو اللہ سے ڈرتے ہوئے اپنی مناسب اُجرت وصول کرنا چاہئے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ظلم کے سپرد کر سکتا ہے۔

از: (رحمت اللہ ربانی) (مجلۃ الدعوۃ، مئی / ۱۹۹۶ء)

کتاب

الْمِیْرَاثِ

مسئلہ وراثت

س: ہمارے والد ماجد ڈیڑھ لاکھ کی جائیداد چھوڑ کر اس دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں اور ان کے ذمہ بیس ہزار قرض تھا اور ورثاء میں سے ایک بیوی ۴ بیٹے اور ۶ بیٹیاں ہیں۔ کتاب و سنت کی روشنی میں ہر ایک وارث کا حصہ کیا ہو گا وضاحت فرمائیں؟

ج: صورت مذکورہ میں ڈیڑھ لاکھ روپے کی جائیداد سے پہلے بیس ہزار روپے قرض ادا کیا جائے۔ پھر باقی رقم ایک لاکھ تیس ہزار میں سے بیوی کو آٹھواں حصہ دیا جائے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ﴾ (نساء : ۱۲) "اگر تمہاری اولاد ہو تو ان (بیویوں) کے لیے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے جو تم نے ترکہ چھوڑا وصیت کو پورا کرنے کے بعد جو تم کر جاؤ یا قرض کے بعد" لہٰذا بیوی کو قرض کی ادائیگی کے بعد کل جائیداد کا آٹھواں سولہ ہزار دو سو پچاس روپے دیا جائے گا۔ اس کے بعد اولاد کو اس طرح حصہ دیا جائے گا کہ ہر بیٹے کو دو بیٹیوں کے برابر حصہ ملے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ﴾ کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے لہٰذا باقی جائیداد سے ہر لڑکے کو سولہ ہزار دو سو پچاس روپے اور ہر لڑکی کو آٹھ ہزار ایک سو پچیس روپے ادا کئے جائیں۔ (مجلۃ الدعوۃ' جون / ۱۹۹۳ء)

علاتی بھائی کا وراثت سے حصہ

س: حافظ نور محمد گزشتہ دنوں وفات پا گئے۔ باپ نہ ماں' بیوی نہ بچے' دو بھائی تھے جو عرصہ ہوا ان کی زندگی میں ہی وفات پا گئے۔ سلیمان اور عبدالرحمٰن دونوں علاتی بھائی تھے۔ عبدالرحمٰن کی ایک بچی تھی وفات پا گئی تھی اور وہ دو بچیاں چھوڑ گئی جو زندہ ہیں۔ سلیمان مرحوم کے تین بچے تھے۔ ایک لڑکی صفیہ موجود ایک لڑکا محمد افضل موجود ایک لڑکا فوت ہو گیا عزیز نامی اور اولاد چھوڑ گیا دو لڑکیاں اور

ایک لڑکا۔ بڑا پیچیدہ وراثت کا مسئلہ ہے حل فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔
(حکیم محمد بشیر' ریتالہ خورد' ضلع اوکاڑہ)

ج اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ والصلوة والسلام على اشرف الانبياء والمرسلين نبينا محمد وعلى اله واصحابه وسلم وبعد۔ وراثت کی شروط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ میت کی وراثت اس کے مرنے کے بعد صرف اس کے ان ورثاء میں تقسیم ہو گی جو اس کی موت کے وقت زندہ تھے اور جو اس کی زندگی میں ہی وفات پا گئے وراثت کے مستحق نہیں ہوں گے۔ مسئلہ مسؤلہ میں نور محمد کی موت کے وقت اس کے عزیزوں میں سے صرف ایک بھتیجا محمد افضل اور ایک بھتیجی صفیہ بیگم اور ایک دوسرے بھتیجے عبدالرحمٰن کی دو ہتیاں اور تیسرے بھتیجے عزیز کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں زندہ ہیں۔ ان سب ورثاء میں سے ایک بھتیجا محمد افضل اور تیسرے بھتیجے کا لڑکا عصبہ ہیں۔ ان کے علاوہ بھتیجی صفیہ' عبدالرحمٰن کی دو دوہتیاں اور عزیز کی دو بیٹیاں ذوی الارحام سے ہیں (ذوی الارحام ان قریبی عزیزوں کو کہتے ہیں جو نہ اصحاب الفروض سے اور نہ عصبات میں سے ہوں) اصحاب الفروض اور عصبات کی موجودگی میں یہ میراث سے محروم ہوتے ہیں۔ (التحقیقات المرضیه فی المباحث الفرضیه ص ۲۶۰)

مذکورہ صورت میں ذوی الارحام کے علاوہ صرف عصبہ کے دو افراد موجود ہیں جو کہ درجہ میں مختلف ہیں۔ ۱) بھتیجا اور (۲) بھتیجے کا لڑکا ہے۔ تو وراثت صرف اسے ملے گی جو درجہ میں میت کے زیادہ قریب ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ

((اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ))

"میراث کے مقررہ حصے انہیں دو' جن کے وہ حصے ہیں جو باقی رہ جاتے ہیں وہ سب سے قریبی مرد کے لیے ہے" (صحیح بخاری مع الفتح' ص ۱۲' ج ۱۲)

لہٰذا وراثت کا مستحق صرف محمد افضل ہو گا باقی سب محروم رہیں گے۔ ایک عام آدمی کے ذہن میں یہ اشکال آ سکتا ہے کہ بہن اپنے بھائی کے ساتھ عَصَبَه مَعَ

الْغَیرِ بن جاتی ہے اور بھائی کے حصہ میں سے نصف کی مستحق ٹھہرے گی اور صورت مسئولہ میں صفیہ محمد افضل کی بہن ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ بھائی اپنی بہن کو عصبہ بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ صرف وہ بھائی جو میت کا عینی یا علاتی بھائی ہے اور صورتِ مذکورہ میں صفیہ اور محمد افضل میت کے بھتیجا اور بھتیجی ہیں۔ جیسا کہ اس قاعدہ کی تصریح ابو عبداللہ محمد بن علی الرحبی نے کی ہے فرماتے ہیں

وَلَیْسَ ابْنُ الْاَخِ بِمُعَصِّبٍ مَنْ مِثْلُهٗ اَوْ فَوْقَهٗ بِالنَّسَبِ

"کہ بھائی کا بیٹا اپنی ہم درجہ اور اوپر والی مؤنث کو عصبہ نہیں بناتا۔"

(شرح الرحبیہ : ۹۳)

حافظ ابنِ حجر اور شوکانی نے فَهُوَ لِاَوْلٰی رَجُلٍ کی تفسیر میں ابن التین کا قول نقل کیا ہے کہ اَوْلٰی رَجُلٍ سے مُراد کون ہے؟ فرماتے ہیں :

((اِنَّمَا الْمُرَادُ بِهِ الْعَمَّةُ مَعَ الْعَمِّ وَبِنْتُ الْاَخِ مَعَ اِبْنِ الْاَخِ وَبِنْتُ الْعَمِّ مَعَ ابْنِ الْعَمِّ وَخَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْاَخُ وَالْاُخْتُ لِاَبَوَیْنِ اَوْلِاَبٍ فَاِنَّهُمْ یَرِثُوْنَ بِنَصِّ قَوْلِهٖ تَعَالٰی ﴿ وَاِنْ كَانُوا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ﴾

"کہ چچا اور بھتیجا کا بیٹا یہ سب اپنی بہنوں کو عصبہ نہیں بناتا بلکہ ان کی بہنیں ذوی الارحام میں داخل ہیں لہٰذا وارث نہیں بنیں گی"

(فتح الباری ۱۲/۱۳، نیل الاوطار ۵۸/۶) از : (ع ۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ، نومبر/ ۱۹۹۴ء)

پوتا چچا کی موجودگی میں دادا کی وراثت کا حقدار بن سکتا ہے؟

س کیا دادا کی وراثت کا پوتا چچا کی موجودگی میں وارث بن سکتا ہے؟ صورت اس طرح ہے کہ حاجی عبدالعزیز کی (گھلا وٹواں) میں زمین تھی۔ وہ سیم ہو گئی تو گورنمنٹ نے انعامی سکیم نکالی اور حاجی عبدالعزیز کے لڑکے (حافظ محمد اسحٰق) نے تین درخواستیں دیں نمبر۱ اپنے باپ (حاجی عبدالعزیز) کی نمبر۲ اپنے بھتیجے (محمد زبیر) کی نمبر۳ اپنی۔ اور جو درخواست منظور ہوئی وہ حاجی (عبدالعزیز) کی تھی تو حاجی صاحب کو

لیہ میں زمین مل گئی۔ وہ اس وقت زندہ تھے اور بعد میں فوت ہوئے۔ کیا اس لیہ والی زمین جو کہ گورنمنٹ کی طرف سے انعامی سکیم کے تحت ملی تھی۔ اس کا حاجی صاحب کا پوتا محمد زبیر اپنے چچا (حافظ محمد اسحاق) کی موجودگی میں وارث بن سکتا ہے؟

ج چچا کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں بن سکتا۔ اس کی دلیل جاننے سے پہلے یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ شریعت اسلامیہ نے جن رشتہ داروں کو اپنے میں سے کسی مرنے والے کا وارث ٹھہرایا ہے' ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ رشتہ دار ہیں جن کا حصہ قرآن و سنت میں معین کر دیا گیا ہے۔ ان کو علم میراث کی اصطلاح میں اصحاب الفروض کہتے ہیں۔

دوسرے وہ ورثاء جن کے حصوں کی تعیین قرآن و سنت میں نہیں یعنی جو اصحاب الفروض کی عدم موجودگی میں سارا مال لے لیتے ہیں۔ وہ اصحاب الفروض کی موجودگی میں ان سے بچا ہوا مال لیتے ہیں ان کو عصبات کہتے ہیں۔ بھائی اور پوتا بھی میت کے ان ورثاء میں سے ہیں جن کا حصہ معین نہیں ہے۔ تو عصبات میں مال کی تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ ان اصحاب الفروض کو ان کے مقرر کردہ حصہ دے دینے کے بعد اگر ترکہ میں کچھ باقی ہے تو وہ عصبات کے ان مردوں کو دیا جائے گا جو میت کے زیادہ قریب ہوں اور دور کے تعلق والے محروم رہیں گے۔ اس کی دلیل صحیحین کی حدیث ہے جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ))

"کہ مقرر کردہ ان کے مستحقین کو دو اور جو باقی بچ جائے' پس وہ اس آدمی کے لیے ہے جو میت کا زیادہ قریبی ہے"

(بخاری شریف مع فتح الباری ج ۱۲' ص ۱۲-۱۷' صحیح مسلم شریف مع نووی ج ۱۱' ص ۵۳)

رسول کریم ﷺ کا یہ فرمان واضح کرتا ہے کہ اصحاب الفروض کے مقررہ حصے پورے کر دینے کے بعد جو باقی بچے وہ مرد عصبات میں سے سب سے قریبی کے لیے

ہے کوئی دور والا اس کے ساتھ شریک نہیں ہو گا۔ امام نووی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے:

" وَقَدْ اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى اَنَّ مَا بَقِيَ بَعْدَ الْفُرُوْضِ فَهُوَ لِلْعَصَبَاتِ يُقَدَّمُ الْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ فَلَا يَرِثُ عَاصِبٌ بَعِيْدٌ مَّعَ وَجُوْدِ قَرِيْبٍ۔"

"مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو اصحاب الفروض کو دینے کے بعد بچ جائے' وہ عصبات کے لیے ہے زیادہ قریبی کو مقدم کیا جائے گا' دور کا عصبہ رشتہ دار قریبی عصبہ کی موجودگی میں وارث نہیں بن سکتا" (شرح نووی' ج ۱۱' ص ۵۳)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں باب قائم کیا ہے باب میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن آخر میں فرماتے ہیں:

((وَلَا يَرِثُ وَلَدُ الْاِبْنِ مَعَ الْاِبْنِ))

"کہ بیٹے کے ہوتے ہوئے بیٹے کی اولاد وارث نہیں بن سکتی (وہ اولاد میت کے کسی بھی زندہ یا فوت شدہ بیٹے کی ہو)" (صحیح بخاری مع فتح الباری ۱۲۔۱۷)

مسئولہ صورت میں محمد زبیر کی نسبت حافظ محمد اسحاق میت سے زیادہ قریبی عزیز ہے۔ اس لیے محمد اسحاق کے ہوتے ہوئے محمد زبیر کو اپنے دادا سے کچھ نہیں ملے گا۔ علم وراثت کا یہ قاعدہ بھی ہے کہ جب زیادہ عصبات جمع ہو جائیں اور وہ جس جہت سے میت کے وارث بن رہے ہوں' وہ جہت بھی ایک ہو اور درجہ میں اوپر نیچے ہوں جیسے میت کا پوتا اور بیٹا جمع ہو جائیں دونوں کی جہت ایک ہے کیونکہ پوتا کسی بھی بیٹے کی عدم موجودگی میں بیٹے کے حکم میں ہوتا ہے (یعنی جب میت کا کوئی بھی بیٹا نہ ہو تو پوتا بیٹے کے حکم میں ہوتا ہے تو اس صورت میں قریبی درجہ والے کو مقدم کیا جائے گا میت کا بیٹا درجہ میں پوتے سے زیادہ قریب ہے تو مال بیٹے کو ملے گا اور پوتا محروم ہو جائے گا)۔

یاد رہے کہ وراثت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو مال کی صورت میں یا زمین کی

صورت میں یا دیت وغیرہ کی صورت میں کوئی چھوڑ جاتا ہے۔ وہ جائیداد میت کو کسی بھی طریقہ سے حاصل ہو، خواہ اپنے بڑوں سے وراثت پا کر وارث بنا ہو یا خود خرید کے مالک بنا ہو یا کہیں گورنمنٹ کی انعامی سکیم حاصل کر کے مالک بنے۔

از: (ع۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۴ء)

وراثت کا مسئلہ

س زید اور بکر ایک ماں سے جبکہ عمر اور اس کی ایک بہن دوسری ماں سے ہیں۔ باپ ان سب کا ایک ہے۔ باپ پاکستان بننے سے پہلے فوت ہو گیا تھا۔ انگریزی قانون کے مطابق رقبہ تینوں بیٹوں میں برابر تقسیم ہو گیا۔ بہن کو کچھ نہ ملا۔ ۱۹۴۷ء میں بکر' لاولد فوت ہو گیا۔ بکر کا رقبہ زید اور عمر میں تقسیم ہو گیا۔ اس وقت بھی بہن کو کچھ نہ ملا۔ اب بہن نے زید سے اپنے مرنے والے بھائی کی وراثت کا مطالبہ کیا مگر انگریزی قانون نے فیصلہ زید کے حق میں دے دیا کہ بہن حقدار نہیں۔ اب زید دریافت کرتا ہے آیا شرعاً مرنے والے بھائی کی وراثت سے بہن کا حصہ بنتا ہے یا نہیں اور کیا بھائیوں کا شرعی فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے باپ کی وراثت' جو کہ بچپن میں انگریزی قانون کے مطابق ان کو ملی تھی' اس میں سے بہن کا حصہ ادا کریں یا نہیں؟ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب دے کر مطلع فرماویں۔

(محمد حنیف اطہر' محمدی پور تحصیل چونیاں ضلع قصور)

ج زمانہ جاہلیت میں لوگ مرنے والے کی وراثت سے اپنی عورتوں اور بچوں کو محروم کر دیتے تھے۔ اسلام نے ایسے ظالم قانون کو ختم کر کے عدل و انصاف پر مبنی قانون مسلمانوں کو دیا اور عورتوں بچوں سمیت ہر شرعی حقدار کا حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں بیٹی کو باپ کی وراثت سے ﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾ (لڑکے کا حصہ لڑکی سے دوگنا ہے) کے مطابق ساتواں حصہ ملے گا۔ (مگر شرط یہ ہے کہ اس مرنے والے کی دونوں بیویاں اس کی موت سے پہلے فوت ہو چکی ہوں۔ اور اگر وہ اس وقت زندہ تھیں تو پھر تقسیم یوں ہوگی: دونوں بیویوں کا پوری وراثت سے

آٹھواں حصہ ـــــ جبکہ کل آٹھ حصے ہی بنیں گے ـــــ باقی سات حصوں میں سے بیٹی کا ایک حصہ اور ہر بیٹے کے دو دو حصے۔ یہ تقسیم میت کا قرضہ ادا کرنے کے بعد اور اس وصیت کے پورا کرنے کے بعد ہوگی جو اس نے (اگر) اپنی زندگی میں کی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ﴾ (سورۃ نساء: ۱۲) "اگر تمہاری اولاد ہو تو تمہارے ترکہ سے تمہاری بیویوں کے لیے آٹھواں حصہ ہے اور وہ بھی اس قرض کے بعد جو تم نے دینا ہے اور اس وصیت کے بعد جو تم نے کی تھی۔) اس طرح مرنے والے بھائی بکر کی وراثت سے بھی اس کا حصہ بنتا ہے کیونکہ یہ اس کی علاتی بہن ہے جبکہ بکر کا ایک عینی بھائی بھی موجود ہے اور یہ بہن اپنے بھائی عمر کے ساتھ مل کر عصبہ بنتی ہے۔ اب جبکہ عصبہ کا ازدحام ہو تو جو قوت درجہ اور جہت میں اولیٰ ہوتا ہے اس کو وراثت ملتی ہے اور باقی محروم ہو جاتے ہیں۔ مسئلہ مسئولہ میں میت کا عینی بھائی جو کہ زید ہے یہ جہت اور درجہ میں عمر اور اسکی بہن کے ساتھ یکساں ہے جبکہ قوت کے لحاظ سے میت کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ زید کا رشتہ ماں باپ دونوں کی طرف سے ہے اور عمر اور اس کی بہن کا رشتہ صرف باپ کی طرف سے ہے۔ واللہ اعلم۔

اب شریعت کے مطابق بھائیوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی بہن کا حصہ ادا کریں اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہی اور دوسرے کا مال ناحق غصب کرنے کے الزام سے بچ جائیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مسلمان ملک میں انگریز کے رواج دیئے ہوئے جاہلی اور ظالم قوانین بنائے گئے ہیں۔ مسلمان حکمرانوں نے (اپنی حکومتیں بچانے کے لئے) دین حنیف کے سراپا عدل و انصاف پر مبنی نظام کو داؤ پر لگا کر مسلمانوں پر مسلط کیا ہوا ہے۔ از: (ع ۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۵ء)

كتاب

الطِّبّ

دَم کا شرعی حکم

س کیا دَم کرنا جائز ہے اور جو آدمی سر کو پکڑ کر دَم کرتے ہیں یا جس جگہ درد ہو وہاں پر ہاتھ رکھ کر دَم کرنا درست ہے؟ قرآن و حدیث کی رو سے واضح کریں۔ (عبدالحکیم آزاد' ضلع خوشاب)

ج دَم کرنا درست ہے اور کئی احادیث سے ثابت ہے۔ جیسا کہ بخاری و مسلم کی متفق حدیث ہے کہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اصحاب سفر میں تھے کہ انہوں نے عرب کے قبائل میں سے کسی ایک قبیلے کے قریب اپنا پڑاؤ ڈالا۔ اس قبیلے کے سردار کو کسی موذی جانور نے ڈسا۔ انہوں نے اس کے علاج کے لیے کافی تگ و دو کی لیکن وہ شفایاب نہ ہوا تو ان میں سے کسی نے کہا کہ تم ان قافلے والوں کے پاس جاؤ۔ شاید ان کے پاس کوئی علاج کرنے والا ہو تو وہ لوگ ان کے پاس آئے اور کہا کہ ہمارے سردار کو کسی موذی چیز نے ڈسا ہے اور ہم نے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے لیکن اس کو افاقہ نہیں ہوا۔ کیا تم میں سے کوئی دَم کرنے والا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک آدمی گیا اور اُس نے کچھ بکریوں کے عوض سورۃ فاتحہ پڑھ کر دَم کیا وہ آدمی تندرست ہو گیا۔ وہ بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آیا۔ انہوں نے اس کو برا سمجھا اور کہا تو نے اللہ کی کتاب پر مزدوری لی ہے تو رسول اللہ نے فرمایا جس پر مزدوری لینے کے تم سب سے زیادہ حق دار ہو وہ اللہ کی کتاب ہے۔ جس جگہ پر درد ہو وہاں پر ہاتھ رکھ کر دَم کرنا بھی درست ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں آتا ہے عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی کہ جب سے مسلمان ہوا ہوں اپنے جسم میں درد پاتا ہوں تو آپ نے فرمایا:

((ضَعْ يَدَكَ عَلَى الَّذِيْ تَأَلَّمُ مِنْ جَسَدِكَ وَقُلْ: بِسْمِ اللّٰهِ ثَلَاثًا وَقُلْ سَبْعَ مَرَّاتٍ: اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ.))

"اپنا ہاتھ درد والی جگہ پر رکھ اور تین مرتبہ بسم اللہ کہہ اور سات مرتبہ ((اَعُوْذُ

بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ)) کہ میں پناہ پکڑتا ہوں اللہ کی عزت اور قدرت کے ساتھ ہر اس چیز کی برائی سے جسے میں پاتا ہوں اور ڈرتا ہوں۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس جگہ درد ہو وہاں پر ہاتھ رکھ کر دم کرنا درست ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۲ء)

تعویذ کی شرعی حیثیت

س ۱۔ تعویذ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲۔ قرآنی آیات کے تعویذ کا جواز شریعت میں کیونکر ہے؟

۳۔ اہلحدیث کہلوانے والے امام جو کہ قرآنی آیات کے تعویذ کرتے ہوں' کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

۴۔ کیا تعویذ کرنا شرک ہے اور اگر شرک ہے تو اس کا لکھنے والا اور لینے والا مشرک ہے یا نہیں؟ (سید رضا احمد شاہ گیلانی' چیچہ وطنی ساہیوال)

ج عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ))[ا]

"یعنی دم اور تمائم اور محبت کے ٹونے ٹوٹکے شرک ہیں۔"

(رواہ احمد و ابوداؤد)

اس حدیث میں دم سے مراد شرکیہ دم ہیں کیونکہ شرک سے پاک دم کرنے کی اجازت بلکہ ترغیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

((اَعْرِضُوْا عَلَيَّ رُقَاكُمْ لَا بَأْسَ بِالرُّقٰى مَا لَمْ تَكُنْ شِرْكًا))

"مجھے اپنے دم سناؤ دم میں کوئی حرج نہیں جب تک شرک نہ ہو"۔

اور صحیح مسلم میں ہی دم کے متعلق آپ کا فرمان ہے:

[ا] اس کی سند میں اعمش مدلس راوی ہیں اور روایت معنعن ہے (ابو طاہر)

((مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَّنْفَعَ اَخَاهُ فَلْيَنْفَعْ))

"جو شخص اپنے بھائی کو نفع پہنچا سکتا ہو پہنچائے"۔

تمائم تمیمہ کی جمع ہے اس کا ترجمہ عام طور پر تعویذ کیا جاتا ہے۔ مگر یہ ترجمہ درست نہیں کیونکہ تمیمہ کے متعلق لغت کی تمام کتابوں میں لکھا ہے کہ اس سے مُراد وہ منکے وغیرہ ہیں جنہیں اس مقصد کے لیے لٹکایا جاتا تھا کہ ان کے لٹکانے سے بیماری دور رہتی ہے۔

قاموس میں لکھا ہے:

((خَرْزَةٌ رَقْطَاءُ تُنْظَمُ فِي السَّيْرِ ثُمَّ يُعْقَدُ فِي الْعُنُقِ))

"یعنی سیاہ و سفید نکتوں والا منکا ہے جو چمڑے میں پرو کر گلے میں ڈالا جاتا ہے"۔

کتاب التوحید کی شرح فتح المجید میں ہے:

"وَهِيَ مَا يُعَلَّقُ بِاَعْنَاقِ الصِّبْيَانِ مِنْ خَرْزَاتٍ وَّعِظَامٍ لِّدَفْعِ الْعَيْنِ وَهٰذَا مَنْهِيٌّ عَنْهُ۔"

یعنی تمیمہ وہ منکے یا ہڈیاں ہیں جو نظرِبد سے دور رکھنے کے لیے بچوں کے گلے میں لٹکائی جاتی ہیں۔ بیماری سے بچاؤ کے لیے ڈالے جانے والے کڑے' دھاگے' درختوں کے پتے' ہاتھوں یا گلے میں پہنے جاتے ہیں یا لوہے کے اوزار جو چارپائی پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ سب اسی میں آتے ہیں اور شرک ہیں کیونکہ یہ چیزیں نہ نفع پہنچا سکتی ہیں' نہ نقصان دور کر سکتی ہیں۔

رہا تعویذ یعنی کاغذ پر کچھ لکھ کر گلے میں ڈالنا تو اس کا وجود رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے معلوم نہیں۔ یہ چیز بعد میں شروع ہوئی ہے۔ اس لیے قرآن و سنت کی روشنی میں اس پر غور کرنا ہو گا۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ اگر تعویذ میں اللہ کے علاوہ کسی اور سے مدد مانگی گئی ہو یا غیر کا نام یا ہندسے لکھ کر گلے میں ڈالے جائیں تو یہ صریح شرک ہے اور ایسا کرنے والا مشرک ہے۔ اسے امام بنانا جائز نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غَافِلُوْنَ ﴾ (احقاف : ۵)

"اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو اللہ کے علاوہ ایسے لوگوں کو پکارتا ہے۔ جو قیامت کے دن تک اس بات کا جواب نہیں دے سکتے اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں"۔

البتہ اگر کوئی شخص اللہ کا نام یا قرآن مجید کی آیت لکھ کر گلے میں لٹکائے تو اسے شرک کہنا درست نہیں۔ کیونکہ اس میں اس نے کسی غیر سے مدد نہیں مانگی۔ اگر کوئی کہے کہ اس نے کاغذ گلے میں لٹکایا ہے تو یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ تعویذ لکھنے والا یا گلے میں ڈالنے والا کوئی موحد کاغذ میں نفع نقصان کی کوئی تاثیر نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس کاغذ میں لکھے ہوئے اللہ کے نام یا اس کے کلام کی برکت سے شفا کا عقیدہ رکھتا ہے۔ اللہ کا کلام دَم کی صورت میں انسانی آواز میں ادا ہو تب بھی اللہ کا کلام اور اس کی صفت ہے اور غیر مخلوق ہے اور انسانی قلم و دوات سے کاغذ پر لکھا جاتا ہے تب بھی اللہ کا کلام اس کی صفت اور غیر مخلوق ہے' اس لیے جو لوگ اسے شرک قرار دیتے ہیں' ان کی بات بالکل بے دلیل ہے اور وہ غلو کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ البتہ یہ طریقہ چونکہ رسول اللہ کے زمانے میں نہ تھا اس لیے سلف صالحین میں اس کے جواز کے متعلق اختلاف ہے (دیکھئے فتح المجید باب ماجاء فی الرقی والتمائم)

جواز کے قائلین اسے علاج کی ایک صورت قرار دیتے ہیں جس میں کوئی شرک نہیں اور شرک سے پاک دَم کی طرح اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ منع کرنے والے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قرآن مجید لکھواتے تھے' بعض اوقات احادیث بھی لکھواتے تھے۔ لوگوں کے علاج اور شفا کیلئے آپؐ تعویذ لکھوا کر دور دراز بھیج سکتے تھے اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ مگر ضرورت کے باوجود آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے جائز نہیں۔

ہمیں صرف دم پر اکتفا کرنا چاہئے۔ اگر غور کیا جائے تو یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے دم پر اکتفا کیا ہے تو ہمیں بھی اسی پر اکتفا کرنا چاہئے۔ لیکن کوئی توحید والا شخص اگر قرآنی تعویذ اللہ کے اسماء وصفات پر مشتمل تعویذ لکھتا ہے۔ تو بے شک اس کا ہمارے ساتھ سوچ میں اختلاف ہے' مگر اسے نہ مشرک کہہ سکتے ہیں' نہ اس کے پیچھے نماز چھوڑی جا سکتی ہے۔ اختلاف سلف صالحین رحمہم اللہ میں بھی ہوتا تھا مگر ان میں سے کسی نے ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں چھوڑی۔ ہم اپنے بھائیوں کو دلائل سے قائل کرنے کی پوری کوشش کریں گے' مگر اجتہادی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کا اتفاق پارہ پارہ ہو' اس کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

كتاب

الصَّيْدِ وَالذَّبَائِحِ

کیا خرگوش حلال ہے؟

س: خرگوش کے حلال ہونے کے متعلق قرآن و احادیث سے وضاحت کریں۔ (محمد شفیق سلفی، فیصل آباد)

ج: خرگوش کی حلت کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الذبائح بخاری میں باب الارنب ذکر کیا ہے اور یہ حدیث درج کی ہے:

((عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اَنْفَجْنَا اَرْنَبًا وَّنَحْنُ بِمَرِّ الظَّهْرَانِ فَسَعَى الْقَوْمُ فَلَغِبُوْا فَاَخَذْتُهَا فَجِئْتُ بِهَا اِلَى اَبِي طَلْحَةَ فَذَبَحَهَا فَبَعَثَ بِوَرِكَيْهَا اَوْ قَالَ بِفَخِذَيْهَا اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَبِلَهَا)) (بخاری باب الارنب ۳/ ۸۴)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا ہم نے ایک خرگوش کو مرظہران میں دوڑایا لوگ اس کے پیچھے دوڑے مگر تھک کر رہ گئے (پکڑ نہ سکے) آخر میں اس کو پکڑ کر ابو طلحہ کے پاس لایا انہوں نے اس کو ذبح کیا اور اس کی سرین یا رانیں آپ کے پاس بھیجیں، آپ نے قبول کیں"

امام قسطلانی رحمہ اللہ بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

"وَهُوَ مَذْهَبُ الْاَئِمَّةِ الْاَرْبَعَةِ وَحَدِيْثُ الْبَابِ حُجَّةٌ لِّلْجُمْهُوْرِ فِي الْاَبَاحَةِ۔"

"خرگوش کی حلت کے بارے میں ائمہ اربعہ کا بھی یہی مسلک ہے اور اس باب کی حدیث جمہور محدثین کے لیے خرگوش کی حلت میں حجت ہے"

(ارشاد الساری ۸/ ۲۹۲) (مجلۃ الدعوۃ، دسمبر/ ۱۹۹۳ء)

برائلر مرغی کھانا حلال ہے یا حرام؟

س: برائلر مرغی کھانا کیسا ہے؟ بعض لوگ اسے حرام قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کی خوراک خون اور مردار اور دوسری کئی اشیاء سے تیار ہوتی ہے۔ لاکھوں

لوگوں کے لیے یہ مسئلہ پریشانی کا سبب بنا ہوا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ (محمد اجمل چاند' لاہور کینٹ)

ج اصل جواب سمجھنے سے پہلے دو باتیں سمجھنا بہت ضروری ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حلت اور حرمت ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ جن کا تعلق انسان کے ذوق اور مزاج کے ساتھ ہو۔ جسے انسانی ذوق چاہے اس کو حلال اور جسے چاہے حرام سمجھ لے بلکہ یہ آسمانی شریعت ہے جس کا خالق کائنات نے اپنے بندوں کو مُکلف بنایا ہے۔ اس لیے حلال وہی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یا محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان پر حلال کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴾ (النحل : ۱۱۶)

"اور اپنی زُبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے یہ مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھو یقیناً وہ کامیاب نہیں ہوں گے جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔"

دوسری بات یہ ہے کہ حلال اور حرام عقل کے تابع نہیں اور نہ ہی قیاسات اور مادی وسائل سے ان کا اثبات کیا جا سکتا ہے اور جو لوگ اسے مادی وسائل اور عقل کے تابع بناتے ہیں وہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے گھوڑے کے گوشت کو حلال قرار دیا ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے اور خچر کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ دونوں جانور شکل و صورت میں کھانے پینے اور پیدائش میں ایک دوسرے کی مشابہت رکھتے ہیں البتہ شکل میں تھوڑا فرق پایا جاتا ہے۔ اسی طرح گھریلو گدھا اور جنگلی گدھا دونوں کو شریعت میں حمار (گدھا) کہا گیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مشابہت بھی رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود گھریلو گدھے کا گوشت حرام ہے اور جنگلی گدھے کا گوشت حلال

ہے۔ اگر اہل علم اور ان اشیاء کے سپیشلسٹ گھوڑے اور جنگلی گدھے کے حلال ہونے میں اور خچر اور گھریلو گدھے کے حرام ہونے میں فرق معلوم کرنے کی کوشش کریں تو ہرگز شرعی علت تک نہ پہنچ سکیں گے حالانکہ یہ اشیاء مادی اور حسی وسائل کے لحاظ سے ایک ہی چیز شمار ہوتی ہیں۔ کون ہے جو مادی لحاظ سے ان کی حلت اور حرمت کی علت بیان کر سکے؟ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حلال اور حرام آسمانی شریعت ہے مادی' حسی اور عقلی وسائل کے تابع نہیں۔ یہ دونوں باتیں ذہن نشین کرنے کے بعد اب جواب کی طرف آیئے۔ قرآن مجید اور سنت نبوی (ﷺ) میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے برائلر مرغی کا حرام ہونا ثابت ہو سکے بلکہ حدیث سے مرغی کا حلال ہونا ثابت ہے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

((رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْكُلُ دَجَاجًا))

"میں نے نبی اکرم ﷺ کو مرغی کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا"

(صحیح بخاری مع فتح الباری ج۹' ص ۵۶۱)

یہ حدیث صحیح مسلم' داری' بیہقی اور مسند احمد میں بھی ہے۔ امام بخاری نے اس پر باب باندھا ہے باب لحم الدجاج اور امام ترمذی بھی فرماتے ہیں باب ما جاء فی اکل الدجاج

نبی مکرم تو پاکیزہ کھانا ہی کھاتے تھے اور ایسے کھانے کے قریب تک نہیں جاتے تھے کہ جس میں کراہت ہو۔ نبی مکرم ﷺ کا مرغی کا گوشت کھانا اس کے حلال ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس کے بعد کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ مرغی کے گوشت کو حرام قرار دے۔ صرف اس شبہ سے کہ اس کی خوراک میں حرام چیزیں استعمال ہوتی ہیں کیونکہ حلت اور حرمت میں جانور کی غذا کا اعتبار نہیں بلکہ شریعت کا اعتبار ہے کیونکہ بعض جانور ایسے ہیں کہ جن کی خوراک پھل' سبزیاں اور حلال اشیاء ہیں اس کے باوجود وہ حرام ہیں مثلاً گیدڑ' بندر وغیرہ ایسے جانوروں کو کھانا ہرگز حلال نہیں حالانکہ ان کی خوراک پاکیزہ ہوتی ہے مگر شریعت نے انہیں حرام قرار دیا ہے۔

اگر حرام اور حلال ہونے کی علت جانور کے کھانے (خوراک) کو تسلیم کرلیں کہ جس کی خوراک پاک اور حلال ہو گی اس کا گوشت حلال اور جس کی خوراک نجس اور حرام ہو گی اس کا گوشت حرام ہو گا تو فرض کریں کہ کوئی شخص خنزیر کے بچے کو پیدائش ہی سے گھر میں پالتا ہے اسے حلال اور پاک غذا مہیا کرتا ہے تو کیا وہ حلال ہو جائے گا؟ اگر اس بارے میں کوئی شخص اپنی عقل کو فیصل مانے گا تو اس کے مطابق تو حلال ہو گا کیونکہ اُس نے کبھی حرام اور نجس چیز کھائی ہی نہیں اور اپنا فیصلہ اگر شریعت کی طرف لے جائے گا پھر یہ حرام ہو گا۔

ان تمام دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ حلت اور حرمت میں جانور کی خوراک کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ شریعت کا اعتبار ہو گا۔

شبہ کا رد

جو لوگ برائلر مرغی کو حرام قرار دیتے ہیں وہ اسے جلالہ پر قیاس کرتے ہیں جسے نبی مکرم ﷺ نے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

((نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَكْلِ الْجَلاَّلَةِ وَاَلْبَانِهَا))(ابوداؤد' ترمذی'ابنِ ماجه)

"نبی کریم ﷺ نے جلالہ کے کھانے سے اور ان کے دودھ سے منع کیا ہے"

اس حدیث سے جلالہ کی قطعی حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے استعمال سے اس وقت تک روکا گیا ہے جب تک کہ اس گندی خوراک کی بدبو زائل نہ ہو جیسا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صحیح اثر سے ثابت ہے کہ:

اِنَّهٗ كَانَ يَحْبِسُ الدَّجَاجَةَ الْجَلاَّلَةَ ثَلاَثًا

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جلالہ مرغی کو تین دن بند رکھتے تھے (پھر استعمال کر لیتے تھے)"

(رواہ ابنِ ابی شیبہ)

علامہ ناصرالدین البانی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے' (ارواء الغلیل ج۸' ص

(۱۵۱

یہ صرف اس لیے کرتے تھے تاکہ اس کا پیٹ صاف ہو جائے اور گندگی کی بو اس کے گوشت سے جاتی رہے۔

اگر جلالہ کی حرمت گوشت کی نجاست کی وجہ سے ہوتی تو وہ گوشت جس نے حرام پر نشوونما پائی ہے کسی بھی حال میں پاک نہ ہوتا۔ جیسا کہ ابنِ قدامہ نے کہا ہے "وَلَوْ نَجَسَتِ الْجَلاَّلَةُ لَمَا طَهُرَتْ بِالْحَبْسِ" کہ اگر جلالہ نجس ہوتی تو دو تین دن بند کرنے سے بھی کبھی پاک نہ ہوتی۔ (المغنی ج۹، ص ۴۱)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس صحیح اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ جلالہ کی حرمت اس کے گوشت کا نجس اور پلید ہونا نہیں بلکہ علت اس کے گوشت سے گندگی کی بدبو وغیرہ کا آنا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں:

" وَالْمُعْتَبَرُ فِي جَوَازِ أَكْلِ الْجَلاَّلَةِ زَوَالُ رَائِحَةِ النَّجَاسَةِ إِنْ تُعْلَفُ بِالشَّيْئِ الطَّاهِرِ عَلَى الصَّحِيْحِ" (فتح الباری ج ۹، ص ۵۶۵)

"جلالہ کے کھانے کا لائق ہونے میں معتبر چیز نجاست وغیرہ کی بدبو کا زائل ہونا ہے۔ یعنی جب بدبو زائل ہو جائے تو اس کا کھانا درست ہے"

علامہ صنعانی بھی فرماتے ہیں:

قِيْلَ بَلِ الْاِعْتِبَارُ بِالرَّائِحَةِ وَالنَّتَنِ

"کہ جلالہ کے حلال ہونے میں بدبو کے زائل ہونے کا اعتبار کیا جاتا ہے"

(سبل السلام، ج ۴، ص ۷۷)

جلالہ کے بارے میں اہل لغت کے اقوال جان لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اکثر اہل لغت نے لکھا ہے کہ:

اَلْجَلاَّلَةُ هِيَ الْبَقَرَةُ الَّتِيْ تَتَّبِعُ النَّجَاسَاتِ

"کہ جلالہ وہ گائے ہے جو نجاسات کو تلاش کرتی ہے" (لسان العرب ج ۲، ص ۳۳۶، الصحاح للجوہری ج ۴، ص ۱۶۵۸، القاموس المیط ج ۱، ص ۵۹۱)

ابنِ منظور الافریقی لکھتے ہیں :

وَالْجَلاَّلَةُ مِنَ الْحَيَوَانِ الَّتِي تَأْكُلُ الْجُلَّةَ الْعَذِرَةَ

"کہ جلالہ وہ حیوان جو انسان کا پاخانہ وغیرہ کھاتے ہیں"

(لسان العرب' ج۲' ص ۳۳۶)

اس قول کے مطابق برائلر مرغی جس کو لوگ حرام قرار دیتے ہیں جلالہ بنتی ہی نہیں ہے کیونکہ وہ انسان کا پاخانہ نہیں کھاتی۔ لہٰذا اسے جلالہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس میں جلالہ کی علت نہیں پائی جاتی اور جب علت نہ رہی تو جلالہ والا حکم بھی اس پر نہیں لگ سکتا۔ لہٰذا برائلر مرغی جس کی غذا حلال اور حرام چیزوں کے مرکبات سے تیار ہوتی وہ حلال ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کی غذا کا اعتبار نہیں بلکہ شریعت کا اعتبار ہے۔ آخر میں یہ بات بھی اچھی طرح یاد رہے کہ مرغی کی خوراک میں جو خون مردار اور دوسری حرام اشیاء ڈالی جاتی ہیں اگرچہ یہ انسانوں کے لیے حرام ہیں جانوروں کے لیے حرام نہیں کیونکہ وہ تو مکلف ہی نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے انسانوں کے لیے جن اشیاء کا کھانا حرام قرار دیا ہے ان کی خرید و فروخت بھی (چند ایک جانور چھوڑ کر) حرام قرار دی ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں :

((لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ - ثَلاَثًا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْهِمُ الشُّحُوْمَ فَبَاعُوْهَا وَاَكَلُوْا اَثْمَانَهَا وَاِنَّ اللّٰهَ اِذَا حَرَّمَ عَلٰى قَوْمٍ اَكْلَ شَيْئٍ حَرَّمَ عَلَيْهِمْ ثَمَنَهُ))

"اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت کرے۔ آپ ﷺ نے یہ کلمات تین مرتبہ دہرائے پھر کہا اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی کا کھانا حرام کر دیا تو انہوں نے اسے فروخت کر کے اس کی قیمت استعمال کرنی شروع کر دی اور یقیناً اللہ تعالیٰ جس کسی قوم پر کسی چیز کا کھانا حرام کر دیتا ہے اس کی قیمت بھی ان پر حرام کر دیتا ہے"

(صحیح سنن ابی داؤد للالبانی ج۲' ص ۶۶۷ و احمد)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں :

((إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ الْخَمْرَ وَثَمَنَهَا وَحَرَّمَ الْمَيْتَةَ وَثَمَنَهَا وَحَرَّمَ الْخِنْزِيرَ وَثَمَنَهُ))

"بے شک اللہ نے شراب' مردار' خنزیر کو حرام قرار دیا ہے اور ان کی قیمتیں بھی حرام کی ہیں" (صحیح ابوداؤد' ج۲' ص۶۶۶)

رسول کریم ﷺ کے ان فرامین سے معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کا کھانا انسان کے لیے حرام ہے اُن کی خرید و فروخت کرنا بھی حرام ہے۔ (سوائے چند جانوروں کے جیسے کہ گھریلو گدھا ہے) ایسا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب ہے اور حرام کمائی کھانے اور جمع کرنے میں مصروف ہے۔

ہمارے ان بھائیوں کو چاہئے کہ وہ مرغی کی خوراک تیار کرنے میں حرام اشیاء کی خرید و فروخت سے اجتناب کریں۔ خوراک میں مردار اور خون ڈالنے کی بجائے مچھلی کا چورا ڈال لیں۔ جب حلال چیز کی خرید و فروخت میں کفایہ ہے تو پھر حرام کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو قرآن و سنت پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین از : (ع۔ع) (مجلۃ الدعوۃ' نومبر/ ۱۹۹۴ء)

گھوڑا اور جنگلی گدھا

س مجلہ میں برائلر مرغی والے جواب کے ضمن میں گھوڑے اور جنگلی گدھے کی حلت کے بارے میں اشارہ تھا جس پر بہت زیادہ بھائیوں نے سوالات بھیجے ہیں اور کچھ لوگوں کے طعنوں کا تذکرہ بھی کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی مفصل وضاحت کریں؟ (بہت سے قارئین مجلہ)

ج جنوری ۱۹۹۴ء کے مجلہ میں محترم بھائی مبشر احمد ربانی نے گھوڑے کی حلت کے بارہ میں ایک سوال کا جواب دیا تھا اب بہت زیادہ مطالبہ کے پیش نظر کچھ تفصیل کے ساتھ وہی جواب حاضر ہے۔ گھوڑا حلال ہے اس کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ :

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَهٰی یَوْمَ خَیْبَرَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ وَاَذِنَ فِیْ لُحُوْمِ الْخَیْلِ))

"کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن گدھوں کے گوشت کے بارے میں منع کیا اور گھوڑے کے گوشت کی اجازت دی" (متفق علیہ)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

((اَکَلْنَا لَحْمَ فَرَسٍ عَلٰی عَهْدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ))

"کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ہم نے گھوڑے کا گوشت کھایا" (متفق علیہ)

مصنف ابنِ ابی شیبہ میں صحیح سند سے مروی ہے کہ عطاء بن ابی رباح سے ابنِ جریج نے گھوڑے کے گوشت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا:

((لَمْ یَزَلْ سَلَفُكَ یَاْكُلُوْنَهٗ؟ قُلْتُ: اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: نَعَمْ))

"کیا آپ کے سلف ہمیشہ اس کو کھاتے رہے ہیں؟ میں نے کہا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم؟ تو انہوں نے کہا ہاں" (مصنف ابنِ ابی شیبہ ج۸' ص ۲۵۰)

امام صلاح الدین خلیل بن کیکلدی العلائی نے اپنی کتاب توفیة الکیل لمن حرم لحوم الخیل میں لکھا ہے کہ جمہور سلف و خلف ائمہ محدثین سوید بن غفلہ' علقمہ بن اسود اصحاب عبداللہ بن مسعود' ابراہیم نخعی' شریح' سعید بن جبیر' حسن بصری' ابنِ شہاب زہری' حماد بن ابی سلیمان' امام شافعی' احمد بن حنبل' قاضی ابویوسف' محمد بن حسن الشیبانی' اسحاق بن راہویہ' داؤد ظاہری' عبداللہ بن مبارک اور جمہور اہل حدیث کے نزدیک گھوڑا حلال ہے۔ اس کی حلت میں کوئی شک و شبہ نہیں صرف امام ابوحنیفہ اور بعض مالکیوں نے اسے حرام یا مکروہ کہا تھا۔

ہمارے ملک میں چونکہ ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو امام ابوحنیفہ کے مقلد ہیں اور ان کے ہاں گھوڑا حرام سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے جب اس کی حلت کی بات کی جاتی ہے تو اسے بڑا عجیب سمجھا جاتا ہے اور لوگ مختلف انداز سے اس کے متعلق

سوال کرتے ہیں حالانکہ موجودہ دور میں کئی حرام اشیاء مثلاً سود' شراب' جو اغیر اللہ کے نام پر دی ہوئی اشیاء وغیرہ لوگ سرعام استعمال کرتے ہیں اور ان پر کبھی اتنے سوال نہیں اٹھائے جاتے صرف اس لئے کہ یہ چیزیں لوگوں کی ہڈیوں میں رچ چکی ہیں اور جونہی کسی ایسی چیز کی حلت کے متعلق سوال ہو جو ان کے ہاں غیر معروف ہو تو بلاسوچے سمجھے اس پر حرمت کا فتویٰ جڑ کر تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے ابو یوسف اور امام محمد اس کی حلت کے قائل ہیں۔ جیسا کہ امام طحاوی حنفی کا قول ہے فتح الباری ج ۹' ص ۵۶۰ اور فقہ حنفی کی معروف کتاب منیہ المصلی اردو میں جوٹھے پانیوں کے بیان میں لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی گھوڑے کے جھوٹے پانی میں چار روایات ہیں۔ ایک میں نجس ایک میں مشکوک اور ایک میں مکروہ اور ایک میں پاک ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک پاک ہے اس واسطے کہ اس کا گوشت حلال ہے۔ کنز الدقائق فارسی مترجم ملا نصیر الدین کرمانی میں ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے :

((نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ))

''کہ نبی کریم ﷺ نے گدھے' گھوڑے اور خچر کے گوشت سے منع کیا''۔

لیکن یہ حدیث ضعیف ہے اس میں عکرمہ بن عمار یحییٰ بن ابی کثیر سے بیان کرتا ہے جب یہ عکرمہ یحییٰ سے بیان کرے تو حدیث ضعیف ہوتی ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں : اَحَادِیْثُہٗ عَنْ یَحْیٰی بْنِ اَبِیْ کَثِیْرٍ ضَعِیْفٌ کہ اس کی حدیثیں یحییٰ بن ابی کثیر سے ضعیف ہیں۔ امام بخاری کہتے ہیں حَدِیْثُہٗ عَنْ یَحْیٰی مُضْطَرِبٌ کہ یحییٰ سے اس کی حدیث مضطرب ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں لَیْسَ بِہٖ بَاْسٌ اِلاَّ فِیْ یَحْیٰی کہ سوائے یحییٰ کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح گھوڑے کے گوشت کی حرمت میں خالد بن ولید کی بھی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے وہ حدیث بھی شاذ اور منکر ہے۔ پھر اس حدیث میں یہ ہے کہ خالد خیبر میں شریک ہوئے حالانکہ وہ خیبر کے

بعد مسلمان ہوئے تھے۔

جنگلی گدھے کے بارے میں بھی صحیح بخاری شریف میں حدیث ہے۔ ابو قتادہ کہتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ کچھ ہم میں احرام پہنے ہوئے اور کچھ بغیر احرام کے تھے... میں نے ایک جنگلی گدھا شکار کیا اور اپنے ساتھیوں کے پاس لے آیا۔

((فَقَالَ بَعْضُهُمْ كُلُوْا وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا تَأْكُلُوْا فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ أَمَامَنَا فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ كُلُوا حَلَالاً.))

"بعض نے کہا کھالو بعض نے کہا نہ کھاؤ میں نبی کریم (ﷺ) کے پاس آیا جو ہمارے آگے تھے اور پوچھا تو آپ نے فرمایا اس کو کھالو۔ یہ حلال ہے۔"

(بخاری مع الفتح ۳۵/۴)

حافظ ابنِ حجر نے امام طحاوی حنفی کا قول نقل کیا ہے' فرماتے ہیں :

قَالَ الطَّحَاوِيُّ وَقَدْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى حِلِّ الْحِمَارِ الْوَحْشِيِّ

"کہ علماء کا جنگلی گدھے کے حلال ہونے پر اجماع ہے" (فتح الباری ۶۵۶/۱)

یہ بھی یاد رہے کہ جنگلی گدھا ایک اور جانور ہے نام میں اشتراک کی وجہ سے اسے گھریلو گدھا نہ سمجھا جائے۔ بقول ابی یوسف اور محمد و شافعی "بخوردن گوشت اسپ باکے نیست"۔ ابو یوسف محمد اور امام شافعی کے نزدیک گھوڑے کے گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

مولوی ثناء اللہ امرتسری پانی پتی حنفی نے اپنی کتاب مَالَا بُدَّ مِنْهُ کے صفحہ ۱۱۰ پر لکھا ہے "اسپ حلال است" گھوڑا حلال ہے۔ مولوی اشرف علی تھانوی بھی دبی زبان میں گھوڑے کی حلت کا اقرار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "گھوڑی کا کھانا جائز ہے لیکن بہتر نہیں" (بہشتی زیور حصہ سوم' ص ۵۶) بلکہ خود امام ابو حنیفہ نے اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا اور گھوڑے کی حلت کے قائل ہو گئے تھے۔ علامہ آلوسی حنفی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں نقل کیا ہے کہ :

"اِنَّهٗ رَجَعَ عَنْ حُرْمَتِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِثَلَاثَةِ اَيَّامٍ وَ عَلَيْهِ الْفَتْوٰى۔"

"کہ امام ابو حنیفہ نے اپنی وفات سے تین دن قبل گھوڑے کی حرمت سے رجوع کر لیا تھا اور اسی قول پر فتویٰ ہے"

جامع الرموز 'کتاب الذبائح' ج۳' ص ۳۵۰ میں ہے:

"اِنَّهٗ رَجَعَ عَنْ حُرْمَتِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِثَلَاثَةِ اَيَّامٍ عَنْ حُرْمَةِ لَحْمِهٖ وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى۔"

بات ختم کرنے سے پہلے چند شبہات کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ قرآن مجید کی آیت ﴿ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ﴾ کہ گھوڑے خچر اور گدھوں کو سواری کے لیے زینت بنایا ہے' سے گھوڑے کی حرمت پر استدلال کرتے ہیں لیکن یہ درست نہیں کیونکہ یہ بالاتفاق مکی ہے اور گھوڑے کی حلت کا حکم مدنی ہے۔ ہجرت سے تقریباً ۶ سال بعد کا اگر نبی کریم اس آیت سے گھوڑے کی حرمت سمجھتے تو اس کی اجازت کبھی نہ دیتے۔ پھر یہ آیت گھوڑے کی حرمت میں نص بھی نہیں اور حدیث میں اس کی حلت کی صراحت موجود ہے۔ از: (ع۔ ع)

نوٹ: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا اپنے سابقہ موقف سے رجوع رد المختار ۹/ ۴۴۲' طبع بیروت 'کتاب الذبائح میں بھی موجود ہے۔ (ابو الحسن)
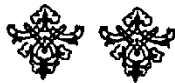
كتاب

الْأُضْحِيَةِ

قربانی کے متعلق احادیث کی تحقیق

س: ماہِ جون کے شمارے میں قربانی کے احکامات اور فضائل دیئے گئے ہیں ان میں سے ایک حدیث میت کی قربانی کے حکم کے سلسلے میں لکھی ہوئی ہے۔

ترمذی شریف میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کیا کرتے تھے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد مجھے قربانی کرنے کی وصیت فرمائی تھی معلوم ہوا کہ میت کی طرف سے قربانی کرنا مشروع اور جائز ہے۔ اس حدیث کے بارے میں وضاحت درکار ہے کہ آیا یہ حدیث ضعیف تو نہیں؟ اگر ضعیف ہے تو آئندہ شمارے میں اس کی وضاحت فرمادیں۔

(سیف اللہ' سوشل سیکورٹی ہسپتال فیصل آباد)

ج: مذکورہ بالا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روایت جو سنن ابوداؤد ۴۹/۳ اور ترمذی ۸۴/۴ پر مروی ہے انتہائی ضعیف ہے۔ اس روایت کے ضعیف ہونے کے اسباب درج ذیل ہیں۔

۱) امام ترمذی نے اس روایت کے نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ هٰذَا الْحَدِيْثُ غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ شَرِيْكٍ یہ حدیث غریب ہے ہم اسے شریک کے واسطے کے علاوہ کسی اور واسطے سے نہیں پہچانتے اور شریک بن عبداللہ القاضی کا حافظہ متغیر ہو گیا تھا۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی تقریب التہذیب ۱۴۵ پر فرماتے ہیں: صَدُوْقٌ يُّخْطِئُ كَثِيْرًا تَغَيَّرَ حِفْظُهُ مُنْذُ وَلِيَ الْقَضَاءَ بِالْكُوْفَةِ "سچا ہے لیکن کثرت سے غلطیاں کرتا ہے اور جب سے اسے کوفہ کا قاضی بنایا گیا اس کا حافظہ متغیر ہو گیا تھا"

امام مسلم نے صرف متابعت میں اس کی روایات نقل کی ہیں ان سے احتجاج نہیں کیا۔

۲) اس روایت کی سند میں دوسری خرابی یہ ہے کہ شریک ابوالحسناء سے

روایت کرتا ہے اور یہ مجہول راوی ہے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ یہ کون ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی تقریب ۴۰۱ پر رقم طراز ہیں کہ : مَجْهُوْلٌ مِّنَ السَّابِعَةِ

۳) تیسری خرابی یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرنا والا حنش ہے جو ابوالمعتمر الکنانی ہے۔ یہ راوی بھی متکلم فیہ ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے تقریب ۸۵ پر لکھا ہے کہ : صَدُوْقٌ لَّهٗ اَوْهَامٌ وَّيُرْسِلُ "سچا ہے لیکن اس کی روایات میں وہم ہوتا ہے اور مرسل روایات بیان کرتا ہے"۔

امام ابنِ حبان فرماتے ہیں کہ یہ کثیر الوہم ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بعض روایات نقل کرنے میں منفرد ہے اور قابل حجت نہیں ہے۔

(عون المعبود مع ابوداؤد ۵۱/۳)

اس بحث سے معلوم ہوا کہ یہ روایت سخت ضعیف ہے اور قابل حجت نہیں۔

نوٹ : اس کے علاوہ اسی مضمون کی ایک روایت ((عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِي قَالَ سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ)) (ابن ماجہ (۳۱۲۸) ۱۰۴۵/۲ بھی انتہائی ضعیف ہے بلکہ موضوع ہے۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

۱) اس کی سند میں عائذ اللہ المجاشعی ہے جس کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ (لَا يَصِحُّ حَدِيْثُهٗ) "اس کی حدیث صحیح نہیں ہے"۔ امام ابوحاتم نے کہا : (هُوَ مَتْرُوْكُ الْحَدِيْثِ) (تنقیح الرواۃ ۲۸۰/۱) حافظ ان حجر عسقلانی نے فرمایا : ضعیف (تقریب : ۱۶۲)

۲) دوسرا راوی نفیع بن الحارث ابوداؤد میں ہے۔ اس کے بارے میں امام دارقطنی نے فرمایا : هُوَ مَتْرُوْكٌ (تنقیح الرواۃ ۲۸۰/۱) امام ہیثمی نے مجمع الزوائد میں فرمایا : هُوَ مَتْرُوْكٌ وَاتُّهِمَ بِوَضْعِ الْحَدِيْثِ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے فرمایا : مَتْرُوْكٌ وَقَدْ كَذَّبَهُ ابْنُ مَعِيْنٍ (تقریب ۳۵۹) معلوم ہوا کہ نفیع بن الحارث متروک الحدیث اور جھوٹا راوی ہے۔

۳) اس کے علاوہ سلام بن مسکین عائذ اللہ سے روایت کرنے میں بھی منفرد بھی ہے (تنقیح الرواۃ ۱/۲۸۰)

یہ مضمون نگار کی غفلت و تساہل کا نتیجہ ہے کہ اس نے تحقیق نہیں کی۔ اور مجلّہ الدعوۃ میں روایت طبع ہونے پر ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں' اُمید ہے کہ قارئین ہماری اس لغزش کو معاف کر دیں گے۔ (مجلّۃ الدعوۃ' اگست / ۱۹۹۲ء)

قربانی کے احکام

س قربانی کی اسلام میں کیا اہمیت ہے۔ اس سے متعلق مسائل واضح کیجیے۔

ج آج سے کئی ہزار سال قبل عرب کے لق و دق صحرائی میدان میں سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے فرزند ارجمند (علیہ السلام) کو اللہ کی رضا کی خاطر پیشانی کے بل ذبح کرنے کے لیے لٹایا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیغمبر کا امتحان مقصود تھا۔ ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ اللہ کی طرف سے پیغام آیا :

﴿ يَا اِبْرَاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

(الصّٰفّٰت : ۱۰۵)

"اے ابراہیم تو نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ بے شک ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے والوں کا یہ ترانہ ہوتا ہے :

﴿ اِنَّ صَلٰوتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ ﴾

(الانعام)

"بلاشبہ میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے"۔

باپ بیٹے کی یہ یادگار قربانی کی صورت کئی ہزار سال سے جاری و ساری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قربانی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اللہ کی رضا کی خاطر

اپنی عزیز ترین متاع کو بھی اس کے راستے میں قربان کر دے۔ کیونکہ جانوروں کا گوشت پوست اور کھالیں اللہ تعالیٰ کو نہیں پہنچتیں بلکہ اس سے تو انسان کے دل کا خوف اور ڈر مقصود ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاءُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾

"اللہ تعالیٰ کو قربانی کا گوشت اور اس کا خون ہرگز نہیں پہنچتا لیکن اس کے ہاں تو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے"۔

قربانی کی اہمیت

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ مَنْ وَّجَدَ سَعَةً فَلَمْ یُضَحِّ فَلَا یَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا))

"سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص قربانی کی طاقت رکھنے کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ آئے"۔ (مسند احمد ۲/۳۲۱، ترغیب وترہیب ۲/۱۰۰، ابن ماجہ (۳۱۲۳) ۲/۱۰۴۴، نیل الاوطار ۵/۱۹۵)

یہ روایت مرفوعا بھی مروی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ قول صحابی رضی اللہ عنہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا معمول

((عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُضَحِّیْ بِکَبْشٍ اَقْرَنَ فَحِیْلٍ یَّنْظُرُ فِیْ سَوَادٍ وَّیَاْکُلُ فِیْ سَوَادٍ وَّ یَمْشِیْ فِیْ سَوَادٍ))

"رسول اللہ ﷺ ایسا مینڈھا ذبح کرتے جو موٹا تازہ سینگوں والا ہوتا تھا جس کی آنکھیں منہ اور ٹانگیں سیاہ ہوتیں"۔

(ترمذی ۱/۲۸۳، ابن ماجہ (۳۱۲۸) ۲/۱۰۴۶، ابوداؤد ۲۷۹۶)

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرَ سِنِيْنَ يُضَحِّي))[1]

"سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سال مدینہ میں قیام فرمایا اور ہر سال قربانی کی"۔ ترمذی (۱۵۱۲) ۳/۱۶۹' مسند احمد ۲/۳۸

((عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَذْبَحُوا اِلاَّ مُسِنَّةً اِلاَّ اَنْ يُّعْسَرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوْا جَذْعَةً مِّنَ الضَّانِ))

"سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صرف دو دانتا جانور کی قربانی کرو۔ اگر ایسا جانور نہ مل سکے تو پھر جذعہ ذبح کر لو" (ابوداؤد ۲۷۹۴' مسلم کتاب الاضاحی' نسائی ۷/۲۱۸' ابنِ ماجہ (۳۱۴۱) ۱/۱۰۴۹' مسند احمد ۳/۳۱۲۔۳۲۷)

لغت عرب میں مسنہ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دودھ کے دانت ٹوٹ کر اگلے دانت نکل آویں۔ (مجمع البحار ۱۴۸) لفظ مسنہ سن سے مشتق ہے جس کے معنی دانت ہیں مسنہ بمعنی سال سے مشتق نہیں۔

وہ جانور جن کی قربانی جائز نہیں

((عَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْاُذُنَ وَاَلاَّ نُضَحِّيَ بِمُقَابَلَةٍ وَّلَا مُدَابَرَةٍ وَّلَا شَرْقَاءَ وَلَا خَرْقَاءَ))

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا: ہم جانور کی آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھیں اور ہم ایسا جانور ذبح نہ کریں جس کا کان اوپر سے کٹا یا نیچے سے کٹا ہو۔ جس کے کان لمبائی میں چرے ہوئے ہوں یا جس کے کان میں گول سوراخ ہو"۔ (ترمذی ۱/۲۸۳' ابوداؤد (۲۸۰۴)' نسائی ۷/۲۱۶' دارمی ۲/۷۷' ابنِ ماجہ (۳۱۴۲۔۳۱۴۳)' مسند احمد ۱/۸۰'۹۰'۱۰۱'۱۰۵'۱۰۸)

---

[1] اسکی سند میں حجاج بن ارطاۃ مدلس ہے اور اس کے عنعنہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ (ابو طاہر)

یہ روایت وَالْأُذُنَ تک مرفوع ہے آگے کانوں کی وضاحت راوی کا قول ہے۔

((عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ مَا ذَا يُتَّقٰى مِنَ الضَّحَايَا اَشَارَ بِيَدِهٖ فَقَالَ اَرْبَعًا۔ اَلْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ظَلْعُهَا وَالْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوَرُهَا وَالْمَرِيْضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا وَالْعَجْفَاءُ الَّتِيْ لَا تُنْقِيْ))

"براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا: کس جانور کی قربانی کرنے سے بچا جائے؟ آپ نے ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا چار قسم کے جانوروں کی قربانی منع ہے۔ ۱) لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔ ۲) کانا (بھینگا) جانور جس کا کانا پن ظاہر ہو۔ ۳) بیمار جس کی بیماری واضح ہو۔ ۴) لاغر جانور جس کی ہڈیوں میں بالکل گودا نہ ہو"۔ (موطا ۲/ ۴۸۲، دارمی ۲/ ۷۷، ترمذی ۱/ ۲۸۳، نسائی ۷/ ۲۱۴، ابن ماجہ (۳۱۴۴)، مسند احمد ۴/ ۲۸۴۔۲۸۹)

قربانی کا وقت اور جگہ

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْبَحُ وَيَنْحَرُ بِالْمُصَلّٰى))

"ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید گاہ میں قربانی کا جانور ذبح کرتے تھے"۔ (بخاری)

((عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِ مَنْ كَانَ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَلْيُعِدْ.)) مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

وَلِلْبُخَارِيِّ ((مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَاِنَّمَا يَذْبَحُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَقَدْ تَمَّ نُسُكُهٗ وَاَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ.))

"سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے نماز عید سے قبل قربانی کا جانور ذبح کیا وہ دوبارہ قربانی کرے۔ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: جس نے نمازِ عید سے قبل قربانی کا جانور ذبح کیا وہ اسے اپنے لیے ذبح کرتا ہے اور

جس نے نماز کے بعد ذبح کیا اس کی قربانی پوری ہو گئی اور اس نے مسلمانوں کے طریقے کو اپنایا"۔

جانور خود ذبح کریں

قربانی کا جانور خود ذبح کرنا چاہیے اللہ کے رسول ﷺ خود اپنے ہاتھ سے قربانی ذبح کیا کرتے تھے۔ قربانی پورے گھر کی طرف سے ایک ہی کفایت کر جاتی ہے۔

((عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سَأَلْتُ اَبَا اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِيَّ كَيْفَ كَانَتِ الضَّحَايَا فِيْكُمْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ قَالَ كَانَ الرَّجُلُ فِي عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُضَحِّي بِالشَّاةِ عَنْهُ وَعَنْ اَهْلِ بَيْتِهِ فَيَاْكُلُوْنَ وَيُطْعِمُوْنَ))

"عطاء بن یسار کہتے ہیں میں نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قربانی کیسے ہوتی تھی تو انہوں نے فرمایا : "نبی کریم ﷺ کے زمانے میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک ایک قربانی کرتا تھا"۔ (ابن ماجہ (۳۱۴۷) ۲/۱۰۵۱)

قربانی کی کھالوں کا مصرف

((عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ اَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَقُوْمَ عَلٰى بُدْنِهِ وَاَنْ اَتَصَدَّقَ بِلُحُوْمِهَا وَجُلُوْدِهَا وَاَجِلَّتِهَا وَاَنْ لَّا اُعْطِيَ الْجَزَّارَ مِنْهَا شَيْئًا وَّقَالَ نَحْنُ نُعْطِيْهِ مِنْ عِنْدِنَا)) ۔

"سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ میں آپ کی قربانیوں کی نگرانی کروں اور ان کا گوشت کھالیں اور جلیں صدقہ کر دوں اور ان میں سے قصاب کو کچھ نہ دوں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہم قصاب کو اپنے گرہ سے اس کی اجرت دیتے تھے"۔

((عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ قَتَادَةَ بْنَ النُّعْمَانِ اَخْبَرَهٗ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَامَ فَقَالَ اِنِّیْ کُنْتُ اَمَرْتُکُمْ اَنْ لاَّ تَاْکُلُوْا لُحُوْمَ الْاَضَاحِیْ فَوْقَ ثَلَاثَةِ اَیَّامٍ وَّ کُلُوا وَتَصَدَّقُوْا وَاسْتَمْتِعُوْا بِجُلُوْدِهَا وَلَا تَبِیْعُوْهَا وَاِنْ اَطْعَمْتُمْ مِنْ لُحُوْمِهَا شَیْئًا فَکُلُوا اَنّٰی شِئْتُمْ))

"قتادہ بن نعمان بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تم کو قربانیوں کا گوشت تین دنوں سے اوپر کھانے سے روکا تھا۔ اب تم ان کا گوشت کھاؤ اور صدقہ کرو۔ ان کی کھالوں سے فائدہ حاصل کرو اور ان کو نہ بیچو"۔

چنانچہ قربانی کی کھالیں صدقہ و خیرات طلبہ اور مجاہدین وغیرہ کی مد میں صرف کی جا سکتی ہیں۔ (مجلۃ الدعوۃ' جون / ۱۹۹۳ء)

نمازِ عید سے قبل قربانی اور گاؤں میں عید پڑھنا

س: نمازِ عید سے قبل قربانی کی جا سکتی ہے یا نہیں میں نے ایک دیوبندی مولوی صاحب سے پوچھا تو اس نے کہا کہ گاؤں میں چونکہ عید جائز نہیں' اس لئے قربانی درست ہے۔ میں نے کہا پھر بعد میں نماز پڑھ لے تو اس نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک بریلوی صاحب نے بھی ایسا ہی فتویٰ دیا۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔ (عبدالعزیز' سندھ)

ج: نمازِ عید سے قبل قربانی کا جانور ذبح کرنے سے قربانی نہیں ہوتی جیسا کہ اللہ کے رسول کی صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ آپ نے فرمایا:

((مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَاِنَّمَا یَذْبَحُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَقَدْ تَمَّ نُسُکُهٗ وَاَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِیْنَ))

"جس نے نماز سے پہلے ذبح کر لیا' وہ اپنے لیے ذبح کرتا ہے اور جس نے نماز کے بعد کیا' اس کی قربانی مکمل ہو گئی۔ اور وہ مسلمانوں کے طریقے کو پہنچا ہے"۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ کے الفاظ عام ہیں۔ شہر' بستی اور گاؤں والے سب اس میں داخل ہیں۔ اب تو شہر والوں کے ساتھ خاص کرنے کے لئے

دلیل چاہیے جو صحیح اور صریح نص ہو' لیکن ایسی کوئی صحیح دلیل ہے ہی نہیں۔ احناف چونکہ گاؤں والوں پر نمازِ عید کو واجب نہیں سمجھتے جیسا کہ احناف کی معتبر کتاب ہدایہ میں ہے :

"وَتَجِبُ صَلٰوةُ الْعِيْدِ عَلٰى مَنْ تَجِبُ عَلَيْهِ صَلٰوةُ الْجُمُعَةِ۔"

"کہ نمازِ عید اس شخص پر واجب ہے جس پر جمعہ کی نماز واجب ہے"۔

(ہدایہ اوّلین ص ۱۷۱)

اور جمعہ کے بارے میں یہ لکھا گیا :

لَا تَصِحُّ الْجُمُعَةُ اِلَّا فِى مِصْرٍ جَامِعٍ اَوْ فِى مُصَلَّى الْمِصْرِ وَلَا تَجُوْزُ فِى الْقُرٰى

"کہ جمعہ صرف بڑے شہر یا شہر کی عید گاہ میں صحیح ہے اور بستیوں' دیہاتوں میں جمعہ جائز نہیں ہے"۔ (ہدایہ اوّلین' ص ۱۴۸)

ان دونوں عبارتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ احناف کے نزدیک نہ جمعہ گاؤں میں اور نہ عید پڑھی جا سکتی ہے یہ مذہب بالکل باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے :

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (الجمعة)

"اے ایمان والو' جب جمعہ کے دن نماز کے لیے آواز دی جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑ کر آؤ اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو"۔

یہ آیت کریمہ سب لوگوں کے لیے ہے۔ بڑے چھوٹے شہر' گاؤں اور بستی والوں سب کو یہ حکم ہے' کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اور قرآن و سنت میں کوئی ایسی دلیل بھی نہیں ہے جو اس کی تخصیص کرے کہ یہ صرف بڑے شہر والوں کے لیے ہے اور چھوٹے شہر' گاؤں اور بستی والوں کو یہ حکم نہیں۔ اس کے علاوہ بخاری شریف میں حدیث ہے :

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّهُ قَالَ اِنَّ اَوَّلَ جُمُعَةٍ جُمِّعَتْ بَعْدَ جُمُعَةٍ فِی مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِی مَسْجِدِ عَبْدِ الْقَيْسِ بِجُوَاثٰی مِنَ الْبَحْرَيْنِ))

"کہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں جمعہ کے بعد کا سب سے پہلا جمعہ عبدالقیس کی مسجد بحرین کی جواثی نامی بستی میں پڑھایا گیا۔"

حافظ ابنِ حجر مِنَ الْبَحْرَيْنِ کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"فِی رِوَايَةِ وَكِيعٍ قَرْيَةٌ مِنْ قُرَی الْبَحْرَيْنِ وَفِی اُخْرٰی مِنْ قُرَی عَبْدِ الْقَيْسِ۔"

"ایک روایت میں ہے کہ یہ بحرین کی بستیوں میں سے ایک بستی تھی اور دوسری روایت میں ہے عبدالقیس کی بستیوں میں سے تھی"

یہ بات مسلم ہے کہ عبدالقیس نے نبی کریم ﷺ کے حکم کے بغیر جمعہ نہیں پڑھا۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ عادت نہ تھی کہ وہ نزول وحی کے زمانہ میں اپنی طرف سے شرعی امور کے موجد بن جاتے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی طرف سے یہ کام کر لیا تو قرآن ہی میں نازل ہو جاتا جیسا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عزل کے جواز پر استدلال کیا ہے کہ اگر عزل درست نہ ہوتا تو قرآن نازل ہو جاتا۔ جب اس بارے میں قرآن نازل نہیں ہوا، نبی کریم ﷺ نے اس سے نہیں روکا تو ثابت ہو گیا کہ یہ امر جائز ہے۔ اللہ کے رسول کی ایک صحیح حدیث یہ بھی ہے کہ:

((اَلْجُمُعَةُ وَاجِبٌ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ فِی جَمَاعَةٍ اِلَّا عَلٰی اَرْبَعَةٍ))

"جماعت کے ساتھ جمعہ ہر مسلمان پر واجب ہے سوائے چار آدمیوں کے"

(ابوداؤد)

اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ گاؤں اور بستیوں والے بھی مسلمان ہیں جیسا کہ شہر والے مسلمان ہیں اور جمعہ مسلمان پر واجب ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے جب مدینہ پہنچ کر جمعہ اور عیدین کی نماز شروع کی، اس وقت مدینہ بھی ایک بستی

تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے خود اسے اپنی پاک زبان سے بستی قرار دیا ہے کہ :

((أُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرٰى يَقُوْلُوْنَ يَثْرِبُ وَهِيَ الْمَدِيْنَةُ))

(بخاری و مسلم)

جب نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جمعہ بستی میں پڑھا گیا' خود نبی کریم ﷺ نے بھی جمعہ اور عیدین بستی میں پڑھی ہے تو ہم کون ہوتے ہیں بغیر دلیل شرعی کے ان نصوص کی تخصیص کرنے والے۔ باقی احناف جس اثر سے استدلال کرتے ہیں کہ :

((لَا جُمُعَةَ وَلَا تَشْرِيْقَ وَلَا فِطْرَ وَلَا أَضْحٰى إِلَّا فِيْ مِصْرٍ جَامِعٍ))[1]

(ابن ابی شیبہ ہدایہ اولین ص ۱۶۸)

یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اثر صحیح نہیں ہے' امام نووی کہتے ہیں "مُتَّفَقٌ عَلٰى ضُعْفِهٖ" کہ اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔ امام احمد بن حنبل اور ابن حزم نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس روایت کی سند میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والا حارث اعور کذاب ہے۔ امام شعبی اور علی بن المدینی نے بھی اسے کذاب کہا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں :

كَانَ غَالِيًا فِي التَّشَيُّعِ وَاهِيًا فِي الْحَدِيْثِ

"کہ غالی شیعہ اور حدیث میں بالکل کمزور تھا"

اس کی سند میں جابر جعفی بھی ہے جس کے بارے میں امام ابو حنیفہ کا فیصلہ ہے کہ (مَا رَأَيْتُ أَكْذَبَ مِنْهُ) کہ "میں نے اس سے زیادہ جھوٹا آدمی نہیں دیکھا"۔ اگر اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی یہ قرآن کی آیت اور احادیث کی تخصیص کے لیے کافی نہیں۔ اس لیے کہ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم اس کی مخالفت کرنے والے بھی ہیں۔ خود احناف کے اپنے اصول کے مطابق بھی کتاب اللہ کی تخصیص خبر واحد سے نہیں

---

[1] یہ اثر علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً صحیح سند سے بھی ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو الدرایة فی تخریج احادیث الهدایه لابن حجر عسقلانی ۱/ ۲۱۴ حدیث نمبر ۲۷۵ (ابو طاہر)

ہو سکتی اور یہ تو خبر واحد بھی نہیں ہے۔ تو ثابت ہو گیا کہ جمعہ گاؤں والوں پر بھی واجب ہے اس طرح عید بھی پڑھنی چاہئے اور قربانی عید سے پہلے ہو ہی نہیں سکتی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ احناف نے شہر والوں کے لیے پھر بھی نمازِ عید سے پہلے قربانی ذبح کرنے کا ایک حیلہ ایجاد کر رکھا ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے:

وَحِيْلَةُ الْمِصْرِ إِذَا أَرَادَ التَّعْجِيْلَ أَنْ يَّبْعَثَ بِهَا إِلَى خَارِجِ الْمِصْرِ فَيُضَحِّي بِهَا كَمَا طَلَعَ الْفَجْرُ))

"کہ شہر میں رہنے والا اگر جلدی کرنا چاہتا ہے تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ اپنی قربانی کو کسی گاؤں میں بھیج دے اور وہاں طلوع فجر کے بعد ذبح کر دی جائے اور پھر گوشت شہر میں لا کر استعمال کرے" (ہدایہ اخیرین' ص ۴۴۶)

حیلہ کے استعمال سے صحیح حدیث کے حکم کو ٹالنے کی یہ صورت مچھلی والوں کے ساتھ کس قدر مشابہت رکھتی ہے۔ ہمارے ثقہ بھائیوں نے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بیان کرتے ہیں کہ رائے ونڈ میں تبلیغی جماعت والے اس پر آج بھی عمل کرتے ہیں اور جب عید کی نماز سے فارغ ہو کر واپس آتے ہیں گوشت کھانے کے لیے تیار ہوتا ہے جو کہ پہلے سے ذبح کر کے لایا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ڈرنا چاہئے جو اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث کو اس طرح حیلے بنا کر رد کر دیتے ہیں اور یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ایسی قربانی ہرگز جائز نہیں ہوتی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ واللہ اعلم

از : (ع - ع) (مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۵ء)

مجاہدین کو قربانی کی کھالیں دینا کیسا ہے؟

س قربانی کی کھالوں کا صحیح مصرف کیا ہے؟ بعض علماء کرام اس دور میں اس بات پر بہت زور دے رہے ہیں کہ کھالیں صرف اور صرف مساکین اور محتاجوں کا حق ہے۔ مجاہدین کو قربانی کی کھالیں دینا درست نہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کر کے عند اللہ ماجور ہوں۔ (ابو عبداللہ' نواں لاہور)

ج زندگی کے تمام مسائل کی طرح قربانی کی کھالوں کے مصرف کے لیے بھی ہمیں قرآن و سنت کو دیکھنا ہو گا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا فیصلہ معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں اس پر کاربند رہنا ہو گا اور یہی مومن کی شان ہے۔ قربانی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو حج یا عمرہ کے موقع پر حرم میں کی جاتی ہیں' دوسری وہ جو عید الاضحیٰ کے موقع پر تمام دُنیا کے مسلمان اپنے اپنے گھر میں کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں پہلی قسم کی قربانی کے متعلق فرمایا گیا :

﴿ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ﴾ (الحج : ٣٦)

"تم اس میں سے کھاؤ اور ان کو دو جو مانگتے نہیں اور جو مانگتے ہیں"

دوسری قسم کی قربانی کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((كُلُوْا وَأَطْعِمُوْا وَادَّخِرُوْا))

"کھاؤ اور کھلاؤ اور ذخیرہ کرلو" (بخاری و مسلم بحوالہ نیل الاوطار' ص ۱۲۷' ج ۵)

اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کا گوشت خود بھی کھائے اور احباب و اقرباء اور فقراء و مساکین کو بھی دے۔ قربانی کی کھالوں کا مصرف بھی وہی ہے جو قربانی کے گوشت کا ہے یعنی خود بھی استعمال کر سکتا ہے احباب و اقرباء کو بھی دے سکتا ہے اور صدقہ بھی کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل صحیح مسلم کی حدیث ہے : اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قربانی کے دنوں میں بادیہ والوں کے کچھ گھر مدینہ میں آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین دن کے لیے گوشت رکھ کر باقی صدقہ کر دو۔ جب بعد والا سال گیا تو لوگوں نے کہا : إِنَّ النَّاسَ يَتَّخِذُوْنَ الْأَسْقِيَةَ مِنْ ضَحَايَاهُمْ وَيُجَمِّلُوْنَ مِنْهَا الْوَدَكَ "لوگ اپنی قربانیوں سے مشکیزے بناتے اور چربی پگھلاتے ہیں"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو بات کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا آپ نے تین دن کے بعد قربانی کے گوشت کھانے سے منع فرما دیا۔ آپ نے فرمایا میں نے تو تمہیں صرف ان لوگوں کی وجہ سے منع کیا تھا جو باہر سے آ گئے تھے۔ اب کھاؤ اور ذخیرہ کرو اور صدقہ کرو"۔

(صحیح مسلم کتاب الاضاحی حدیث ۱۹۷۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ گوشت کی طرح کھال خود بھی استعمال کر سکتا ہے۔ دوستوں، رشتہ داروں کو بھی دے سکتا ہے اور صدقہ بھی کر سکتا ہے۔ البتہ دوسری احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے گوشت یا کھال خود فروخت کر کے اس کی رقم استعمال نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر کھال صدقہ کر دے اور گوشت کا زیادہ سے زیادہ حصہ بھی صدقہ کر دے تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حج کے موقع پر ایسا ہی کیا تھا۔ صحیح بخاری میں علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَهُ أَنْ يَقُوْمَ عَلٰى بُدْنِهٖ وَأَنْ يُقْسِمَ بُدْنَهُ كُلَّهَا لُحُوْمَهَا وَجُلُوْدَهَا وَجِلَالَهَا))

"رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ آپ کی قربانیوں کی نگرانی کریں اور تمام قربانیوں کے گوشت اور چمڑے اور ان کے جل تقسیم کر دیں۔"

(صحیح بخاری ۲۳۲' اصح المطابع)

صحیح مسلم میں یہ لفظ ہیں (وَأَنْ أَتَصَدَّقَ بِلَحْمِهَا) یعنی "مجھے حکم دیا کہ میں ان کا گوشت اور چمڑے اور جل صدقہ کر دوں"۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ کھالیں صرف فقراء و مساکین کا حق ہے ان پر لازم ہے کہ مذکورہ بالا احادیث کے مقابلے میں ایسی حدیث پیش کریں کہ جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہو کہ کھالیں صرف فقراء و مساکین کا حق ہے اور ایسی حدیث وہ کبھی بھی پیش نہیں کر سکتے۔ ہمارے جن مہربانوں نے فتویٰ دیا ہے کہ مجاہدین کے لیے کھالیں جائز نہیں اور جن لوگوں نے انہیں کھالیں دی ہیں' ان کی قربانیاں ضائع ہو گئیں انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قربانی کی کھالیں صرف فقراء و مساکین کا حق ہے تب بھی ان کے سب سے زیادہ مستحق مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اللہ کی راہ میں وقف کر دی ہے اور جہاد میں مصروفیت کی وجہ سے کاروبار نہیں کر سکتے۔ خود اللہ تعالیٰ نے صدقات کا مصرف یہ لوگ قرار

دیئے ہیں:

﴿ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ إِلْحَافًا ﴾ (البقرۃ : ۲۷۳)

"صدقات ان فقراء کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ (جہاد) میں روکے ہوئے ہیں' زمین میں (کاروبار وغیرہ) کے لیے سفر نہیں کرسکتے' سوال سے بچنے کی وجہ سے ناواقف انہیں غنی گمان کرتا ہے تو انہیں ان کی علامت سے پہچانے گا۔ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے"
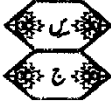
حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ان مہربانوں کو بھی جہاد میں مصروف نوجوانوں کی حالت سے واقفیت نہیں ہے کہ وہ معاشی طور پر کتنے مشکل حالات میں ہیں میں نے خود مرکز الدعوۃ والارشاد کے معسکرات میں دیکھا ہے کہ دورۂ خاصہ کی تین ماہ کی شدید ترین ٹریننگ کے دوران بعض اوقات مرکز کے لیے ایسے مشکل حالات پیش آ جاتے ہیں کہ وہ جہاد کی تربیت میں مصروف نوجوانوں کے لیے اسلحہ اور لباس کا مکمل انتظام بھی نہیں کرسکتے۔ مگر آفرین ہے ان نوجوانوں پر جو بعض اوقات پھٹے پرانے کپڑوں اور سادہ چپل کے ساتھ سخت پہاڑوں پر یہ دورہ مکمل کرتے ہیں مگر نہ اُف کرتے ہیں' نہ حرفِ شکایت زبان پر لاتے ہیں اور نہ ہی کسی سے سوال کرتے ہیں۔ ہاں ناواقف لوگ ان کی خود داری اور چہرے کی چمک دیکھ کر یہی کہتے ہیں کہ ان کے پاس بے شمار دولت ہے۔

تو غور کرنا چاہیے کہ اگر مجاہدین فی سبیل اللہ پر خرچ کرنے سے قربانی ضائع ہوتی ہے تو مدارس کے طلباء پر قربانی کی کھال صرف کرنی کس طرح جائز ہے اور دونوں کا فرق کیا ہے۔ بعض علماء مجاہدین کی مخالفت کرتے ہیں اور مدارس کے لیے کھالیں مانگتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں پر خرچ کرنا چاہیے۔ کھالیں حسب ضرورت مجاہدین اور مدارس سب کو دینی چاہئیں۔ ہم نے کتاب و سنت کی تعلیم دینے والے

مدارس کو ہمیشہ اپنے ادارے سمجھا ہے۔ تعلیم بھی ضروری ہے اور جہاد بھی۔ اسلام کے ایک فریضے کو ماننا اور دوسرے کی مخالفت کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ اگر حقیقت دیکھی جائے تو ان مدارس و مساجد کی حفاظت کے لیے بھی جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف نوجوانوں پر خرچ کرنا لازم ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو سمرقند و بخارا اور ہندوستان و ہسپانیہ کی مساجد و مدارس کا حال ملاحظہ فرمالیں۔ اللہ تعالیٰ حق بات سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

از : (ع۔ ع) (مجلّہ الدعوۃ' جون/ ۱۹۹۵ء)

عقیقہ کرنا کیسا ہے؟

س کیا عقیقہ کرنا سنت سے ثابت ہے؟

ج عقیقہ مشہور لفظ ہے۔ نوزائیدہ بچّے کے ساتویں دن بال مونڈتے وقت جو جانور ذبح کیا جاتا ہے اسے عقیقہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے عقیقہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ سیدہ اُم کرز رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے :

((يَقُولُ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ وَّلَا يَضُرُّكُمْ ذُكْرَانًا كُنَّ أَوْ إِنَاثًا))

"لڑکے کی طرف سے دو بکریاں عقیقہ میں ذبح کرو اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری نر ہو یا مادہ کوئی حرج نہیں"

ابوداؤد اور ترمذی نے اس کو روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔ عقیقہ میں قربانی کی کوئی شرط نہیں یعنی اس میں دوندا (دو دانت والا) ہونا ضروری نہیں۔ (مشکوۃ ص ۳۶۲)

ایک حدیث میں ہے کہ ہر بچّہ اپنے عقیقہ میں گروی ہے ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے یعنی اس کا عقیقہ کیا جائے۔ اس کے سر کے بال منڈوائے جائیں۔ اس حدیث کو احمد' ترمذی' ابوداؤد' نسائی نے روایت کیا ہے۔ (مشکوۃ ص ۳۶۲) اور اس کا نام بھی رکھا جائے اور ایک حدیث میں ہے کہ اس کے

بال چاندی سے تول کر چاندی صدقہ کی جائے (مشکوٰۃ ۳۶۲) یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اس حدیث کی سند اگرچہ غیر صحیح مگر ابنِ حبان اور ابنِ سنی نے صحیح سند کے ساتھ یہی مسئلہ ذکر کیا ہے۔ نسائی میں بھی سند صحیح سے وارد ہے۔ یہ کہنا کہ لڑکی کی طرف سے اگر عقیقہ نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں بلکہ لڑکی کی طرف سے بھی عقیقہ کیا جائے۔ آپ نے لکھا ہے کہ اگر عقیقہ کے جانور کی قیمت اللہ کے واسطے جہاد فنڈ میں بھیج دی جائے تو کیا یہ عمل عقیقہ کے قائم مقام ہو جائے گا۔ جہاد کے لیے صدقہ کرنا بہت افضل ہے۔ مگر عقیقہ کا حکم عقیقہ کرنے سے ہی ادا ہو گا کسی اور فنڈ میں خرچ کرنے سے عقیقہ نہیں ہو گا۔

از : رحمت اللہ ربانی (مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۶ء)

کتاب

الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ

ذکر اور شہادت میں فرق

س: کیا لاَ اِلٰہَ اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ کا وظیفہ یا ذکر کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ قرآن و سنت کی رُو سے وضاحت فرمائیں۔

ج: کلمہ طیبہ پڑھنے کے دو موقع ہیں ایک بطورِ اقرار و شہادت اور دوسرا موقع بطورِ ذکر و عبادت اوّل الذکر موقع پر دونوں اجزاء کو ملا کر پڑھنا لازمی و ضروری ہے کیونکہ ان اجزاء کی شہادت کے بغیر انسان مسلمان نہیں ہو سکتا اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جیسا کہ حدیث جبرائیل میں ہے:

((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.))

"اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں" (متفق علیہ)

لیکن موقع ذکر و عبادت میں فقط لا اِلٰہ اِلاّ اللہ ہی ہے کیونکہ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ تو عبد ہیں معبود نہیں ہیں جیسا کہ عبدہ و رسولہ سے عیاں ہے۔ اور کتب احادیث میں بھی ایسے موقع پر صرف لا اِلٰہ اِلا اللّٰہ ہی آیا ہے جیسا کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ:

((قَالَ مُوْسٰى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رَبِّ عَلِّمْنِيْ شَيْئًا اَذْكُرُكَ وَاَدْعُوْكَ بِهٖ قَالَ قُلْ يَا مُوْسٰى لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ: يَا رَبِّ كُلُّ عِبَادِكَ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا قَالَ يَا مُوْسٰى لَوْ اَنَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَعَامِرَهُنَّ غَيْرِيْ وَالْاَرَضِيْنَ السَّبْعَ فِيْ كِفَّةٍ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فِيْ كِفَّةٍ مَالَتْ بِهِمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ))

"موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے رب مجھے تو کوئی ایسی چیز سکھا جس کے ذریعے میں تیرا ذکر کروں اور تجھے پکاروں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو لا اِلٰہ اِلاّ اللہ کہا کر، موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے رب لا اِلٰہ اِلاّ اللہ تو تیرے تمام بندے کہتے ہیں۔ اللہ

تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اور ان کے باشندے بجز میرے ایک پلڑے میں ہوں اور لا اِلٰہ اِلاّ اللّٰہ ایک پلڑے میں تو لا اِلٰہ اِلاّ اللّٰہ ان پر غالب ہو جائے گا"۔ (رواہ النسائی وابن حبان فی صحیحه والحاکم' الترغیب والترھیب ۴۵۸/۲' وصححه الترمذی وحسّنه)

اس سے معلوم ہوا کہ لا اِلٰہ اِلاّ اللّٰہ ذکر اور دُعا ہے جس پر حدیث کے الفاظ اَذْكُرُكَ بِهٖ وَاَدْعُوْكَ بِهٖ دلالت کرتے ہیں اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

((عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ))

"سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا سب سے افضل ذکر لا اِلٰہ اِلاّ اللّٰہ ہے اور سب سے افضل دُعا الحمد للّٰہ ہے" (رواہ ابنِ ماجه والنسائی وابنِ حبان فی صحیحہ والحاکم والترغیب والترھیب ۴۱۵/۲)

اسی طرح کی اور بھی بے شمار احادیث موجود ہیں جن میں ذکر صرف لا اِلٰہ اِلاّ اللّٰہ کو کہا گیا ہے اور ان میں محمد رسول اللّٰہ کا لفظ نہیں ہے کیونکہ ذکر اللّٰہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور عبادت اس کے علاوہ کسی کی جائز نہیں ہے۔ ہاں اقرار و شہادت کے وقت محمد رسول اللّٰہ کہنا ضروری اور لازمی ہے ورنہ اس کے بغیر ایمان مقبول نہیں ہو گا۔

دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں پر تسبیح شمار کرنا

س: تسبیح گننے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ قرآن و سنت کی رُو سے وضاحت کیجیے۔
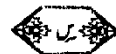
ج: تسبیح شمار کرنے کا جو مروج طریقہ ہے کہ لوگ کھجور کی گٹھلیوں پر یا کنکریوں پر یا دونوں ہاتھوں پر شمار کرتے ہیں اس کا ذکر کسی صحیح حدیث میں موجود نہیں ہے۔ اُنگلیوں پر شمار کرنے کے متعلق رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے:

((اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ النِّسَاءَ اَنْ يَّعْقِدْنَ بِالْاَنَامِلِ

وَاَنَّهُمْ مَسْئُوْلَاتٌ مُسْتَنْطَقَاتٌ))

"آپ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ ہاتھ کی اُنگلیوں سے تسبیح شمار کریں بے شک ان اُنگلیوں سے سوال کیا جائے گا اور یہ بلائی جائیں گی"

یہ روایت ابوداوَد ' مسند احمد اور مستدرک میں موجود ہے۔ امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اسے صحیح کہا ہے یہ حدیث تو مطلق اُنگلیوں پر شمار کرنے کے متعلق تھی اب وہ حدیث ملاحظہ فرمائیں جس میں دائیں ہاتھ کی صراحت موجود ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ :

((رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَعْقِدُ التَّسْبِیْحَ بِیَمِیْنِهٖ))

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ دائیں ہاتھ سے تسبیح گنتے تھے"

(ابوداوَد ۱/۳۳۵' الاذکار للنووی ۲۳' نتائج الافکار ۱/۸۱' عمل الیوم واللیلہ ۸۱۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تسبیح شمار کرتے وقت سنت کے مطابق دائیں ہاتھ پر شمار کرنی چاہیے۔ (مجلۃ الدعوۃ' نومبر/ ۱۹۹۲ء)

كتاب

الْاَطْعِمَةِ

مکھی کا کھانے میں گرنا

س: اگر کھانے میں مکھی گر جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

ج: اگر کسی آدمی کے کھانے میں مکھی گر کر مر جائے تو وہ اسے پورا ڈبو کر نکال دے اور کھانا کھا لے۔ اس کے کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور اس پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي شَرَابِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ ثُمَّ لِيَنْزِعْهُ فَإِنَّ فِي أَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءً وَفِي الْأُخَرِ شِفَاءً.))

"جب کسی آدمی کے مشروب میں مکھی گر جائے تو وہ اسے ڈبو کر نکال دے کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہوتی ہے اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے" (بخاری)

لہذا اگر کسی آدمی کے کھانے یا پینے والی اشیاء میں مکھی گر جائے یا اس کی مثل اور کوئی چیز گرے تو اس کو نکال کر استعمال لانے میں کوئی حرج نہیں۔

(مجلۃ الدعوۃ' جون / ۱۹۹۲ء)

لہسن کھانا کیسا ہے؟

س: بخاری شریف میں ہے:

((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عن أَكْلِ الثُّوْمِ وَعَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ))

"کہ نبی اکرم ﷺ نے خیبر کے دن پالتو گدھوں کے گوشت اور لہسن کھانے سے منع کر دیا"۔ (بخاری)

اس حدیث کے مطابق میں نے لہسن تقریباً آدھا ایکڑ کاشت کیا تھا لیکن جب یہ مسئلہ پڑھا تو سب ضائع کر دیا۔ مگر علماء کہتے ہیں کہ کچا لہسن کھانا مکروہ ہے میری سمجھ کے موافق تو دونوں ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔ کیونکہ کچے لہسن والے الفاظ حدیث میں موجود نہیں' اگر اس بارے میں کوئی واضح ثبوت ہے تو آگاہ کریں۔ نہایت مشکور ہوں گا۔ (حافظ بشیر احمد صدیقی' پاک پتن)

ج بخاری شریف کی جو حدیث آپ نے لکھی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے لہسن سے روکا لیکن یہ نبی کریم ﷺ کا روکنا اس کے حرام ہونے کی وجہ سے نہیں تھا' بلکہ آپ جبریل علیہ السلام سے ملاقات کرتے تھے اور فرشتوں کو اس کی بو سے تکلیف ہوتی تھی تو نبی کریم ﷺ نے یہ پسند نہ کیا کہ میں ان کو تکلیف دوں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے : رسول اللہ ﷺ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مہمان بنے (ہجرت کے وقت) تو اپنا بچا ہوا کھانا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو بھیج دیتے۔ ایک مرتبہ سارا کھانا واپس کر دیا اور اس میں سے کچھ بھی نہ کھایا .... ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے پوچھا تو آپ فرمانے لگے (فِيهِ الثُّوْمُ) "اس میں لہسن ہے"۔ تو ابوایوب فوراً بولے (يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَرَامٌ هُوَ؟) کہ "اے اللہ کے رسول ﷺ کیا یہ حرام ہے؟" تو آپ نے فرمایا :

((لَا وَلٰكِنِّيْ اَكْرَهُهٗ مِنْ اَجْلِ رِيْحِهٖ))

" نہیں حرام نہیں بلکہ میں اس کی بو کی وجہ سے اسے ناپسند کرتا ہوں"

(صحیح سنن الترمذی للالبانی ج ۲' ص ۱۶۰ کتاب الاطعمہ' باب ما جاء فی الرخصہ فی اکل الثُّوْمِ مطبوخا)

دوسری روایت میں یہ لفظ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کہا :

((كُلُوْهُ فَاِنِّيْ لَسْتُ كَاَحَدِكُمْ اِنِّيْ اَخَافُ اَنْ اُوْذِيَ صَاحِبِيْ))

" کہ تم اسے کھالو میں تم جیسا نہیں ہوں (یعنی میرے پاس جبرئیل وحی دینے کے لیے آتا ہے) میں ڈرتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی کو تکلیف نہ دے بیٹھوں"

(قال الالبانی حسن)

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے حرام نہیں قرار دیا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کھانے کے لیے بھی کہا۔ اور اپنے لیے صرف اس لیے ناپسند کیا کہ اس میں بو ہے اور امت کو بھی روک دیا کہ کچا لہسن کھا کر مسجد میں نہ آئیں' کیونکہ فرشتے بھی باجماعت نماز کے لیے حاضر ہوتے ہیں تو انہیں ان کی بو

سے تکلیف ہوتی ہے۔ یا نماز کے وقت سے اتنی دیر پہلے کھا لے کہ نماز کے وقت تک اس کی بو جاتی رہے جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث میں ہے :

((مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا يَقْرَبْنَا حَتّٰى يَذْهَبَ رِيْحُهَا اَوْ رِيْحُهُ))

"کہ جو اس درخت (لہسن) سے کھا لے وہ اس وقت تک ہمارے پاس نہ آئے جب تک اس کی بو ختم نہیں ہو جاتی"۔

(صحیح سنن ابی داؤد کتاب الاطعمہ باب فی اَكَلَ الثُّوْمِ)

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

((مَنْ اَكَلَهُمَا فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا وَقَالَ اِنْ كُنْتُمْ لَا بُدَّ آكِلِيْهِمَا فَاَمِيْتُوْهَا طَبْخًا))

"کہ جو شخص ان دونوں (لہسن اور پیاز) کو کھالے وہ ہماری مسجد کے قریب تک نہ آئے اور کہا اگر تم اس کو ضروری کھانا چاہتے ہو تو پکا کر ان کی بو کو ختم کرلو" (قال الالبانی صحیح)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بھی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

((وَنَهٰى عَنْ اَكْلِ الثُّوْمِ اِلَّا مَطْبُوْخًا))

"کہ نبی کریم ﷺ نے لہسن کھانے سے منع کر دیا سوائے پکے ہوئے کے"

ان سب احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ بخاری شریف کی حدیث میں جو ممانعت ہے، وہ اس کے حرام ہونے کی وجہ سے نہیں، صرف بو کی وجہ سے ہے اور اگر بو پکا کر ختم ہو جائے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ اور عام آدمی ایسے وقت میں استعمال کر سکتا ہے کہ نماز کا وقت ابھی دور ہو اور نماز کے وقت تک اس کی بو ختم ہو سکتی ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم از : (ع ۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ، مئی / ۱۹۹۵ء)

اہل کتاب کے ساتھ کھانا پینا

س: کیا مسلمان عیسائی سے کوئی چیز لے کر یا عیسائی کے ساتھ بیٹھ کر کوئی

چیز کھا سکتا ہے؟

ج اہل کتاب، عیسائیوں اور یہودیوں سے کوئی چیز لے کر کھانا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ﴾

(المائدة : ۵)

"اہل کتاب کا کھانا (ذبیحہ) تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے"۔

اسی آیت میں مزید فرمایا کہ اہل کتاب کی پاک دامن عورتوں سے نکاح تمھارے لیے حلال ہے۔ تو ظاہر ہے بیوی کھانا بھی پکائے گی اور اس کے ساتھ مل کر کھانا کھایا بھی جائے گا۔ البتہ سنن ابوداؤد (حدیث ۳۸۳۹) میں صحیح سند کے ساتھ ابو ثعلبہ خشنی سے روایت ہے کہ "میں نے عرض کی: ہم اہل کتاب کی ہمسائیگی میں رہتے ہیں اور وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر پکاتے اور اپنے برتنوں میں شراب پیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر تمھیں ان کے علاوہ برتن مل جائیں تو انہی میں کھاؤ اور اگر ان کے علاوہ نہ ملیں تو ان کو پانی سے دھولو اور ان میں کھاؤ"۔

(ارواء الغلیل ص ۷۵، ج ۱)

صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرکہ عورت کا مشکیزہ لے کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرمایا کہ خود بھی پیو اور جانوروں کو بھی پلاؤ"۔

(صفحہ ۴۹، ج ۱)

اس حدیث پر حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں: اس حدیث سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ مشرکین کے برتنوں میں اگر نجاست نہ ہو اور اس میں یقین ہو تو ان کا استعمال جائز ہے۔ خلاصہ یہ کہ کسی بھی غیر مسلم سے کھانے کی چیز لے کر کھانا (جس میں نجاست نہ ہونے کا یقین ہو) جائز ہے۔ البتہ ذبیحہ صرف اہل کتاب کا جائز ہے۔ مشرکین کا ذبیحہ جائز نہیں۔ کفار سے لی ہوئی عام اشیاء اگر ان کے پاک ہونے کا یقین

نہ ہو تو وہ کھانا جائز نہیں۔ وہ برتن ضرورت کے بغیر دھونے کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں۔ واللہ اعلم از : (ع۔ع) (مجلۃ الدعوۃ'/ اگست ۱۹۹۵ء)

کھانا کھاتے وقت بسم اللہ یا بسم اللہ الرحمن الرحیم؟

س کیا کھانا وغیرہ کھاتے وقت بسم اللہ الرحمن الرحیم مکمل پڑھی جائے یا صرف بسم اللہ کہا جائے؟ صحیح احادیث کی رو سے وضاحت فرمائیں۔

ج رسول اکرم ﷺ کی احادیث صحیحہ کی رو سے کھانا کھاتے وقت یا وضو وغیرہ کرتے وقت صرف بسم اللہ ہی پڑھنا ثابت ہے۔ مکمل بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنا آپ کے قول و عمل سے ثابت نہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق صرف دو مقامات پر بسم اللہ الرحمن الرحیم مکمل پڑھنا ثابت ہے۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں :

((عَنْ عُمَرَ بْنِ اَبِی سَلَمَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : يَا بُنَيَّ اِذَا اَكَلْتَ فَسَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ وَفِي رِوَايَةٍ يَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ))

"عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا' اے لڑکے اللہ کا نام لو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ"۔

(بخاری ۳/ ۴۹۲' مسلم ۱۰۹' مسند احمد (۱۵۸۹۶) ۴/ ۶۰۶ طبع قدیم ص ۴/۲۶)

اس حدیث سے نبی ﷺ نے عمر بن ابی سلمہ کو جو فرمایا ((بِسْمِ اللّٰهِ)) "اللہ کا نام لو"۔ اس اجمال کی تفصیل طبرانی کبیر ۹/ ۱۴ اور کتاب الدعا للطبرانی (۸۸۶) کی روایت سے معلوم ہو جاتی ہے۔ طبرانی میں ہے ((يَا غُلَامُ اِذَا اَكَلْتَ فَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ)) "اے لڑکے جب تو کھانے لگے تو "بسم اللہ" کہہ"۔ بقول علامہ البانی حفظہ اللہ ارواء الغلیل ۷/ ۳۱ اسنادہ صحیح علی شرط الشیخین" اس حدیث کی سند شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں :

" فَفِيْهِ بَيَانُ مَا اُطْلِقَ فِي الرِّوَايَاتِ الْاُخْرٰى بِاَنَّ التَّسْمِيَةَ عَلَى الطَّعَامِ اِنَّمَا السُّنَّةُ فِيْهَا اَنْ يَّقُوْلَ بِاخْتِصَارِ "بِسْمِ اللّٰهِ" وَمِمَّا

يَشْهَدُ لِذٰلِكَ الْحَدِيْثُ الْمُتَقَدِّمُ (١٩٦٥) فَاحْفَظْ هٰنَا فَإِنَّهُ مُهِمٌّ عِنْدَ مَنْ يُقَدِّرُوْنَ السُّنَّةَ وَلَا يُجِيْزُوْنَ الزِّيَادَةَ عَلَيْهَا۔"

"جو بات مطلق بیان ہوئی تھی' دیگر روایات میں اس کی وضاحت موجود ہے (اور اس میں یہ بھی ہے کہ) کھاتے وقت "بِسْمِ اللّٰهِ" مختصر پڑھنا ہی مسنون ہے۔ اس کی تائید حدیث نمبر ۱۹۶۵ سے بھی ہوتی ہے اس بات کو اچھی طرح یاد کر لو کیونکہ یہ ان افراد کے نزدیک بڑی اہمیت کی حامل ہے جو سنت کی تعظیم کرتے ہیں اور اس پر کسی قسم کا اضافہ و زیادتی جائز نہیں سمجھتے"۔

وہ حدیث جس کی طرف علامہ البانی حفظ اللہ نے اشارہ کیا ہے درج ذیل ہے۔
عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

((اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ فَاِنْ نَسِيَ اَنْ يَذْكُرَ اسْمَ اللّٰهِ فِي اَوَّلِهٖ فَلْيَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ))

"جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھانے لگے تو اسے اللہ کا ذکر کرنا چاہیے اگر کھانے کی ابتداء میں اللہ کا ذکر کرنا بھول جائے تو "بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ" پڑھے اور دوسری حدیث میں "بِسْمِ اللّٰهِ فِي اَوَّلِهٖ وَفِي اٰخِرِهٖ" بھی وارد ہے۔ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے کے وقت صرف بسم اللہ پڑھا جائے کیونکہ اس کے ساتھ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کا اضافہ مسنون ہوتا تو اللہ کے نبی ﷺ اس مقام پر ضرور سکھاتے کیونکہ یہ مقام تعلیم تھا اور اصولیین نے یہ قاعدہ ذکر کیا ہے۔

تَاْخِيْرُ الْبَيَانِ عَنْدَ وَقْتِ الْحَاجَةِ لَا يَجُوْزُ

"ضرورت کے وقت بیان (تفصیل) سے تاخیر جائز نہیں"۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا (تَوَضَّؤُوْا بِسْمِ اللّٰهِ) "بسم اللہ کہتے ہوئے وضو کرو"۔ (ابن خزیمہ ۷۴/۱ نسائی) لہٰذا کھانا کھاتے وقت اور وضوء کرتے وقت ہمیں صرف بسم اللہ پڑھنا چاہیے۔ یہی مسنون ہے۔ اس میں اضافہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ نبی ﷺ سے مروی ہے:

((عَنْ سَمُرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا حَدَّثْتُكُمْ حَدِيْثًا فَلَا تَزِيْدُنَّ عَلَيْهِ الْحَدِيْثَ))

"آپ نے فرمایا جب میں تم سے کوئی حدیث بیان کروں تو اس پر ہرگز اضافہ نہ کرنا"۔ (مسند احمد (۱۹۶۱۸) ۵/ ۲۳۸' قدیم ص ۵/ ۱۱)

وہ دو مقامات جہاں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم مکمل پڑھنی چاہئے یہ ہیں:

۱) قرآن مجید کی تلاوت کے وقت' جب تلاوت کی ابتداء کسی سورت سے کی جائے تو تعوذ کے بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم مکمل پڑھی جائے۔

۲) اسی طرح جب خطوط و رسائل لکھے جائیں تو مکمل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنی چاہئے جیسا کہ قرآن مجید میں سورۃ نمل آیت ۳۰ میں سلیمان علیہ السلام کا ملکہ بلقیس کے نام خط میں مکمل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم درج ہے۔ اسی طرح آپ نے ہرقل کے نام جو خط لکھا اس میں بھی مکمل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب الوحی اور کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد)

اس مسئلہ کی مکمل تفصیل ہمارے بھائی حافظ عبدالرؤف عبدالحنان نے اپنی کتاب "مسنون تسمیہ" میں بڑے احسن انداز سے ذکر کی ہے۔ مزید تفصیل کا طالب اس کتاب کا مطالعہ کرے۔
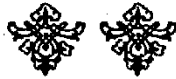
۲۰

کتاب

الْاَدَبِ

کیا آدمی روزانہ بالوں میں کنگھی کر سکتا ہے؟

س روزانہ کنگھی کرنا منع ہے' ناپسندیدہ ہے یا روزانہ کر سکتے ہیں؟ دلیل مع حوالہ لکھیں کچھ ساتھیوں کو حوالے دکھانے ہیں۔

(ابو عباد ذبیح اللہ' مرکز الدعوۃ والارشاد مبارک پورہ سیالکوٹ)

ج رسول اللہ ﷺ نے بالوں کو سنوار کر رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((مَنْ كَانَ شَعْرُهُ فَلْيُكْرِمْهُ))

"جس کے بال ہوں وہ ان کی عزت کرے"۔ (ابوداؤد 'کتاب الترجل)

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس رسول ﷺ تشریف لائے تو ایک پراگندہ سر آدمی دیکھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے تو فرمایا :

((أَمَا كَانَ يَجِدُ هٰذَا مَا يُسَكِّنُ بِهِ شَعْرَهُ))

"کیا اسے کوئی چیز نہیں ملتی تھی جس سے اپنے بال ساکن کرلے (یعنی بکھرنے سے روک لے)"۔

ایک اور آدمی دیکھا جس نے میلے کپڑے پہنے ہوئے تو فرمایا :

((أَمَا كَانَ هٰذَا يَجِدُ مَاءً يَّغْسِلُ بِهِ ثَوْبَهُ))

"کیا اسے پانی نہیں ملتا تھا کہ اس سے اپنے کپڑے دھو لیتا"۔

(ابوداؤد 'کتاب اللباس باب فی غسل الثوب)

حاکم نے فرمایا کہ یہ حدیث بخاری مسلم کی شرط پر صحیح ہے اور ذہبی نے بھی ان کی موافقت فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کپڑے صاف ستھرے رکھنے چاہئیں اور بال بھی سنوار کر رکھنے چاہئیں لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ آدمی زیب و زینت اور بناؤ سنگھار میں لگا رہے اور ہر وقت بالوں کی آرائش میں ہی الجھا رہے بلکہ آپ نے روزانہ کنگھی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ عبداللہ بن شقیق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ مصر کے

عمال (امیر) تھے ان کے پاس ان کا ایک ساتھی آیا تو دیکھا کہ ان کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ پوچھا کیا بات ہے کہ میں آپ کے بال بکھرے ہوئے دیکھ رہا ہوں حالانکہ آپ امیر ہیں تو انہوں نے جواب دیا : "كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَانَا عَنِ الْإِرْفَاهِ" یعنی "اللہ کے نبی ﷺ ہمیں ارفاہ اور آرام طلبی (نزاکت) سے منع فرماتے تھے"۔ ہم نے پوچھا ارفاہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا :

((اَلتَّرَجُّلُ كُلَّ يَوْمٍ))

"روزانہ کنگھی کرنا"۔ (نسائی باب الترجل)

شیخ ناصرالدین البانی نے سلسلہ صحیحہ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مصر کے یہ امیر فضالہ بن عبید تھے۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے کہ عبداللہ بن بریدہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے فضالہ بن عبید کی طرف سفر کیا جب کہ وہ مصر میں تھے۔ ان کے پاس پہنچے تو کہا کہ میں تمہاری زیارت (ملاقات) کے لیے نہیں آیا بلکہ میں نے اور آپ نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث سنی تھی مجھے امید ہے آپ کے پاس اس کا علم ہو گا انہوں نے پوچھا کونسی حدیث؟ تو انہوں نے حدیث بتائی۔ اس صحابی نے فضالہ سے پوچھا کیا بات ہے کہ آپ کو بکھرے ہوئے بالوں والا دیکھ رہا ہوں حالانکہ آپ اس علاقے کے امیر ہیں تو انہوں نے فرمایا :

((اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْهَانَا عَنْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْإِرْفَاهِ))

"رسول اللہ ہمیں زیادہ ارفاہ (آرام طلبی اور نزاکت) سے منع فرمایا کرتے تھے"۔

پوچھا کیا بات ہے آپ کو جوتا پہنے ہوئے نہیں دیکھ رہا تو انہوں نے کہا کہ :

((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْمُرُنَا اَنْ نَحْتَفِيَ اَحْيَانًا))

"نبی ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ کبھی کبھی ہم ننگے پاؤں چلا کریں"۔

(ابوداؤد اول کتاب الترجل)

شیخ البانی نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند بھی بخاری مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں :

((نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ التَّرَجُّلِ اِلَّا غِبًّا))

"رسول اللہ ﷺ نے کنگھی کرنے سے منع فرمایا مگر ناغے سے"۔

(نسائی باب الترجل غبا)

اس کے علاوہ یہ حدیث ابوداؤد ترمذی' احمد ابنِ حبان اور بہت سے محدثین نے ذکر فرمائی ہے۔ ترمذی نے فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ شیخ ناصرالدین البانی نے فرمایا کہ اس کے راوی بخاری مسلم کے راوی ہیں مگر حسن بصری مدلس ہیں اور انہوں نے تمام سندوں میں "عَنْ" کے لفظ سے روایت کی ہے لیکن اس کے شاہد موجود ہیں جو اسے قوی کرتے ہیں۔ فضالہ بن عبید کی روایت اوپر گزر چکی ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بالوں کو روزانہ کنگھی نہیں کرنی چاہئے لیکن نسائی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بال بہت زیادہ بکھرے ہوں تو روزانہ کنگھی کی اجازت ہے :

((عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ قَالَ كَانَتْ لَهٗ جُمَّةٌ ضَخْمَةٌ فَسَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَهٗ اَنْ يُّحْسِنَ اِلَيْهَا اَنْ يَّتَرَجَّلَ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ))

"ابو قتادہ سے روایت ہے کہ ان کے سر پر بھاری بال تھے تو انہوں نے نبی ﷺ سے پوچھا تو آپ نے انہیں حکم دیا کہ بالوں سے اچھا سلوک کریں اور ہر روز کنگھی کریں"۔ (سنن نسائی باب الترجل)

اس حدیث کو مد نظر رکھتے ہوئے بعض حضرات نے یہ تطبیق دی ہے کہ اگر بھاری بال ہوں تو روزانہ کی اجازت ہے ورنہ روزانہ کنگھی کرنا ناجائز ہے۔ لیکن شیخ ناصرالدین البانی نے سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ کی حدیث ۲۲۵۲ کے تحت فرمایا ہے کہ ابوقتادہ کی طرف منسوب یہ روایت جس میں انہیں روزانہ کنگھی کرنے کا حکم دیا ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ان احادیث کے خلاف ہے جن میں آپ نے روزانہ کنگھی سے منع فرمایا ہے۔ اس کی سند میں کئی خرابیاں ہیں نسائی کی سند اس

طرح ہے:

أَخْبَرَنَا عَمْرُو بْنُ عَلِيٍّ قَالَ حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ مُقَدَّمٍ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى بْنُ سَعِيْدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الخ

شیخ ناصر الدین حفظہ اللہ نے جو خرابیاں بیان کی ہیں ان میں سے موٹی چند خرابیاں بیان کی جاتی ہیں پوری تفصیل سلسلہ صحیحہ کی پانچویں جلد میں دیکھیں۔

۱) محمد بن المنکدر اور ابو قتادہ کے درمیان سند کٹی ہوئی ہے کیونکہ محمد بن المنکدر نے ابو قتادہ سے سنا نہیں ہے جیسا کہ حافظ ابنِ جریر نے التہذیب میں تحقیق بیان فرمائی ہے۔

۲) عمر بن علی بن مقدم کی تدلیس ہے۔ یہ ابنِ مقدم عجیب تدلیس کرتے تھے جو علماء کے نزدیک تدلیس سکوت کے نام سے معروف ہے۔ تہذیب میں ان کے حالات کا مطالعہ فرمایئے۔

۳) محمد بن منکدر سے عمر بن علی بن مقدم کے علاوہ سفیان (ثوری) نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے مگر اس میں (وَكَانَ يَدَّهِنُهُ وَيَدَعُهُ يَوْمًا) یعنی "ابو قتادہ ایک دن بالوں کو تیل لگاتے تھے اور ایک دن چھوڑ دیتے تھے"۔ یہ روایت بیہقی میں ہے۔

سفیان ثوری کی روایت صحیح احادیث کے مطابق ہے کہ روزانہ کنگھی نہیں کرنی چاہئے اور اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ عمر بن علی بن مقدم کی روایت منکر ہے اور ابو قتادہ جیسے جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ کے متعلق گمان بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ صحیح احادیث کے مطابق ناغے سے ہی کنگھی کرتے ہوں گے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ صحیح مسئلہ کے مطابق روزانہ کنگھی نہیں کرنی چاہئے۔ روزانہ کنگھی کرنے کے جواز کی کوئی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

از : (ع ۔ م) (مجلۃ الدعوۃ، دسمبر/ ۱۹۹۴ء)

جھک کر یا کھڑے ہو کر سلام کرنا اور

دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا

س: اپنے بڑوں کو جھک کر سلام کرنا یا کھڑے ہو کر سلام کرنا یا اپنے اساتذہ کے احترام میں کھڑے ہونا اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا' یہ سب افعال قرآن و سنت کی روشنی میں بتائیں کیسے ہیں؟ (محمد جاوید خان)

ج: سلام کرتے وقت جھکنا درست نہیں کیونکہ اس کی مشابہت رکوع کے ساتھ ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو سلام کرتے وقت جھکتے ہوں۔ اسی طرح کسی شخص کے احترام یا تعظیم کے لیے کھڑا ہونا جائز نہیں' جیسا کہ آج کل استاد' جج یا کسی بڑے آدمی کی آمد پر سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو پسند ہو کہ لوگ اس کے لیے تصویر بن کر کھڑے ہوں' وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنا لے۔ (ترمذی' ابوداؤد مشکوۃ' باب القیام) یہ حدیث صحیح ہے۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہیں تھا اور وہ جب آپ کو دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ اس بات کو ناپسند فرماتے ہیں۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ البتہ آگے بڑھ کر استقبال کرنا یا اٹھ کر ملنا اور بٹھانا درست ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بنو قریظہ کا فیصلہ کرنے کے لیے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو بلوایا۔ جب وہ قریب پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے انصار سے فرمایا ((قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ)) "اپنے سردار کی طرف اٹھو"۔ (بخاری' مسلم' مشکوۃ' باب القیام)

مصافحہ کا معنی عربی زبان میں ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ کا صفحہ (کنارہ) ملانا ہے۔ جب ایک ہاتھ کا صفحہ دوسرے شخص کے ہاتھ سے مل گیا تو مصافحہ مکمل ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ مصافحہ کرتے وقت اور بیعت لیتے وقت دایاں ہاتھ استعمال کرتے

تھے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں' تحفۃ الاحوذی ص ۳۹۷' ج ۳)

صحیح بخاری میں جو حدیث ہے کہ آپ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تشہد کی تعلیم دی تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہتھیلی رسول اللہ ﷺ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تھی تو یہ تعلیم دیتے وقت متوجہ کرنے کے لیے تھا۔ اس سے ملاقات کا مصافحہ مراد نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ ملاقات کے وقت چھوٹے کو ایک ہاتھ سے اور بڑے کو دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا چاہیے۔

از : (ع ۔ م) (مجلۃ الدعوۃ' جولائی / ۱۹۹۵ء)

مصافحہ ایک ہاتھ سے یا دونوں ہاتھوں سے؟

س : ہمارے ہاں رواج ہے کہ لوگ ملاقات کے وقت دو ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں۔ ہمیں ایک دوست نے بتایا کہ مصافحہ ایک ہاتھ سے کرنا چاہیے یہی سنت ہے۔ لہٰذا آپ ہماری کتاب و سنت کی رو سے راہنمائی کریں۔

(محمد نواز' سرگودھا)

ج ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے ملاقات کرے تو ان دونوں کو آپس یں دائیں ہاتھ سے مصافحہ کرنا چاہیے اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے :

((عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُّسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ اِلاَّ غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ اَنْ يَّتَفَرَّقَا))

"براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں' مصافحہ کرتے ہیں تو جدا ہونے سے قبل ان کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں"۔ (ابن ماجہ ۲/۱۲۲۰ (۳۷۰۳)' ترمذی (۲۷۲۷) ابوداؤد ۴/۳۵۴ (۵۲۱۲)' مسند احمد ۴/۲۸۹' ۳۰۳)

لہٰذا جو عمل اتنی اہمیت کا حامل ہو اور اتنے فضائل والا ہو' اس کو صحیح سنت کے

مطابق ادا کریں گے تو یہ اجر ملے گا۔ اگر خلاف سنت عمل کریں گے تو اجر برباد ہو گا۔ مصافحہ کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملاقات کرتے وقت دائیں ہاتھ کے ساتھ مصافحہ کرے۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی معمول تھا۔ اس ضمن میں بہت سی احادیث ہیں چند ایک ملاحظہ فرمائیں :

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ لَقِیَنِی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا جُنُبٌ فَاَخَذَ بِیَدِیْ (وَفِی نُسْخَةٍ بِیَمِیْنِی) فَمَشَیْتُ مَعَهُ حَتّٰی قَعَدَ فَانْسَلَلْتُ))

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے میرے ساتھ ملاقات کی اور میں جنبی تھا۔ آپ نے میرا ہاتھ پکڑا (ایک نسخہ میں ہے کہ میرا دایاں ہاتھ پکڑا) پھر میں آپ کے ساتھ چلا یہاں تک کہ آپ بیٹھ گئے پس میں کھسک گیا"۔ (الحدیث بخاری ۱/۴۲)

۲) امام طحاوی نے شرح معانی الاثار ۱/۱۶ پر یہ الفاظ ذکر کیے ہیں :

((لَقِیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ أَنَا جُنُبٌ فَمَدَّ یَدَهُ اِلَیَّ فَقَبَضْتُ یَدِیْ عَنْهُ وَقُلْتُ اِنِّی جُنُبٌ فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّ الْمُسْلِمَ لَا یَنْجُسُ))

"میں نے نبی اکرم ﷺ سے حالتِ جنابت میں ملاقات کی۔ آپ نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا اور کہا میں جنبی ہوں۔ آپ نے فرمایا (سبحان اللہ) مسلم نجس نہیں ہوتا"۔

یہ حدیث ایک ہاتھ کے مصافحہ پر نص قطعی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ملاقات کے وقت مصافحہ کے لیے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور صحابی رسول سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اپنا ایک ہاتھ جو مصافحہ کے لیے بڑھانا تھا پیچھے کھینچا اور عذر پیش کیا کہ میں جنبی ہوں آپ نے فرمایا سبحان اللہ مسلم نجس نہیں ہوتا۔

((عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ یَقُوْلُ تَرَوْنَ کَفِّیْ هٰذَا فَاَشْهَدُ اَنِّی وَضَعْتُهَا عَلٰی کَفِّ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ))

"عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تم لوگ میری اس ہتھیلی کو دیکھتے ہو میں نے اس ہتھیلی کو محمد ﷺ کی ہتھیلی پر رکھا ہے"۔

مسند احمد ۴/ ۸۹' موارد الظلمآن (۹۴۰)

((عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلرَّجُلُ مِنَّا يَلْقٰى اَخَاهُ اَوْ صَدِيْقَهُ اَيَنْحَنِيْ لَهُ قَالَ لَا قَالَ اَفَيَلْتَزِمُهُ وَيُقَبِّلُهُ قَالَ لَا قَالَ فَيَأْخُذُ بِيَدِهٖ وَيُصَافِحُهُ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَبُوْعِيْسٰى هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ))[1]

"انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ ہم میں سے کوئی آدمی اپنے بھائی یا دوست سے ملاقات کرے۔ کیا اس کے لیے جھکے؟ آپ نے فرمایا! نہیں۔ اُس نے کہا' کیا اس سے چمٹ جائے؟ اور اس کو بوسہ دے؟ فرمایا نہیں پھر اُس نے کہا' کیا اس کا ہاتھ پکڑے اور مصافحہ کرے؟ فرمایا! ہاں۔ امام ترمذی نے فرمایا' یہ حدیث حسن ہے"۔ (ترمذی ۵/ ۷۰ (۲۷۲۸)' ابن ماجہ ۲/ ۱۲۲۰ (۳۷۰۲)

علامہ البانی نے متعدد طرق کی بنا پر اس حدیث کو سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ ۸۸/۱ پر درج کیا ہے۔ تاہم اس حدیث سے معانقے کی ممانعت نہیں نکلتی جو کہ چمٹ کر ملنے سے مختلف ہے۔

((عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ مُّسْلِمَيْنِ الْتَقَيَا فَاَخَذَ اَحَدُهُمَا بِيَدِ صَاحِبِهٖ اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يَّحْضُرَ دُعَائَهُمَا وَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اَيْدِيْهِمَا حَتّٰى يَغْفِرَ لَهُمَا))

"انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ ان کی دعاؤں میں موجود رہے اور ان کے ہاتھ علیحدہ ہلانے سے پہلے ان کو...

---

[1] اس کی سند میں حنظلہ السدوسی ضعیف ہے۔ (ابو طاہر)

بخش دے۔" (مسند احمد ۱۴۲/۳، کشف الاستار ص ۴۱۹)

مذکورہ بالا پانچ احادیث سے معلوم ہوا کہ مصافحہ ایک ہاتھ کے ساتھ کرنا سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ اسی کی تعلیم دیتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی سنت پر عامل تھے۔ ویسے مصافحہ کے معنی میں بھی یہ بات شامل ہے کہ ہتھیلی کو ہتھیلی کے ساتھ ملایا جائے جیسا کہ امام ابن اثیر جزری النھایہ فی غریب الحدیث والاثر ص ۴۳/۳ پر رقم طراز ہیں:

"وَمِنْهُ حَدِيْثُ الْمُصَافَحَةِ عِنْدَ اللِّقَاءِ وَهِيَ مُفَاعَلَةٌ مِنْ إِلْصَاقِ صَفْحِ الْكَفِّ بِالْكَفِّ"

"صفح لفظ سے ملاقات کے بعد مصافحہ کی حدیث بھی ہے مصافحہ باب مفاعلہ سے بطن ہتھیلی کو بطن ہتھیلی سے ملانا ہے"۔

مصافحہ کا یہی معنی لغت کی کتب قاموس تاج العروس وغیرہ میں منقول ہے۔ لہٰذا مصافحہ کی جو تعریف ہے وہ بھی اہل حدیث کے مصافحہ پر پوری طرح صادق آتی ہے اور جو مصافحہ احناف کے ہاں رائج ہے، اس پر یہ تعریف صادق نہیں آتی۔ بعض لوگ دونوں ہاتھوں کے ساتھ مصافحہ کرنے کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

((عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ يَقُوْلُ عَلَّمَنِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ التَّشَهُّدَ وَكَفِّي بَيْنَ كَفَّيْهِ))

"ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے تشہد سکھلایا کہ میرا ہاتھ آپ کے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں تھا"۔ (بخاری ۹۲۶/۲)

۱) اس حدیث کا ملاقات کے وقت مصافحہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس حدیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تشہد سکھا رہے تھے اور تعلیم کے وقت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے دو ہاتھوں کے درمیان تھا۔ اگر اس کو مصافحہ ملاقات پر محمول کریں تو اس کی صورت یہ بنے گی کہ نبی ﷺ کے دو ہاتھوں میں ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک ہاتھ تھا یعنی تین ہاتھ کا مصافحہ۔

جس طرح کسی اہل حدیث کا حنفی حضرات سے مصافحہ ہو تو حنفی کے دو ہاتھ ہوتے ہیں اور اہل حدیث کا ایک ہاتھ اور حنفی بھائی اس مصافحہ کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان مقلدین بھائیوں پر سخت تعجب ہے کہ جو مصافحہ صحیح احادیث سے ثابت ہے وہ انہیں پسند نہیں اور جو مصافحہ یعنی چار ہاتھوں کا ثابت نہیں اس پر اصرار کرتے ہیں۔ اس حدیث سے قطعاً یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے دو ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ہاتھوں سے ملے ہوئے تھے۔

اگر بفرضِ محال اس حدیث کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ دونوں طرف سے دونوں ہاتھوں کا مصافحہ ہے اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کَفِّي اسم جنس سے ان کی دونوں ہتھیلیاں مراد لی جائیں تو اس صورت میں کَفِّيْ بَيْنَ كَفَّيْهِ کا مطلب یہ ہو گا کہ میری دونوں ہتھیلیاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلیوں کے درمیان میں تھیں اور جو لوگ دو ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں' ان کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس حدیث سے ان کا استدلال باطل ہے۔

حنفی مذہب کے جید علماء کو یہ بات مسلم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی ہتھیلی کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں پکڑنا مزید اہتمام اور تعلیم کی تاکید کے لیے تھا۔ حنفی مذہب کی فقہ کی مشہور داخل نصاب کتاب ہدایہ ۹۳/۱ کتاب الصلوۃ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ "اَخَذَ لِيَكُوْنَ حَاضِرًا فَلَا يَفُوْتَهُ شَيْئٌ" آپ نے ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اس لیے تھاما تھا تاکہ ان کا دماغ حاضر رہے اور کوئی چیز ان سے فوت نہ ہو جائے۔

علامہ زیلعی حنفی ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کی ابنِ عباس رضی اللہ عنہ والے تشہد پر ترجیح ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

وَمِنْهَا اَنَّهُ قَالَ فِيْهِ عَلَّمَنِيَ التَّشَهُّدَ وَكَفِّي بَيْنَ كَفَّيْهِ وَلَمْ يَقُلْ ذٰلِكَ فِي غَيْرِهِ فَدَلَّ عَلٰى مَزِيْدِ الْاِعْتِنَاءِ وَالْاِهْتِمَامِ

"ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ والے تشہد پر راجح ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تشہد

سکھایا اور میری ہتھیلی آپ کی ہتھیلیوں کے درمیان میں تھی اور یہ بات ابن عباس رضی اللہ عنہ کے تشہد میں نہیں۔ اس نے مزید توجہ اور اہتمام پر دلالت کی"۔

(نصب الرایہ ۱/۴۲۱' کتاب الصلوۃ)

یہی بات ابنِ ہمام حنفی نے ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں لکھی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑنا علی سبیل المصافحہ نہیں تھا بلکہ مزید اہتمام و تاکید کے لیے تھا۔

مولوی عبدالحی لکھنوی حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ابنِ مسعود والی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے وہ مصافحہ جو ملاقات کے وقت کیا جاتا ہے' مراد نہیں ہے بلکہ یہ ہاتھ میں ہاتھ لینا ویسا ہے جیسا کہ بزرگ چھوٹوں کو کوئی چیز تعلیم کرنے کے وقت ہاتھ میں ہاتھ لے لیتے ہیں"۔ (مجموعہ الفتاوی اردو ۱/۳۴۴' کتاب العلم والعلماء)

اور کئی احادیث سے ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر تعلیم دینا ثابت ہے۔ ایک حدیث لکھی جاتی ہے:

((عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخَذَ بِيَدِهٖ وَقَالَ يَا مُعَاذُ وَاللّٰهِ اِنِّي لَاُحِبُّكَ قُلْتُ وَاللّٰهِ اِنِّي لَاُحِبُّكَ فَقَالَ اُوْصِيْكَ يَا مُعَاذُ لَا تَدَعَنَّ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ تَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ))

"معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا' اے معاذ اللہ کی قسم میں تمہیں دوست رکھتا ہوں میں نے کہا' اللہ کی قسم میں بھی آپ کو دوست رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا' اے معاذ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھنا نہ چھوڑنا (اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ)"۔ (ابوداؤد (۱۵۲۲) ۲/۸۶' نسائی ۳/۵۳' عمل الیوم واللیلہ (۱۰۹)' الادب المفرد (۶۹۱)' مسند احمد ۵/۲۴۴' ۲۴۷' ابنِ خزیمہ (۷۵۱)' ابنِ حبان (۲۳۴۵)' حاکم ۱/۲۷۳' ۳/۲۷۲)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ تعلیم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مُتَعَلِّم کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھایا جائے تاکہ اس کا دھیان اور توجہ مسئلہ مذکورہ کی طرف ہو۔ حنفی حضرات کی مزید تسلی کے لیے ایک روایت درج کی جاتی ہے۔ علامہ جلال الدین خوارزمی حنفی ہدایہ کی شرح کفایہ میں ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ والی اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَتَاكِيْدُ التَّعْلِيْمِ فَإِنَّهُ رُوِيَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ اَنَّهُ قَالَ اَخَذَ اَبُوْ يُوْسُفَ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ بِيَدِي وَعَلَّمَنِي التَّشَهُّدَ وَقَالَ اَخَذَ اَبُوْحَنِيْفَةَ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ بِيَدِي فَعَلَّمَنِي التَّشَهُّدَ وَقَالَ اَبُوْحَنِيْفَةَ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اَخَذَ حَمَّادٌ بِيَدِي فَعَلَّمَنِي التَّشَهُّدَ وَقَالَ حَمَّادٌ اَخَذَ عَلْقَمَةُ بِيَدِي وَعَلَّمَنِي التَّشَهُّدَ وَقَالَ عَلْقَمَةُ اَخَذَ اِبْنُ مَسْعُوْدٍ بِيَدِي وَعَلَّمَنِي التَّشَهُّدَ وَ قَالَ اِبْنُ مَسْعُوْدٍ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِيَ وَ عَلَّمَنِي التَّشَهُّدَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخَذَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِيَدِي فَعَلَّمَنِي التَّشَهُّدَ

"ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث تاکید تعلیم پر محمول ہے۔ اس لیے کہ محمد بن حسن شیبانی سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا اور ابو یوسف نے کہا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا اور امام ابو حنیفہ نے کہا حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔ امام حماد کہتے ہیں علقمہ رحمہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔ علقمہ کہتے ہیں ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔ ابنِ مسعود کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے تشہد سکھایا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جبرائیل نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا"۔ (الکفایہ شرح ہدایہ ۱/۲۷۳)

مذکورہ بالا حنفی روایت سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ ابنِ

مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کا دو ہاتھوں کے ساتھ مصافحہ کرنے سے تعلق نہیں بلکہ یہ طریقہ، تعلیم پر محمول ہے جو کہ طالب علم کو مزید تاکید سے اہتمام و توجہ دلانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اب تو حنفی حضرات کو اس حدیث سے مروجہ مصافحہ پر استدلال نہیں کرنا چاہئے بلکہ مذکورہ بالا صحیح احادیث کی رو سے دائیں ہاتھ کے ساتھ مصافحہ کرنا چاہئے کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ کی سنت یہی ہے اور یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل تھا۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم و اکمل

غیر مسلموں سے سلام کا طریقہ

س: غیر مسلموں سے سلام لینا جائز ہے یا نہیں اور اگر وہ سلام کہیں تو جواب کیسے دینا ہے؟ (خالد ابو طیبہ' حافظ آباد)

ج: صحیح مسلم میں اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ "اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو اور جب تم میں سے کسی کو ان میں سے کوئی راستے میں ملے تو اس کو تنگ حصہ کی طرف مجبور کرو"۔ صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہیں اہل کتاب سلام کہیں تو انہیں جواب میں صرف وعلیکم کہنا چاہئے' اس سے زیادہ جواب دینا درست نہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ اہل کتاب دوسرے تمام کافروں سے بہتر ہیں۔ ان کی عورتوں سے نکاح بھی جائز ہے مشرکین اور دہریہ ان سے بہت بدتر ہیں۔ جب اہل کتاب کو سلام کی ابتدا نہیں کر سکتا تو دوسرے کافر کو سلام میں پہل کرنا بالاولیٰ درست نہ ہو گا اور جواب میں وعلیکم سے زیادہ کہنا صحیح نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

از : (ع۔م) (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۵ء)

عمامہ کا رنگ

س: کیا عمامہ کا سبز رنگ بھی ہے یا سیاہ رنگ؟ ایک مولوی صاحب نے کہا کہ پگڑی سبز بھی ہے اور سفید بھی اور سرخ بھی' لہٰذا آپ صحیح احادیث کی رو سے وضاحت فرمائیں۔ (عبدالحمید' توحید آباد)

ج نبی اکرم ﷺ نے سفید لباس کو پسند فرمایا ہے اور اس کی ترغیب بھی دی ہے جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیْکُمْ بِالْبَیَاضِ مِنَ الثِّیَابِ لِیَلْبَسْھَا اَحْیَاؤُکُمْ وَ کَفِّنُوْا فِیْھَا مَوْتَاکُمْ مِنْ خَیْرِ ثِیَابِکُمْ))

"تم سفید لباس لازم پکڑو اس کو تمہارے زندہ لوگ پہنیں اور اس میں اپنے مردوں کو کفن دو یقیناً یہ تمہارے بہترین کپڑوں میں سے ہے"

(ابوداود ۴۰۶۱' ابن ماجہ ۵۶۶' ترمذی ۵۴)

((عَنْ سَمُرَۃَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلْبَسُوا الْبَیَاضَ فَاِنَّھَا اَطْھَرُ وَاَطْیَبُ وَ کَفِّنُوْا فِیْھَا مَوْتَاکُمْ))

"سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' سفید لباس پہنو یقیناً یہ بہت زیادہ پاک و عمدہ ہے اور اس میں اپنے مردوں کو کفن دو"

(ترمذی ۲۸۱۱' ابن ماجہ ۳۵۸۷' نسائی' طیالسی ۱۸۰۰)

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ سفید لباس نہایت عمدہ اور پسندیدہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی ترغیب دلائی اور آپ نے ایک صحابی کو سفید عمامہ بندھوایا (صحیح جامعہ صغیر) اور عمامہ جو اللہ کے رسول ﷺ باندھا کرتے تھے اس کا رنگ حدیث میں سیاہ مذکور ہوا ہے جیسا کہ جابر رضی اللہ عنہ نے کہا:

((دَخَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ الْفَتْحِ وَعَلَیْہِ عَمَامَۃٌ سَوْدَآءُ))

"نبی ﷺ فتح مکہ والے دن مکہ میں داخل ہوئے تو آپ پر سیاہ پگڑی تھی"۔ (مسلم' ابوداود ۴۰۷۶' ابن ماجہ ۸۵۸۵' ترمذی ۱۷۳۵' احمد ۳/ ۳۶۳۔۳۸۷' دارمی ۲/ ۸۴)

((عَنْ عَمْرِو بْنِ حُرَیْثٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَطَبَ النَّاسَ وَعَلَیْہِ عَمَامَۃٌ سَوْدَاءُ))

"عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، نبی ﷺ نے خطبہ دیا اور آپ کے سر پر سیاہ پگڑی تھی"۔

ابوداؤد میں اس طرح ہے:

((رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَعَلَيْهِ عَمَامَةٌ سَوْدَاءُ قَدْ أَرْخَى طَرَفَهَا بَيْنَ كَتِفَيْهِ))

"عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے نبی ﷺ کو منبر پر دیکھا، آپ نے خطبہ دیا اور آپ کے سر پر سیاہ پگڑی تھی۔ آپ نے اس کے شملہ کو اپنے کندھوں کے درمیان لٹکایا ہوا تھا"

(مسلم ۱۳۵۹، ابنِ ماجہ ۳۵۸۴، ابوداؤد ۴۰۷۷، شمائل ترمذی ۹۳)

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اعْتَمَّ سَدَلَ عَمَامَتَهُ بَيْنَ كَتِفَيْهِ قَالَ نَافِعٌ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ قَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ رَأَيْتُ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ وَسَالِمًا يَفْعَلَانِ ذٰلِكَ))

"ابنِ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب پگڑی باندھتے تو اس کے شملہ کو اپنے کندھوں کے درمیان لٹکا دیتے۔ نافع نے کہا ابنِ عمر اسی طرح کرتے تھے۔ عبیداللہ نے کہا میں نے قاسم بن محمد بن ابی بکر اور سالم بن عبداللہ بن عمر کو اسی طرح کرتے دیکھا" (شمائل ترمذی ۹۴، جامع ترمذی ۱۷۳۶)

مذکورۃ الصدر احادیث سے معلوم ہوا کہ سیاہ عمامہ باندھنا سنت نبوی ہے۔ رہا سبز عمامہ تو اس کا کسی صحیح حدیث میں ذکر نہیں۔ اگر کسی بھائی کے علم میں سبز پگڑی کی صحیح حدیث ہو تو وہ ہمیں لکھ کر بھیج دے۔ اسی طرح سرخ رنگ کا ذکر بھی ہمیں کسی صحیح حدیث سے نہیں ملا۔ (مجلۃ الدعوۃ، دسمبر/ ۱۹۹۵ء)

ٹوپی پر عمامہ

س ماہنامہ "البر" لاہور فروری ۱۹۹۲ء ص ۳۵ پر ایک روایت مروی ہے کہ ((فَرْقُ مَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْمُشْرِكِيْنَ الْعَمَائِمُ عَلَى الْقَلَانِسِ)) "ہم میں اور

مشرکوں میں فرق ہے تو ٹوپیوں پر عمامے ہیں۔ کیا یہ روایت درست ہے؟ اگر یہ روایت درست ہے تو کچھ لوگ جو صرف اکیلی ٹوپی پہنتے ہیں یا صرف پگڑی باندھتے ہیں، صحیح کرتے ہیں اور اگر یہ روایت درست نہیں تو وضاحت فرمائیں؟

(ابو عبداللہ، لاہور)

ج نبی اکرم ﷺ سے منسوب یہ روایت انتہائی کمزور ہے کیونکہ اس روایت کی سند اس طرح ہے :

((حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدِ الثَّقَفِيُّ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ رَبِيْعَةَ ثَنَا اَبُو الْحَسَنِ الْعَسْقَلَانِيُّ عَنْ اَبِيْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ رُكَانَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رُكَانَةَ صَارَعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَرَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رُكَانَةُ وَسَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فَرْقُ مَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْمُشْرِكِيْنَ الْعَمَائِمُ عَلَى الْقَلَانِسِ))

"نبی ﷺ نے رکانہ سے کشتی لڑی اور اسے پچھاڑ دیا۔ رکانہ نے کہا میں نے نبی ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ٹوپیوں پر پگڑی باندھنا ہے۔" (ابوداؤد لباس ۴۰۷۸، ترمذی ۱۷۸۴، ۴/۲۱۷)

اس روایت کی سند میں تین مجہول راوی ہیں۔

۱) ابوالحسن عسقلانی، مجہول تقریب ص ۴۰۱

۲) ابو جعفر بن محمد بن رکانہ، مجہول تقریب ص ۳۹۹

۳) محمد بن رکانہ، مجہول تقریب ص ۲۹۷

اس لیے امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرمایا هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَاِسْنَادُهُ لَيْسَ بِالْقَائِمِ وَلَا نَعْرِفُ اَبَا الْحَسَنِ الْعَسْقَلَانِيَّ وَلَا ابْنَ رُكَانَةَ (ترمذی مع تحفہ ۳/۷۰) یہ روایت غریب ہے اس کی سند درست نہیں اور ابوالحسن عسقلانی اور ابن رکانہ کو ہم نہیں پہچانتے"۔

علامہ مبارک پوری تحفۃ الاحوذی ۳/۷۰ پر فرماتے ہیں :

وَفِی الْجَامِعِ الصَّغِیْرِ بِرِوَایَۃِ الطَّبْرَانِیِّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ کَانَ یَلْبَسُ قَلَنْسُوَۃً بَیْضَاءَ قَالَ الْعَزِیْزِیُّ اِسْنَادُہٗ حَسَنٌ

"الجامع الصغیر میں ابنِ عمر سے روایت ہے جس کی سند کو علامہ عزیزی نے حسن قرار دیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سفید ٹوپی پہنتے تھے"

لیکن علامہ البانی حفظہ اللہ نے اسے ضعیف الجامع میں درج کیا ہے۔ (ص ٦٦)

اس طرح کی کئی روایتیں امام ابو نعیم اصبہانی نے کتاب اخلاق النبی ﷺ و آدابہ میں نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ٹوپی عمامہ کے بغیر بھی پہنتے تھے۔

امام ابنِ قیم رحمہ اللہ زاد المعاد ۱/۱۳۵ پر رقم طراز ہیں:

((کَانَتْ لَہٗ عِمَامَۃٌ تُسَمَّی السَّحَابُ کَسَاھَا عَلِیًّا وَکَانَ یَلْبَسُھَا وَیَلْبَسُ تَحْتَھَا الْقَلَنْسُوَۃَ وَکَانَ یَلْبَسُ الْقَلَنْسُوَۃَ بِغَیْرِ عِمَامَۃٍ وَیَلْبَسُ الْعِمَامَۃَ بِغَیْرِ قَلَنْسُوَۃٍ))

"نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک پگڑی تھی جس کا نام سحاب تھا آپ نے وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پہنائی۔ اسے آپ پہنتے اور کبھی اس کے نیچے ٹوپی ہوتی اور کبھی ٹوپی بغیر پگڑی کے اور پگڑی بغیر ٹوپی کے پہن لیتے"

امام ابنِ قیم رحمہ اللہ کی اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف پگڑی باندھنا یا صرف ٹوپی لینا یا ٹوپی پر پگڑی باندھ لینا' تینوں طرح جائز و صواب ہے۔ کسی صحیح حدیث سے اس کی نفی یا ممانعت نہیں ہے۔ اہل بدعت کا اس طرح عمامے کے متعلق قیود و پابندیاں لگانا یا اس کے جعلی فضائل بیان کرنا جیسا کہ فیضانِ سنت میں سبز پگڑی والوں کے پیر الیاس قادری نے ذکر کیا ہے یا ماہنامہ البر میں مولوی شفیع اوکاڑوی کا اس بارے میں ذکر کرنا احادیثِ صحیحہ کے خلاف ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' جولائی / ۱۹۹٦ء)

نام رکھنا

س: کیا مندرجہ ذیل نام رکھنے درست ہیں: شکیل الرحمٰن' جمیل الرحمٰن'

عقیل الرحمٰن وغیرہ؟

ج مندرجہ بالا نام رکھنا درست ہیں حدیث میں ذکر ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ نام اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں جو اللہ اور رحمٰن کی طرف منسوب کیے جائیں"۔ (مشکوٰۃ ص ۴۰۷)

البتہ بعض نام اللہ کو پسند نہیں۔ مثلاً وہ نام جن میں انسان کی زیادہ پاکیزگی پائی جاتی ہو۔ ارشاد فرمایا:

﴿ فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ ﴾ (النجم)

"پاک نہ سمجھو اپنی جانوں کو وہی خوب جانتا ہے اس کو کہ کون پرہیزگار ہے"۔

نبی اکرم ﷺ نے برے نام کو تبدیل کر دیا جس کے معنی حسن سلوک کرنا خدمت کرنا کے ہیں۔ ایسے ہی آپ نے ایسے نام اختیار کرنے سے منع فرمایا جن میں بڑائی پائی جائے۔ مثلاً شہنشاہ یا ملک الملوک وغیرہ (مشکوٰۃ ص ۴۰۷) اور یا ایسے نام رکھنا کہ جن میں قباحت ہو بگاڑ ہو مثلاً شیطان' حرب' اصرم وغیرہ جیسے نام رکھنے سے منع فرمایا۔

(مشکوٰۃ ص ۴۰۸)

البتہ شکیل الرحمٰن بمعنی رحمان کا ہم شکل ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ "اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں" اس لیے یہ نام بدل دینا چاہیے۔

از: رحمت اللہ ربانی

کتاب

الْحُدُوْد

مرد و زن کا بغیر نکاح کے اکٹھے رہنا

س مرد و عورت بغیر شادی و نکاح کے رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے ازدواجی تعلقات بھی استوار کیے ہوئے ہیں۔ شریعت اسلامیہ کا ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں مسئلہ کا حل درکار ہے؟

ج اللہ تعالیٰ نے جرائم کے اختتام کے لیے قرآن مجید میں مختلف جرائم کے اعتبار سے مختلف سزاؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح جب دو مرد و عورت آپس میں برا فعل سرانجام دیتے ہیں اور زنا جیسے فحش و قبیح فعل کا ارتکاب کر لیتے ہیں تو شریعت نے ان کے لیے جو سزا تجویز کی ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

شادی شدہ مرد و عورت زنا کریں تو ان کو رجم کیا جائے اور اگر غیر شادی شدہ ہوں تو ان کو سو کوڑے لگائے جائیں اور ایک سال کے لیے جلا وطن کر دیا جائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (النور : ۲)

"زناکار عورت و مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ ان پر اللہ تعالیٰ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے تمہیں ہرگز ترس نہیں کھانا چاہیے اگر تمہیں اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان ہے اور ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے"

تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیت عام مخصوص مِنْهُ الْبَعْضِ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ حکم عام نہیں کہ ہر قسم کے زانی کو ۱۰۰ کوڑے لگائے جائیں بلکہ یہ دیگر ادلہ شرعیہ کی بنا پر خاص ان لوگوں کے متعلق ہے جو کنوارے غیر شادی شدہ ہوں۔ حدیث پاک میں اس کی مزید تفصیل جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے اس میں ایک سال کے لیے جلاوطنی بھی ہے جیسا کہ عنقریب مذکور ہو گا۔ اور جو شادی شدہ ہوں

ان کے لیے رجم ہے۔ اس طرح غلام یا باندی جرم کر بیٹھے تو اس کے لیے ۵۰ کوڑے ہیں یعنی ۱۰۰ کوڑوں کا نصف جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾ (النساء : ۲۵)

"اگر باندیاں بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان پر آزاد عورتوں کی نسبت سے نصف سزا ہے"

لہٰذا مذکورہ بالا سورۂ نور کی آیت کا حکم عام نہیں ہے بلکہ دیگر شرعی ادلہ کی بنا پر کنوارے کے لیے خاص ہے۔ شادی شدہ کے لیے جو رجم کی سزا ہے وہ یہ ہے کہ دو آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے ایک نے کہا یا رسول اللہ! میرا بیٹا اس کے ہاں ملازم تھا وہ اس کی بیوی سے زنا کر بیٹھا میں نے اس کے بدلے ایک سو بکریاں اور ایک لونڈی دی ہے پھر میں نے علماء سے دریافت کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے بیٹے پر شرعی سزا سو کوڑے اور ایک سال جلا وطنی ہے اور اس کی بیوی پر رجم ہے۔ آپ نے فرمایا :

((لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللّٰهِ مِائَةُ شَاةٍ وَّالْخَادِمُ رَدٌّ عَلَيْكَ وَعَلَى ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ وَّتَغْرِيبُ عَامٍ وَّاغْدُ يَا أُنَيْسُ عَلَى امْرَأَةِ هٰذَا فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا فَاعْتَرَفَتْ فَرَجَمَهَا))

"میں تمہارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا لونڈی اور سو بکریاں تجھے واپس دلوا دی جائیں گی اور تیرے لڑکے پر ۱۰۰ کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور اے انیس تو اس کی بیوی کے پاس جا اگر وہ اعتراف کر لے تو اس کو سنگسار کر دینا اس نے اعتراف کر لیا اور اسے رجم کر دیا گیا" (موطا مالک ۲/ ۸۲۲' بخاری ۵/ ۵۰۱' ۱۲/ ۱۳۶' ۱۳/ ۱۸۵' مسلم (۱۶۹۷)' ابوداؤد (۴۴۴۰) نسائی ۸/ ۲۴۰' ترمذی ۱۴۳۳' ابن ماجہ ۲۵۴۵' دارمی ۲/ ۹۸' احمد ۴/ ۱۱۵' عبدالرزاق ۱۳۳۰۹' حمیدی ۸۱۱' طیالسی ۹۵۳' ابن الجارود ۴۴۲۰' بیہقی ۸/ ۲۱۲' ۲۲۲' شرح السنہ ۱۰/ ۲۷۰' المنتقی للابن جارود ۸۱۱)

مذکورہ بالا حدیث صحیح سے معلوم ہوا کہ کنوارہ زنا کرے تو ۱۰۰ کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی شادی شدہ پر رجم یعنی سنگساری ہے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا لوگو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور اس میں رجم کی آیت بھی تھی جس کو ہم نے پڑھا اور یاد رکھا اور عمل کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے کہیں ایسا نہ ہو کہ فریضہ خداوندی کے ترک کرنے کے باعث لوگ گمراہ ہو جائیں۔ فرمایا:

((اَلَا وَاِنَّ الرَّجْمَ حَقٌّ عَلٰی مَنْ زَنَا اِذَا اَحْصَنَ وَقَامَتِ الْبَیِّنَۃُ اَوْ کَانَ الْحَمْلُ اَوِ الْاِعْتِرَافُ اِلَّا وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَدْ رَجَمَ وَرَجَمْنَا مَعَہٗ))

"آگاہ ہو جاؤ بے شک رجم اس آدمی پر جو شادہ شدہ ہو اور زنا کا مرتکب ہو حق ہے جب اس پر دلیل قائم ہو جائے یا حمل ٹھہر جائے یا مجرم اعتراف کر لے متنبہ رہو بے شک رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور ہم نے بھی رجم کیا" (بخاری ۱۳۸/۱۲' مسلم ۱۶۹۱' ابوداؤد ۴۴۱۸' ترمذی ۱۴۳۲' ابنِ ماجہ ۲۵۵۳' دارمی ۹۹/۲' حمیدی ۲۵' بیہقی ۲۱۱/۸' احمد ۲۹۱' ۴۰' ۴۷ وغیرہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رجم کی سزا شادی شدہ پر رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی نافذ تھی اور خلفاء کے دور میں یہی سزا نافذ العمل تھی۔

مذکورہ بالا آیت اور احادیثِ صحیحہ مرفوعہ میں صراحتاً یہ بات موجود ہے کہ کنوارہ آدمی ۱۰۰ کوڑوں اور ایک سال جلاوطنی اور شادی شدہ رجم کا مستحق ہے لہٰذا سوال میں مذکورہ دونوں افراد جو کہ کنوارے ہیں اور بغیر شادی کے میاں بیوی کے حقوق کی طرح رہ رہے ہیں اور اس پر چار گواہ بھی قائم ہیں یا وہ خود اس جرم کا اقرار کر لیتے ہیں یا عورت کو حمل ٹھہر جاتا ہے اور ہر سہ صورت میں حد قائم ہو گی اور انہیں ۱۰۰

کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا دی جائے گی۔

اگر وہ یہ کہیں کہ ہم بہن بھائی کی طرح اکٹھے رہتے ہیں اور زنا کے مرتکب نہیں پھر بھی غلط ہے اور وہ فعل حرام کے مرتکب ہو رہے ہیں کیونکہ کوئی مرد اور عورت جو کہ غیر محرم ہیں ان کی خلوت صحیح نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَاَۃٍ اِلَّا وَ کَانَ ثَالِثَھُمَا الشَّیْطَانُ))

"کوئی مرد کسی عورت سے خلوت نہیں کرتا مگر تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے"

اسی طرح ایک حدیث میں عورت کے وہ تمام مرد رشتہ دار جو اس کے خاوند کی طرف سے بنتے ہیں ان کے ساتھ خلوت کو موت کہا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا اَلْحَمْوُ الْمَوْتُ لہٰذا ان کی فی الفور جدائی کرا دی جائے اور فعل حرام کے ارتکاب کی وجہ سے ان کو تعزیراً سزا دی جائے اور فعل زنا ثابت ہو تو مذکورہ بالا سزا جاری کی جائے۔

فعل قومِ لوط کے مرتکبین سے سلوک

س قومِ لوط کے عمل جیسا عمل کرنے والے اور جس سے کیا گیا حدیث کے مطابق دونوں کو مار دینے کا حکم ہے کیا یہ عمل کئے جانے کے بعد کوئی بھی نیک عمل قبول نہیں ہو گا؟ کیونکہ اس حکم سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کو جینے کا کوئی حق نہیں نیز یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ کام جاہلیت میں ہے۔

ج گناہ کسی قسم کا بھی ہو اللہ تعالیٰ توبہ کرنے سے معاف کر سکتے ہیں۔ سورۃ الفرقان: ۶۸، ۶۹ میں اللہ تعالیٰ نے ناحق قتل زنا وغیرہ کے جرم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جو یہ کام کرے گا قیامت کے دن اسے دوگنا عذاب ملے گا اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا آگے فرمایا:

﴿ وَمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَّكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴾

"اور جس نے توبہ کرلی، اور نیک اعمال سرانجام دیئے، ان کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ

نیکیوں میں تبدیل کردیں گے اور اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا رحم کرنے والا ہے"

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

﴿ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ﴾ (التوبہ : ۵۳'۵۴)

"(اے محمد ﷺ) میرے ان بندوں سے کہہ دو جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہوئی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں اللہ تعالیٰ (توبہ سے) سارے گناہ معاف کر دیتا ہے"۔

اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان :

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ))

"گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں"

(ابنِ ماجہ وقال اسنادہ صحیح) واللہ تعالٰی اعلم از : (ع ۔ ع) مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۵ء)

کتاب

الْاَیْمَانِ وَالنُّذُوْرِ

قسم کا کفارہ

س: کسی عورت نے قسم اٹھائی اور پھر اس قسم کو کچھ وجوہات کی بنا پر توڑ دیا اب انتہائی معروف زندگی میں ساٹھ مسکینوں کو اکٹھا کرنا انتہائی مشکل ہے اور دو مہینے کے مسلسل روزے بھی نہیں رکھ سکتی تو کیا قسم کا کفارہ پیسوں کی شکل میں ادا کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ پیسے جہاد فنڈ میں بھیج سکتی ہے؟ (ایک مسلمان بہن)

ج: آپ نے سوال میں جو ساٹھ مسکینوں کا کھانا اور دو مہینوں کے روزوں کا کفارہ قرار دیا ہے وہ قسم کا کفارہ نہیں بلکہ ظہار کا ہے اور روزہ کی حالت میں بیوی سے مجامعت کا کفارہ ہے۔ قسم کا کفارہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ کی آیت ۸۹ میں ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ﴾

"اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری لغو قسموں پر نہیں پکڑے گا اور البتہ ان قسموں پر پکڑ ہو گی جو تم نے ارادۃً کھائی ہوں گی تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو درمیانی قسم کا کھانا کھلا دے جو اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے یا دس مسکینوں کو کپڑے پہنا دے یا ایک غلام آزاد کر دے اور جو ان میں سے کسی بھی کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم (قصداً) قسم کھاؤ (پھر اس کو توڑ دو)"۔

کفارہ میں صرف وہی اشیاء ادا کرنی چاہئیں جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں نصاً ذکر کی ہیں۔ پیسوں کا چونکہ اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں کیا اس لیے قیمت پیسوں کی صورت میں ادا کرنا درست نہ ہو گا۔ ابنِ قدامہ فرماتے ہیں :

((لَا يُجْزِئُ فِي الْكَفَّارَةِ اِخْرَاجُ قِيْمَةِ الطَّعَامِ فِيْ قَوْلِ اِمَامِنَا

وَمَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَغَيْرِهِمْ))
"قسم کے کفارہ میں قیمت ادا کرنا امام احمد، مالک، شافعی رحمہم اللہ کے نزدیک صحیح نہیں ہے"۔ (المغنی ج ۱۱ ص ۲۶۵)
بعض فقہاء نے جواز کا بھی فتویٰ دیا ہے لیکن ان کا استدلال انتہائی کمزور ہے۔
کفارہ کا مصرف قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے دس مساکین ذکر کیے ہیں کفارہ کا مصرف جہاد فنڈ نہیں ہے (کیونکہ نہ تو اللہ تعالیٰ نے اسے کفارہ کا مصرف قرار دیا ہے نہ اس کے رسول ﷺ نے)۔ از : (ع ۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ' نومبر/ ۱۹۹۴ء)

بیوی کے ساتھ حالتِ حیض میں جماع کا کفارہ

س حالت حیض میں بیوی سے جماع کرنے کی صورت میں آدمی اگر کچھ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دے تو یہ ہی کافی ہے؟ اگر کسی کو سونا' چاندی دینا پڑے گا تب اس کی مقدار کتنی ہوگی؟ (محمد عبداللہ' پشاور)

ج حالت حیض میں عورت سے جماع بہت بڑا گناہ ہے۔ اس کا اندازہ آپ رسول ﷺ کے اس فرمان سے لگائیں۔ آپ نے فرمایا :

((مَنْ اَتٰی حَائِضًا اَوِ امْرَاَةً فِي دُبُرِهَا اَوْ كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ.))

"جو شخص حائضہ عورت کے ساتھ جماع یا اپنی بیوی کے ساتھ قوم لوط والا عمل یا کسی نجومی کی باتوں کی تصدیق کرتا ہے اُس نے اس چیز کے ساتھ کفر کیا جو محمد ﷺ پہ نازل کی گئی ہے"۔ (ابوداؤد' نسائی' ترمذی وقال الالبانی صحیح)

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ اذیت ہے ان دنوں میں عورتوں سے علیحدہ رہو۔ ارشاد باری ہے :

﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ ﴾ (بقرہ : ۲۲۲)

"آپ سے وہ حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہو وہ گندگی ہے پس دور

رہو حیض میں عورتوں سے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ حائضہ سے حیض کی حالت میں جماع کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اتنے بڑے گناہ سے توبہ استغفار بھی ضروری ہے اور اس کا کفارہ بھی ادا کرے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں کہا جو حیض کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کرتا ہے:

((يَتَصَدَّقُ بِدِيْنَارٍ اَوْ بِنِصْفِ دِيْنَارٍ))

"وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے"۔ (ابوداؤد' نسائی' دارمی' ابنِ ماجہ' قال البانی صحیح وھذا سند علی شرط البخاری)

کہ اس حدیث کی سند بخاری کی شرط کے مطابق ہے۔ اس حدیث کو امام حاکم' ذہبی' ابنِ القطان' ابنِ دقیق العید' ابنِ القیم' ابنِ حجر' ابنِ الترکمانی سب نے صحیح کہا ہے۔ (ارواء الغلیل ۱/۲۱۷/۲۱۸)

یاد رہے کہ ایک دینار ساڑھے چار ماشے سونے کے برابر ہوتا ہے۔ ابنِ عباس سے صحیح سند سے اس کی تفسیر منقول ہے۔ فرماتے ہیں:

((اِذَا اَصَابَهَا فِي اَوَّلِ الدَّمِ فَدِيْنَارٌ وَاِذَا اَصَابَهَا فِي اِنْقِطَاعِ الدَّمِ فَنِصْفُ دِيْنَارٍ))

"کہ اگر خون جاری ہونے کی ابتداء میں جماع کیا ہے تو ایک دینار' اور اگر آخر میں کیا ہے تو نصف دینار ادا کرے گا"۔ (ابوداؤد' قال الالبانی صحیح موقوف)

ترمذی میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے یہ تفسیر بھی منقول ہے:

((اِذَا كَانَ دَمًا اَحْمَرَ فَدِيْنَارٌ وَاِذَا كَانَ اَصْفَرَ فَنِصْفُ دِيْنَارٍ))

"اگر خون سرخ تھا تو ایک دینار ادا کرے اور اگر زرد تھا تو نصف دینار"

(ترمذی' قال الالبانی صحیح موقوف) اا : (ع ۔ ع) (مجلۃ الدعوۃ' مئی / ۱۹۹۵ء)

كتاب

الْحَظْرِ وَالْإِبَاحَةِ

گانا بجانا

س: کیا گانا بجانا' گانا سننا وغیرہ جائز ہے۔ قرآن و سنت سے وضاحت کریں؟ (عبدالرشید سلفی' لاہور)

ج: گانا بجانا سننا حرام ہے اور شیطانی افعال میں سے ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴾ (لقمان)

"اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو لہو الحدیث خریدتے ہیں تاکہ بغیر علم کے اللہ کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کریں اور اس سے استہزاء کریں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے"۔

اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے تفسیر طبری میں جز ۲۱ ص ۶۱ پر مذکور ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ ... ﴾ کے بارے میں تین مرتبہ قسم کھا کر کہا کہ لہو الحدیث سے مراد گانا بجانا ہے۔ اس طرح مفسر قرآن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے لہو الحدیث کی تفسیر گانا بجانا اور گانا سننا منقول ہے۔

سیدنا جابر' مجاہد اور عکرمہ جیسے جلیل القدر مفسرین نے بھی لہو الحدیث سے گانا بجانا وغیرہ ہی مراد لیا ہے۔ جب اللہ تعالی نے ابلیس کو مہلت دی تو اسے کہا:

﴿ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ ﴾ (بنی اسرائیل : ۶۴)

"اور ان میں سے جس کو بھی تو بہکا سکتا ہے اپنی آواز سے بہکاتا رہے"۔

اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس آیت سے مراد:

((كُلُّ دَاعٍ دَعَا إِلَى مَعْصِيَةِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ))

"ہر وہ آدمی ہے جو اللہ کی نافرمانی کی طرف دعوت دیتا ہے"۔

سیدنا مجاہد نے اس آیت کی تفسیر یہ مروی ہے کہ اس سے مراد گانا بجانا اور لہو و لعب ہے۔ (تفسیر ابنِ کثیر ۳/۴۰) یعنی وہ تمام آوازیں (جیسا کہ گانا بجانا' عشقیہ اشعار وغیرہ) جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف بلاتی ہیں' وہ اس آیت کا مصداق ہیں۔

بخاری شریف میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

((لَيَكُوْنَنَّ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّوْنَ الْحِرَ وَالْحَرِيْرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ))

"میری اُمت میں ایسی قومیں ہوں گی جو زنا' ریشم' شراب اور باجے گاجے حلال سمجھیں گی"۔ (کتاب الاشربہ بخاری مع فتح الباری (۴) ۱۰/۵۳)

یعنی زنا' ریشم' شراب اور باجے گاجے جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے' بعض لوگ انہیں حلال سمجھیں گے۔ اور آج وہ قومیں اکثر پائی جاتی ہیں جو گانا بجانا شراب وغیرہ کوئی عیب نہیں سمجھتیں بلکہ گانے بجانے کے آلات' ٹی وی' وی سی آر اور گانوں کی کیسٹوں کی صورت میں ان کے گھروں میں موجود ہیں بلکہ شیطانیت اس قدر ترقی کر رہی ہے کہ ڈش انٹینا کی صورت میں اس برائی کو دن رات پھیلایا جا رہا ہے اور مسلمانان عالم کی ذلت کا سبب بھی یہی ہے کہ انہوں نے اپنی اسلامی تہذیب ترک کر کے غیر مسلموں اور ہندوؤں وغیرہ کی تہذیب و تمدن کو اپنا لیا ہے اور ان کی پیروی میں گانا بجانا اور رقص وغیرہ کو اپنا لیا۔ اللہ تعالیٰ حرام سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے :

حضرت ابی مالک اشعری کہتے ہیں :

((قَالَ قَالَ رسولَ اللّٰهِ ﷺ لَيَشْرِبَنَّ نَاسٌ مِنْ أُمَّتِي الْخَمْرَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا يُعْزَفُ عَلٰى رُءُ وْسِهِمْ بِالْمَعَازِفِ وَالْمُغَنِّيَاتِ يَخْسِفُ اللّٰهُ بِهِمُ الْأَرْضَ وَيَجْعَلُ مِنْهُمْ قِرَدَةً وَخَنَازِيْرَ.))

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' البتہ میری اُمت میں سے لوگ ضرور شراب پئیں گے

اور اس کے نام کے علاوہ کوئی اور نام رکھیں گے۔ ان کے سروں پر باجے گاجے بجائے جائیں گے اور گانے والیاں (گانے گائیں گی)۔ اللہ تعالیٰ انھیں زمین میں دھنسادے گا ان میں سے بندر اور سور بنادے گا۔"

(ابنِ ماجہ' کتاب الفتن ۲/۱۳۳۳)

امام ابنِ قیم نے اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اس طرح علامہ البانی نے بھی اسے سلسلہ صحیحہ میں شمار کیا ہے۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((فِي هٰذِهِ الْأُمَّةِ خَسْفٌ وَّمَسْخٌ وَّقَذْفٌ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَتٰى ذٰلِكَ؟ قَالَ إِذَا ظَهَرَتِ الْقِيَانُ وَالْمَعَازِفُ وَشُرِبَتِ الْخُمُوْرُ.))

"اس اُمت میں زمین میں دھنسانا' صورتیں بدلنا اور پتھروں کی بارش جیسا عذاب ہوگا تو مسلمانوں میں سے ایک مرد نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ کب ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا جب گانے والیاں اور باجے گاجے ظاہر ہوں گے اور شرابیں پی جائیں گی"۔

(سلسلة الاحاديث الصحيحه ۱۶۰۴' كتاب الفتن' صحيح ترمذى ۲/۲۴۲)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ گانا بجانا' آلاتِ لہو مثلاً ٹی وی' وی سی آر' وی سی پی' ویڈیو گیمز اور گانے وغیرہ کی کیسٹیں تمام شیطانی آلات سے ہیں۔ ان کا بجانا اور سننا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام برائیوں سے محفوظ رکھے۔

(مجلۃ الدعوۃ' جولائی / ۱۹۹۳ء)

ماتم اور شبیہوں کی شرعی حیثیت

س کیا مصیبت کے وقت بے صبری کا مظاہرہ کرنا' گریبان چاک کرنا' اپنے سینے پر تھپڑ مارنا اور تعزیہ و شبیہہ لے کر بازاروں میں نکلنا قرآن و سنت اور ائمہ اہل بیت سے ثابت ہے؟

ج اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مصیبت کے وقت صبر کی تلقین کی ہے

اور گریبان چاک کرنا' سینہ کوبی کرنا وغیرہ صبر کے خلاف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴾

(البقرۃ : ۱۵۳)

"اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد لو۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

انسان کو احکام شریعت پر عمل کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں اور مصائب و آلام برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ صبر و صلاۃ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہترین معاون ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے "مومن کے لئے ہر حال میں بہتری ہے تکلیف کی حالت میں صبر کرتا ہے اور خوشحالی میں شکر گزار رہتا ہے"۔ (تفسیر ابنِ کثیر' قرطبی)

اس آیت کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کے احکامات اور مومنین کی آزمائش کا ذکر کیا ہے کہ :

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ﴾

(البقرۃ : ۱۵۴ تا ۱۵۶)

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جائیں انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو کسی ایک چیز کے ساتھ ڈر سے اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی کے ساتھ اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ ﴿ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ﴾ کہتے ہیں"۔

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ مومن آدمی کو اللہ تعالیٰ مختلف طرق سے آزماتا ہے۔ کبھی خوف و ڈر کے ذریعے' کبھی جانوں اور مالوں کی کمی کے ذریعے اور

کبھی پھلوں کے نقصانات سے۔ ایمان وار آدمی کو جب ان تکالیف میں سے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ بے صبری نہیں کرتا بلکہ صبر کے ساتھ ان مصائب کو برداشت کرتا ہے جو لوگ مصیبت یا پریشانی دیکھ کر بے صبری کریں اور واویلا برپا کر دیں' گریبان چاک کریں' بال نوچیں وہ نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق اُمت محمدؐ سے نہیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَابِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ.))

"جس شخص نے رخسار پیٹے اور گریبان چاک کیا اور جاہلیت کے واویلے کی طرح واویلا کیا وہ ہم میں سے نہیں" (بخاری مع فتح ۱۶۳/۳' مسلم ۱۶۰' نسائی ۱۹/۴' منتقی لابن جارود ۵۱۶' ترمذی ۹۹۹' ابن ماجہ ۱۰۸۴' احمد ۳۸۶/۱' ۴۳۲' بیہقی ۶۳/۴)

عشرہ محرم الحرام میں جو لوگ سیدنا علی' سیدنا حسین اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہم کا نام لے کر گلی کوچوں میں نکلتے ہیں اور گریبان چاک کرتے ہیں' سینہ کوبی کرتے ہیں' ان کا یہ عمل قرآن و سنت کے خلاف ہونے کے علاوہ ائمہ اہل بیت اور مجتہدین فقہ جعفریہ کے فتاویٰ کے بھی خلاف ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق یہ قبیح عمل ۳۵۲ھ دس محرم الحرام کو بغداد میں معزالدولہ شیعہ کے حکم سے جاری ہوا ہے۔ اس سے قبل اس عمل قبیح کا نام و نشان نہیں ملتا۔ تاریخ ابنِ اثیر ص ۱۹۷ پر مرقوم ہے:

"عشرہ محرم الحرام میں اس قبیح رسم کا رواج بغداد میں معزالدولہ شیعہ سے ہوا جس نے دس محرم ۳۵۲ھ کو حکم دیا کہ دوکانیں بند کر دی جائیں' بازار اور خرید و فروخت کا کام روک دیا جائے اور لوگ نوحہ کریں' مکمل کالا لباس پہنیں' عورتیں پراگندہ ہو کر گریبان چاک کریں' پیٹتی ہوئی شہر کا چکر لگائیں"۔

ہم فقہ جعفریہ کی معتبر کتاب سے چند روایات درج کرتے ہیں:

((عَنْ اَبِي عَبْدِاللّٰهِ قَالَ اِنَّ الصَّبْرَ وَالْبَلَاءَ لَيَاْتِيَانِ اِلَى الْمُؤْمِنِ فَيَاْتِيْهِ الْبَلَاءُ وَهُوَ صَبُوْرٌ وَاِنَّ الْجَزَعَ وَالْبَلَاءَ لَيَاْتِيَانِ اِلَى الْكَافِرِ

فَیَأْتِیهِ الْبَلَاءُ وَهُوَ جَزُوعٌ.))

"امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا یقیناً صبر اور آزمائش دونوں مومن پر آتے ہیں۔ مومن پر جب آزمائش آتی ہے تو وہ صبر کرنے والا ہوتا ہے اور بے صبری اور آزمائش دونوں کافر پر آتے ہیں جب اس پر آزمائش آتی ہے تو وہ بے صبری کرتا ہے" (فروع کافی کتاب الجنائز ۱/۱۳۱)

امام جعفر صادق کے اس فتویٰ سے معلوم ہوا کہ صبر کرنے والا مومن ہے اور جو بے صبری کرتا ہے وہ مومن نہیں ہے۔

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِفَاطِمَةَ إِذَا أَنَا مِتُّ فَلَا تَخْمُشِيْ عَلَيَّ وَجْهًا وَّلَا تُرْخِيْ عَلَيَّ شَعْرًا وَّلَا تُنَادِيْ بِالْوَيْلِ وَلَا تُقِيْمِيْ عَلَيَّ نَائِحَةً))

"رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے فرمایا جب میں مرجاؤں تو مجھ پر چہرہ نہ نوچنا اور نہ مجھ پر اپنے بال بکھیرنا اور نہ واویلا کرنا اور نہ مجھ پر نوحہ کرنا"

(فروع کافی کتاب النکاح ص ۲۲۸)

((قَالَ أَبُوْعَبْدُاللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا يَنْبَغِيْ الصِّيَاحُ عَلَى الْمَيِّتِ وَلَا شَقُّ الثِّيَابِ))

"امام جعفر صادق نے فرمایا میت پر چیخ و پکار اور کپڑے پھاڑنا جائز نہیں"

(فروع کافی ۱/۱۸۸)

((قَالَ أَبُوْ جَعْفَرٍ مَنْ جَدَّدَ قَبْرًا أَوْ مَثَّلَ مِثَالًا فَقَدْ خَرَجَ عَنِ الْإِسْلَامِ.))

"امام باقر نے فرمایا، جس نے قبر کی تجدید کی یا کوئی شبیہ بنائی، وہ اسلام سے خارج ہو گیا" (من لا یحضرہ الفقیہ باب النوادر)

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلْطِمْنَ خَدًّا وَّلَا تَخْمِشْنَ وَجْهًا وَّلَا تَنْتِفْنَ شَعْرًا وَّلَا تَشْقُقْنَ جَيْبًا وَّلَا تُسَوِّدْنَ

ثَوْبًا وَلَا تَدْعِيْنَ بِالْوَيْلِ.))

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "رخسار ہرگز نہ پیٹنا اور نہ ہی چہرہ نوچنا اور نہ بال اکھیڑنا اور نہ گریبان چاک کرنا اور نہ کپڑے سیاہ کرنا اور نہ واویلا کرنا"

(فروع کافی 'کتاب النکاح ص ۲۲۸)

مندرجہ بالا فقہ جعفریہ کی پانچ روایات سے معلوم ہوا کہ فقہ جعفریہ میں بھی نبی اکرم ﷺ ' امام باقر اور امام جعفر صادق وغیرہ سے روایات موجود ہیں جو اس بات پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں کہ مصیبت کے وقت بال بکھیرنا' چہرے پیٹنا' سینہ کوبی کرنا' واویلا کرنا' مرثیے پڑھنا' شبیہیں بنانا' قبروں کی تجدید کرنا ناجائز اور حرام ہیں۔ لہٰذا پنج تن کا نعرہ لگانے والوں کو مذکورہ بالا فقہ جعفریہ کے پانچ دلائل کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے اور اس کی خلاف ورزی کرنے سے باز آ جانا چاہیے۔

(مجلہ' الدعوۃ' جون/ ۱۹۹۴ء)

کتا' شریعت کی نظر میں

سوال میرے باپ نے گھر کی رکھوالی کے لیے ایک کتا رکھا ہوا ہے۔ پچھلے ایک سال سے جب سے مرکز الدعوۃ سے منسلک ہوا ہوں' مجھے کئی ساتھیوں نے کہا کہ اس کو مار دو۔ سوال آپ سے یہ ہے کہ کیا کتے کا گھر میں رکھنا جائز ہے یا ناجائز؟ اور کیا اگر میں اسے مار دوں تو مجھ پر کوئی گناہ تو نہ ہو گا؟ (ابو محمد اعزاز الرحمٰن' سول لائنز جہلم)

ج اگرچہ غیر مسلم اقوام میں کتے کو بہت اہمیت حاصل ہے حتیٰ کہ وہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور ان کے ہاں یہ محاورہ بن گیا ہے کہ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو میرے کتے سے بھی محبت کرنا ہو گی۔ یہاں تک کہ اب یہ محبت بڑھ کر غلط مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ اسلام میں کتا ایک ناپسندیدہ جانور ہے اسے گھر میں رکھنے سے رحمت کے فرشتے گھر میں داخل نہیں ہوتے:

((عَنْ أَبِيْ طَلْحَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُ

الْمَلَائِکَةُ بَیْتًا فِیْهِ کَلْبٌ وَّلَا تَصَاوِیْرُ.))

"ابو طلحہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (رحمت کے) فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا تصویریں ہوں"

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ باب التصاویر)

ایک دفعہ وعدہ کے باوجود جبریل علیہ السلام گھر میں نہیں آئے۔ رسول اللہ ﷺ بہت غمگین ہوئے بعد میں معلوم ہوا کہ حسن رضی اللہ عنہ یا حسین رضی اللہ عنہ جو ابھی بچے تھے، گھر میں کتے کا پلا لے آئے تھے۔

۲) اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اس کا پانی گرا دینے اور اسے سات دفعہ دھونے کا حکم ہے:

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ طُهُوْرُ اِنَاءِ اَحَدِکُمْ اِذَا وَلَغَ فِیْهِ الْکَلْبُ اَنْ یَّغْسِلَهٗ سَبْعَ مَرَّاتٍ اُوْلَاهُنَّ بِالتُّرَابِ اَخْرَجَهٗ مُسْلِمٌ وَّفِیْ لَفْظٍ لَّهٗ فَلْیُرِقْهُ))

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں کتا منہ ڈال جائے تو اسے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے سات مرتبہ دھوئے جن میں سے پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ ہو۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور اس کے ایک لفظ میں ہے کہ اسے گرا دو"

(بلوغ المرام، باب المیاہ، کتاب الطہارۃ)

۳) خالص سیاہ رنگ کا کتا نمازی کے آگے سے گزر جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے اگر اس کے سامنے سترہ نہ ہو اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ: ((اَلْکَلْبُ الْاَسْوَدُ شَیْطَانٌ)) "سیاہ کتا شیطان ہے"۔ (صحیح مسلم باب ما یستر المصلی)

۴) خالص سیاہ کتے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

((عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْلَا اَنَّ الْکِلَابَ اُمَّةٌ مِّنَ الْاُمَمِ لَاَمَرْتُ بِقَتْلِهَا کُلِّهَا فَاقْتُلُوْا مِنْهَا کُلَّ

اَسْوَدَ بَھِیْمٍ.))

"عبداللہ بن مغفل راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اگر یہ بات نہ ہوتی کہ کتے امتوں میں سے ایک اُمت ہیں تو میں تمام کتے مار ڈالنے کا حکم دے دیتا تو تم ان میں سے خالص سیاہ کو مار دو" (ابوداؤد' ترمذی' مشکوۃ باب ذکر الکلب)

۵) اسی طرح دو نقطوں والے سیاہ کتے کو بھی مارنے کا حکم دیا :

((عَنْ جَابِرٍ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِقَتْلِ الْکِلَابِ حَتّٰی اَنَّ الْمَرْءَۃَ تَقْدَمُ مِنَ الْبَادِیَۃِ بِکَلْبِھَا فَنَقْتُلُہٗ ثُمَّ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِھَا وَ قَالَ عَلَیْکُمْ بِالْاَسْوَدِ الْبَھِیْمِ ذِی النُّقْطَتَیْنِ فَاِنَّہٗ شَیْطَانٌ.))

"جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کتے مار ڈالنے کا حکم دیا یہاں تک کہ بادیہ سے کوئی عورت اپنا کتا لے کر آتی تو ہم اسے مار ڈالتے۔ پھر رسول اللہ نے انہیں قتل کرنے سے منع فرمادیا اور فرمایا تم دو نقطوں والے کالے سیاہ کتے کو مارو کیونکہ وہ شیطان ہے (دو نقطوں سے مراد ہے جس کی آنکھوں کے اوپر نقطے ہوں)"۔ (رواہ مسلم)

۶) اللہ تعالیٰ کی آیات کا علم حاصل ہونے کے بعد خواہشات نفس کی پیروی کی وجہ سے ان سے نکل جانے والے کی مثال کتے کے ساتھ دی گئی ہے ﴿ وَاتَّبَعَ ھَوٰہُ فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ الْکَلْبِ ﴾ (دیکھئے اعراف : ۱۷۵' ۱۷۶)

بدترین انسان یعنی برے عالم کی مثال کتے کے ساتھ دینے سے اس کی خست (ذلت) واضح ہے۔

۷) اپنے ہبہ کو واپس لینے والے کی مثال کتے کے ساتھ دی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((لَیْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ الَّذِیْ یَعُوْدُ فِیْ ھِبَتِہٖ کَالْکَلْبِ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ.))

"بری مثال ہمارے لیے نہیں ہے جو شخص اپنا ہبہ واپس لیتا ہے' وہ کتے کی طرح ہے جو اپنی قے دوبارہ چاٹ لیتا ہے" (صحیح بخاری کتاب الھبة)

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنے آپ کو کتا قرار دیتے ہیں خواہ وہ شیخ جیلانی کے کتے بنیں یا مدینہ کے کتے (سگ مدینہ) یا رسول اللہ ﷺ کے کتے' انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس جانور کے ساتھ نفرت کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اس چیز کے ساتھ خود کو تشبیہ دینا کیسے درست ہو سکتا ہے جس سے نبی ﷺ سخت نفرت رکھتے ہوں۔

کتا رکھنے کی تین صورتیں

گھر میں فرشتوں کے داخل نہ ہونے' منہ ڈالنے کی وجہ سے برتنوں کے ناپاک ہو جانے اور دوسرے اسباب کی بنا پر گھر میں کتا رکھنا جائز نہیں۔ مگر کتے میں کچھ فائدے بھی ہیں مثلاً سدھائے جانے کی قابلیت' مانوس ہو جانا' پہرہ داری وغیرہ۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے تین قسم کا کتا رکھنے کی اجازت دی ہے۔ شکار کے لئے' کھیتی کے لیے یا مویشیوں کے لئے۔ ان کے علاوہ اگر کوئی شخص کتا رکھے گا تو روزانہ اس کے اجر سے ایک قیراط کی کمی ہو جائے گی (قیراط اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر پیمانہ ہے جنازہ میں شامل ہونے کے ثواب والی حدیث میں مذکور قیراط کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے)

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا اِلَّا كَلْبَ مَاشِیَةٍ اَوْ صَیْدٍ اَوْ زَرْعٍ انْتَقَصَ مِنْ اَجْرِهٖ كُلَّ یَوْمٍ قِیْرَاطٌ.))

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مویشیوں کے لیے یا شکاری کتے یا کھیتی کے علاوہ کسی نے کوئی کتا رکھا تو اس کے اجر سے روزانہ ایک قیراط کم ہو جائے گا"۔ (بخاری ومسلم)

اس سے معلوم ہوا کہ صرف گھر کی حفاظت کے لیے کتا رکھنا جائز نہیں۔ بعض لوگ قیاس کر کے اسے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس صورت میں تین

کتوں کو مستثنیٰ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔

کتے کو قتل کرنے کا حکم

جن کتوں کو رکھنے کی اجازت دی گئی ہے انہیں مارنا جائز نہیں۔ رہے عام کتے جو ان تین کاموں میں سے کوئی کام بھی سرانجام نہیں دیتے' ان میں سے خالص سیاہ رنگ کے کتے اور سیاہ رنگ کے اس کتے کو جس کی آنکھوں کے اوپر دو نقطے ہوں' مار ڈالنے کا حکم ہے۔ جیسا کہ شروع میں احادیث ذکر ہو چکی ہیں۔ اس رنگ کے کتے خواہ شکاری ہوں یا کھیتی کے یا مویشیوں کے شیطان ہونے کی وجہ سے مار دینے چاہئیں۔ اسی طرح کاٹنے والے کتے کو بھی مار ڈالنے کا حکم ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((خَمْسٌ فَوَاسِقُ يُقْتَلْنَ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ الْحَيَّةُ وَالْغُرَابُ الْاَبْقَعُ وَالْفَارَةُ وَالْكَلْبُ الْعَقُوْرُ وَالْحُدَيَّا.))

"یعنی پانچ چیزیں فاسق ہیں انہیں حرم اور غیر حرم میں قتل کیا جائے سانپ اور سیاہ و سفید کوا' چوہیا' کاٹنے والا کتا اور چیل" (مشکوۃ کتاب المناسک)

عام کتے جو نقصان نہ کرتے ہوں' انہیں مارنا جائز نہیں کیونکہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ بادیہ سے کوئی عورت اپنے کتے کے ساتھ آتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم اسے مار ڈالتے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے انہیں قتل کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا کہ کالے سیاہ دو نقطوں والے کتے کو قتل کرو کیونکہ وہ شیطان ہے۔

آپ کے والد صاحب نے گھر میں کتا رکھا ہوا ہے اگر شکار یا کھیتی یا مویشیوں کے لیے رکھا گیا ہے تو اس کے رکھنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہ خالص سیاہ رنگ یا دو نقطوں والا سیاہ کتا نہ ہو۔ اگر اس رنگ کا ہو تو اسے مار دینا واجب ہے۔ اگر وہ شکاری کتا یا کھیتی یا مویشیوں کا کتا نہیں تو اسے گھر سے نکال دیں۔ ہاں اگر وہ لوگوں کو یا ان کے جانوروں کو کاٹنا شروع کر دے تو اسے مار دینا جائز ہے کیونکہ اس صورت

میں وہ کلب عقور ہے یعنی کاٹنے اور زخمی کرنے والا کتا ہے۔

از : (ع ۔ م) (مجلۃ الدعوۃ' ستمبر/ ۱۹۹۴ء)

سگ مدینہ

س کیا اپنے آپ کو سگ مدینہ یعنی "مدینے کا کتا" کہنا یا لکھنا جائز ہے؟ قرآن و سنت کی رو سے وضاحت فرمائیں؟ (حاجی محمد فاروق' ۹۲۔ ای بورے والا)

ج اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق بڑے بہترین انداز میں فرمائی اور اس کو اپنی مخلوقات پر شرف و بزرگی عطا کی۔ عقل و شعور کے ذریعے جانوروں سے ممتاز کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ﴾ (اسراء : ۷۰)

"یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت عطا اور خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ہم نے ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا۔ اور انہیں بہت سی مخلوقات پر فضیلت و برتری عنایت کی"۔

جس خالق نے انسان کو احسن تقویم میں تخلیق کیا اور اسے اپنی دیگر مخلوقات پر برتری و منزلت اور اعلیٰ مقام عطا کیا' اگر انسان اس کا صحیح شکر گزر بندہ بن کر رہتا ہے تو وہ کبھی بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس انسان کی مثال کتے سے دی جائے کیونکہ کتا نجس و پلید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتے کی مثال مکذبین کی پیش کی ہے یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلاتے اور استہزاء کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مثال کتے سے دی ہے اور اسے بری مثال کہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذَلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ

لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ سَاءَ مَثَلاً الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴾ (اعراف : ۱۷۵ تا ۱۷۷)

"(اے پیغمبر ﷺ) ان پر اس آدمی کا قصہ تلاوت کیجئے جس کو ہم نے اپنی آیات دیں۔ وہ ان میں سے نکل گیا (کافر ہو گیا' اللہ سے پھر گیا) سو شیطان اس کے پیچھے لگ۔ وہ گمراہوں سے ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی وجہ سے اس کا رتبہ بلند کرتے لیکن اس نے زمین پر گرنا چاہا اور اپنی خواہش پر چلا تو اس کی مثال کتے کی طرح ہے۔ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی زبان لٹکائے یا اگر (اپنے حال پر) اس کو چھوڑ دے) تب بھی زبان لٹکائے۔ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ پس آپ ان پر یہ قصے بیان کر دیں تاکہ وہ غور و فکر کریں جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے' ان کی مثال بری ہے"

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ کتے کی مثال ان لوگوں کی ہے جو اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے مکذبین ہیں۔ اس کی آیات کی تصدیق کرنے والے صحیح مسلمانوں کی یہ مثال نہیں ہو سکتی۔ دوسری بات یہ عیاں ہوئی کہ کتے کی مثال بہت بری ہے۔ اس لیے کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو کتا یا کتے کی مثل قرار دیتے ہوئے سگ مدینہ کہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ الَّذِيْ يَعُوْدُ فِي هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِي قَيْئِهٖ.))

"ہمارے لیے بری مثال نہیں ہے وہ آدمی جو اپنے ہبہ میں رجوع کرتا ہے (یعنی کسی چیز کو ہیشہ کے لیے دے دیتا ہے پھر اس سے واپس لے لیتا ہے) اس کتے کی مثال ہے جو اپنی قے کی طرف رجوع کرتا ہے (یعنی قے کرنے کے بعد اس کو چاٹتا اور کھاتا ہے) "

(بخاری ۳/۱۴۴ (۲۶۲۳)' احمد ۱/۲۱۷' ترمذی ۳/۵۹۲' نسائی مع حاشیہ سندھی ۲/۱۸۷)

حدیث مبارکہ سے بھی معلوم ہوا کہ کتے کی مثال بہت بری مثال ہے اور آپ

کے فرمان کے مطابق یہ کسی مسلمان کی مثال نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو "سگ" یعنی کتا کہے کیونکہ کتا اتنا نجس و پلید ہے کہ جس برتن میں منہ ڈال دے' اسے شریعت مطہرہ کی رو سے سات مرتبہ دھونا پڑتا ہے کیونکہ ختم الرسل سید الانبیاء محمد ﷺ کا ارشاد گرامی ہے :

((اِذَا وَلَغَ الْكَلْبُ فِي اِنَاءٍ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ.))

"جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اسے سات مرتبہ دھونا چاہئے" (بخاری مع فتح الباری ۱/۲۳۹-۲۴۰' مسلم مع نووی ۳/۱۸۲' مسند ابی عوانہ ۱/۲۰۷' نسائی ۱/۵۲-۵۳' ابن ماجہ ۱/۱۴۹' حمیدی ۲/۴۲۸' ابن خزیمہ ۱/۵۱' احمد ۲/۲۴۵' شرح السنہ ۲/۷۳' دار قطنی ۱/۶۳-۶۴)

اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے :

"ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے کا وعدہ کیا لیکن جبرئیل علیہ السلام نہ آئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی' آپ نے اسے پھینک دیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا نہ اس کے قاصد وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ پھر آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک پلا یعنی کتے کا بچہ چارپائی کے نیچے دکھائی دیا۔ آپ نے فرمایا' اے عائشہ یہ پلا اس جگہ کب آیا؟ انہوں نے کہا اللہ کی قسم مجھے علم نہیں' پھر آپ نے حکم دیا وہ باہر نکالا گیا۔ اس وقت جبرئیل علیہ السلام آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اور میں تمہارے انتظار میں بیٹھا تھا لیکن تم نہیں آئے تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا :

((مَنَعَنِي الْكَلْبُ الَّذِي كَانَ فِي بَيْتِكَ اِنَّا لاَ نَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَّلاَ صُوْرَةٌ.))

"یہ کتا جو آپ کے گھر میں تھا' اس نے مجھے روک رکھا تھا جس گھر میں کتا اور تصویر ہو' ہم وہاں داخل نہیں ہوتے"

(مسلم ۲/۱۹۹' ترمذی' ابوداؤد ۴/۷۳' مسند احمد ۱/۸۰' ۲/۸۳)

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ کتا اتنا پلید و نجس جانور ہے جہاں یہ ہو وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے اور جس برتن میں کتا منہ ڈال دے وہ برتن سات مرتبہ دھونا پڑتا ہے۔ لہٰذا انسان کو اتنے نجس و پلید جانور کے مثال نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی اپنے آپ کو مدینے کا کتا کہنا چاہیے۔ یہ احکامات آپؐ کے مدینہ سمیت ہر جگہ کے کتوں سے متعلق ہیں۔

جو لوگ اپنے آپ کو سگ مدینہ کہتے ہیں' وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نسبت انتہائی تذلل و عاجزی پر مبنی ہے حالانکہ یہ شیطانی فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ اگر یہ نسبت تذلل و عجز و انکساری والی ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' تابعین عظام اور تبع تابعین رحمہم اللہ اس سے محروم نہ ہوتے۔ خیر القرون کے لوگوں میں اس طرح کی نسبت کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ کسی نے اپنے آپ کو مدینے کا کتا کہا ہو۔ یہ نسبت موجودہ دور کے متصوفین اور قبوری لوگوں میں ہی پائی جاتی ہے اور جو اپنے آپ کو سگ مدینہ کہتے ہیں' ان کا دماغ اس قدر مفلوج و ماؤف ہو چکا ہے کہ وہ کتوں کو بھی ولی اور صاحب کرامت بزرگ سمجھنے لگ گئے ہیں۔ جیسا کہ مولوی اشرف علی تھانوی اپنی کتاب امداد المشتاق ص ۱۵۸ میں اور حاجی امداد اللہ اپنی کتاب شمائم امدادیہ ص ۶۷ حصہ دوئم پر لکھتے ہیں:

> "جنید بغدادی بیٹھے تھے ایک کتا سامنے سے گزرا' آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی' اس قدر صاحب کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سب کتوں نے اس کے گرد بیٹھ کر مراقبہ کیا"۔

اسی طرح مولوی منظور احمد شاہ اپنی کتاب مدینۃ الرسول ص ۴۰۸ پر "مدینۃ الرسول کے سگانِ محترم اور چند یادیں" کے عنوان کے تحت جماعت علی شاہ کا واقعہ لکھتا ہے کہ:

> "آپ اپنے احباب میں مدینۃ الرسول کی کسی گلی میں کھڑے تھے کہ سامنے سے ایک زخمی کتا چیختا ہوا گزرا۔ اس کتے کو کسی نے پتھر مارا تھا۔ سید صاحب اس منظر

کو دیکھ کر بے خود ہو گئے۔ اس بے خودی میں سگ طیبہ کو کلاوے میں لے لیا۔ اپنی دستار سے اس کا خون صاف کیا' پھر ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا' اے سگ طیبہ' خدارا بارگاہ رسالت میں میری شکایت نہ کر دینا پھر دیر تک سگ طیبہ کو کلاوے میں لے کر روتے رہے۔"

اسی طرح صفحہ ۴۰۹ پر لکھتا ہے :

"۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ پیر سید حیدر علی شاہ نے مجھے مدینۃ الرسول میں یہ واقعہ سنایا۔ ایک حاضری پر سیدنا نے فرمایا' آج مدینۃ الرسول کے درویشوں کی دعوت ہے' دیگیں پکوادی گئیں' بازار سے نئے برتن منگوا لیے گئے۔ عرض کی گئی حضور درویشوں کی آمد کا سلسلہ کب شروع ہو گا؟ فرمایا یہ درویش آئیں گے نہیں تمہیں ان کے حضور جا کر نذرانہ خود پیش کرنا ہو گا۔ فرمایا' یہ روٹیاں' یہ گوشت مدینہ منورہ کے سگانِ محترم کو پیش کیا جائے۔ چنانچہ تلاش کر کے حکم کی تعمیل کی گئی"۔

اسی طرح ص ۴۰۹' ۴۱۰ پر "سگ طیبہ کی نوازش" کے عنوان کے تحت رقمطراز ہے۔

"ایک حاضری میں مدینہ منورہ سے واپسی کی ساری رات سگانِ مدینہ کی زیارت میں صرف کر دی۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ ان کی قدم بوسی کر کے مدینہ سے رخصت ہوں۔ یہ بھی شوق تھا کہ سگ طیبہ کی آواز بھی ریکارڈ کر لوں۔ ٹیپ لے کر گھومتا رہا' کسی سگ نے مجھے اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ جوں ہی کسی سگ طیبہ کے قریب گیا اُس نے مجھ سے نفرت کی اور دور چلا گیا۔ سحری کے قریب ایک سگ طیبہ کو سویا ہوا پایا دور بیٹھ گیا کہ اس کی بیداری پر سلام عرض کروں گا۔ ایک کار کی آواز سے وہ بیدار ہو گیا۔ میں نے قریب جانے کی کوشش کی تو وہ نفرت سے بھاگ گیا۔ میں نے وہیں کھڑے منت سماجت کی اور خدا کے لیے قدم بوسی کا موقع دے دو۔ صبح مدینہ چھوٹ رہا ہے پھر قسمت کی بات ہے

ع بات بنتی ہے میری' تیرا بگڑتا ہے کیا

مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میری اس عاجزانہ درخواست پر وہ رک گیا۔ میں قریب ہوا تو 'قدم بوسی کی' اس کی آواز ٹیپ کی اور صبح کی اذان ہوتے ہی میں وہاں سے چلا تو کم و بیش ۵۰ قدم سگ طیبہ میرے ساتھ آیا' سگ طیبہ کی اس نوازش کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ مجھے قریب جانے کا موقع دیا اور ۵۰ قدم میرے ساتھ چل کر مجھے شرف بخشا"۔

قارئین کرام! مذکورہ بالا واقعات باحوالہ آپ کے سامنے ذکر کیے ہیں۔ ان سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جو انسان اللہ تعالیٰ کی توحید چھوڑ کر شرک کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے' رسول اللہ ﷺ کے صحیح منہج کو ترک کر کے بدعات اور رسوم و رواج سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی رحمت اُٹھا لیتا ہے' پھر وہ در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے حتیٰ کہ کتوں کو کلاوے میں لے کر روتا پھرتا ہے' کبھی وہ کتوں کو بوسہ دیتا ہے اور کبھی گلیوں میں کتوں کی محبت سے گھومتا ہوا راتیں گزارتا ہے اور کتے کی قدم بوسی اور آواز ریکارڈ کرنے کے لیے مارا مارا پھرتا ہے۔ کبھی کتوں سے عشق کا اظہار کرتے ہوئے انہیں درویش بنا دیتا ہے اور کتوں کے دربار پر نذرانہ لے کر پیش ہوتا ہے۔ یہ گندے کام اسی آدمی کی قسمت میں ہوتے ہیں جو رحمت ایزدگی سے دھتکار دیا جاتا ہے' پھر وہ اپنے آپ کو انسانیت سے خارج کر کے کتا کہنے لگتا ہے۔ کتا خواہ بریلی شریف کا ہو یا دیوبند کا مدینے کا ہو یا مکے کا غرض کسی جگہ کا بھی کیوں نہ ہو۔ اس کے متعلق شریعت مطہرہ کا یہی حکم ہے کہ وہ جس برتن میں منہ ڈال دے' وہ برتن پلید ہو جاتا ہے۔ جہاں موجود ہو' وہاں رحمت کا فرشتہ داخل نہیں ہوتا۔ وہ کتے مدینہ منورہ کے ہی تھے جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے یہ احکامات ارشاد فرمائے بلکہ بعض سگ مدینہ کو تو رسول اللہ ﷺ نے شیطان کہا جیسا کہ صحیح مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور مسند احمد وغیرہ میں حدیث ہے کہ:

((اَلْکَلْبُ الْاَسْوَدُ شَیْطَانٌ)) "سیاہ کتا شیطان ہے"

بعض سگ مدینہ وہ ہیں جن کے قتل کا حکم نبی ﷺ نے دیا فرمایا :

((عَلَيْكُمْ بِالأَسْوَدِ الْبَهِيمِ ذِي النُّقْطَتَيْنِ فَإِنَّهُ شَيْطَانٌ.))

"وہ کالا کتا جس کی آنکھوں پر دو نقطے ہوں' اسے قتل کردو اس لئے کہ وہ شیطان ہے" (مسلم 'کتاب البیوع)

اسی طرح سگ مکّہ معظمہ کو بھی حالتِ احرام میں قتل کرنا جائز ہے۔ (متفق علیہ)

اسی طرح ایک مقام پر فرمایا :

((إِذَا سَمِعْتُمْ نُبَاحَ الْكَلْبِ مِنَ اللَّيْلِ فَتَعَوَّذُوا بِاللَّهِ.))

"جب تم رات کو کتے کی آواز سنو تو اعوذ باللہ پڑھو"

(ابو داؤد' احمد' حاکم' بلوغ الامانی ۱۴/۳۶۰)

ان تمام مفاسد کی بنا پر نبی ﷺ نے کتے کی مثال کو برا قرار دیا ہے' اللہ تعالیٰ نے برا کہا ہے لہٰذا جس کی مثال کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے برا قرار دیا ہو تو کسی انسان کو لائق نہیں کہ وہ ان احکامات کو جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کتا کہے۔ اپنے آپ کو کتا کہنا عقل و نقل کے بھی خلاف اور ناجائز و غیر مشروع ہے۔

صرف ہاتھ یا پاؤں کی تصویر کا مسئلہ

س: مجلّۃ الدعوۃ میں اکثر اوقات ہاتھوں' ٹانگوں کی تصاویر چھپتی ہیں۔ مجھے اس بارے میں یا تو کسی عالم کا فتویٰ دکھا دیجئے یا قرآن و حدیث سے اس کی کوئی دلیل پیش کریں ورنہ اگر ہاتھ وغیرہ کو جائز قرار دیا جا سکتا تو آنکھوں اور جسم کے دوسرے ظاہری حصوں کی تصاویر بھی جائز قرار دی جا سکتی ہیں۔

(ابو یونس نوشاد احمد صدیقی' ولایت آباد کراچی)

ج: یہ بات درست ہے کہ شریعت اسلامیہ نے جاندار اشیاء کی تصاویر کو حرام قرار دیا ہے۔ تصاویر کے مٹانے کے حکم کے ساتھ جاندار اشیاء کی تصاویر بنانے والے پر لعنت کی گئی ہے اور قیامت کے دن کے سخت ترین عذاب کی وعید سنائی گئی ہے لیکن غیر جاندار چیزوں کی تصاویر اور جس تصویر کا سر کاٹ دیا گیا ہو' اس میں کوئی

حرج نہیں ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حدیث ہے' ایک آدمی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہنے لگا میں یہ تصویریں بناتا ہوں' مجھے ان کے بارے میں فتویٰ دیجئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہنے لگے قریب آؤ وہ قریب ہو گیا۔ انہوں نے کہا قریب آ جاؤ وہ اور قریب آیا تو انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور کہا :

((أُنَبِّئُكَ بِمَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ وَيُجْعَلُ لَهُ بِكُلِّ صُوْرَةٍ صَوَّرَهَا نَفْسًا تُعَذِّبُهُ فِي جَهَنَّمَ وَقَالَ إِنْ كُنْتَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَاصْنَعِ الشَّجَرَ وَمَا لَا نَفْسَ لَهُ.))

"میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے ہر تصویر بنانے والا آگ میں جائے گا' اس کے لیے اس کی بنائی ہوئی تصویر کے بدلہ میں ایک نفس (شخص) مقرر کر دیا جائے گا جو اس کو جہنم میں عذاب دے گا اور کہا کہ اگر تو نے ضرور ہی بنانی ہے تو پھر درختوں کی بنا لو یا جس چیز میں جان نہیں" (مسلم' کتاب اللباس' باب تحریم تصویر الحیوان)

اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ جس چیز میں جان نہیں اس کی تصویر بنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسری دلیل رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے کہا میں گزشتہ رات بھی آیا تھا۔ گھر میں اس لیے داخل نہ ہوا کہ دروازے پر تصویریں تھیں۔ گھر میں ایک پردے پر بھی تصاویر تھیں اور کتا بھی گھر میں تھا پھر کہا :

((فَمُرْ بِرَأْسِ التِّمْثَالِ الَّذِيْ فِي الْبَيْتِ يُقْطَعُ فَيَصِيْرُ كَهَيْئَةِ الشَّجَرَةِ وَمُرْ بِالسِّتْرِ فَلْيُقْطَعْ فَلْيُجْعَلْ مِنْهُ وِسَادَتَانِ مَنْبُوذَتَانِ تُوْطَئَانِ وَمُرْ بِالْكَلْبِ فَلْيُخْرَجْ فَفَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.))

"گھر والی تصاویر کے سر کے متعلق حکم دے دو کہ اسے کاٹ دیا جائے تو وہ درخت جیسی بن جائے گی اور پردے کو کاٹ کر اس کے دو گدے بنا لیے جائیں جو قدموں میں روندے جائیں اور کتے کو گھر سے نکال دیا جائے تو رسول اللہ ﷺ نے یہ کر دیا۔"

(صحیح سنن الترمذی' کتاب الاستیذان' باب ان الملائکہ لا تدخل بیتا فیہ صور)

اس حدیث کے پہلے جملہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ ساری تصویر میں حرام صرف سر ہی ہے۔ اس کو اگر کاٹ دیا جائے تو وہ درخت کی صورت جیسی بن جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ثابت ہوا کہ تصاویر والے پردے وغیرہ کو پھاڑ کر ایسی جگہ استعمال کر لیا جائے جو قدموں میں روندے جائیں یا جس سے ان کی خست ظاہر ہو تو اس میں بھی حرج نہیں ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں :

((اَمَّا الشَّجَرُ وَنَحْوُهُ مِمَّا لَا رُوْحَ فِيْهِ فَلَا تَحْرُمُ صَنْعَتُهُ وَلَا التَّكَسُّبُ بِهِ سَوَآءً الشَّجَرُ الْمُثْمِرُ وَغَيْرُهُ وَهٰذَا مَذْهَبُ الْعُلَمَاءِ كَافَّةً.))

"درخت اور اس جیسی اور چیزیں جن میں روح نہیں ہے ان کی تصویر بنانا حرام نہیں اور نہ ہی ان سے کمائی کرنا حرام ہے۔ یہ تمام علماء کا مذہب ہے"

(شرح مسلم نووی ج ۱۴' ص ۹۱)

اور ابن عثیمین لکھتے ہیں :

((اَمَّا الْجِسْمُ بِلَا رَأْسٍ فَهُوَ كَالشَّجَرَةِ لَا شَكَّ فِي جَوَازِهِ.))

"اور جسم سر کے بغیر درخت کی طرح ہے اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں۔"

(المجموع الثمین ص ۲۴۵' ج ۲) از : (ع - ع) (مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۵ء)

قوالی اور عرسوں کا کھانا

س: اسلام میں قوالی کی کیا اہمیت ہے؟ آج کل لوگ اسے عبادت سمجھ کر سنتے ہیں بلکہ بڑے بڑے عرسوں اور میلوں پر اسپیشل قوال بلائے جاتے ہیں اور وہ سر، ساز کے ساتھ قوالیاں گاتے ہیں۔ قرآن و سنت کی رو سے اس کی وضاحت فرمائیں۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ ان میلوں پر جو دیگیں پکا کر تقسیم کی جاتی ہیں، ان کا طعام و نذر کھانی جائز و درست ہے؟۔ (ابو حنظلہ)

ج: موجودہ دور میں قوالی کا سلسلہ بہت وسیع ہوتا جا رہا ہے اکثر گاڑیوں، بسوں وغیرہ میں صبح ہوتے ہی ڈرائیور حضرات قوالی کا سماع کرتے ہیں۔ بعض دفعہ یوں بھی ہوا کہ اگر کوئی ڈرائیور گاڑی چلاتے وقت گانے لگا دے اور اس کو منع کیا جائے تو وہ گانوں کی کیسٹ بند کر کے قوالی لگا دیتے ہیں۔ جب اس سے روکا جائے تو کہتے ہیں مولوی صاحب ہم نے گانے تو بند کر دیئے ہیں یہ تو قوالی ہے جو اسلام میں جائز ہے۔ حالانکہ قوالی گانے سے بھی بڑھ کر جرم ہے۔ اولاً اس لیے کہ قوالیوں میں شرکیہ باتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں پیروں اور فقیروں کے متعلق ایسی ایسی لغو باتیں بیان کی جاتی ہیں جو سراسر شریعت اسلامیہ سے متصادم اور رُوحِ اسلام کے خلاف ہوتی ہیں اور اللہ وحدہ لا شریک کے ساتھ مخلوق کو برابر سمجھنا سب سے بڑا گناہ ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں رسول مکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((أَكْبَرُ الْكَبَائِرِ الْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ.)) (کتاب المرتدین وغیرہ)

"تمام کبیرہ گناہوں سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے"

قوالیوں کے متعلق مجلہ الدعوۃ میں بالاقساط مدیر مجلّہ کے قلم سے کافی مواد شائع ہو چکا ہے۔

ثانیاً، ان تمام قوالیوں میں ڈھول، سارنگی، مزامیر اور آلاتِ لہو و لعب وغیرہ بجائے جاتے ہیں جو شرعاً بالکل حرام ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ

عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ○ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (لقمان ۶'۷)

"اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو گانے بجانے کے آلات کو خریدتے ہیں۔ اس لیے کہ سمجھ بوجھ کے بغیر اللہ تعالیٰ کی راہ سے (لوگوں کو) بہکادیں۔ اور اس کو ہنسی مذاق بنا دیں۔ ایسے لوگوں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہو گا۔ اور جب (ان لوگوں میں سے) کسی کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ اکڑتا ہوا پیٹھ موڑ کر چل دیتا ہے۔ گویا اس نے اس کو سنا ہی نہیں۔ گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں بوجھ ہے۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے"۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ اس آیت کریمہ میں ﴿لَهْوَ الْحَدِيْثِ﴾ سے کیا مراد ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

((اَلْغِنَاءُ وَاللّٰهِ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُرَدِّدُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ.))

"اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں' اس سے مراد گانا ہے۔ آپ نے اس بات کو تین مرتبہ دہرایا" (تفسیر ابن کثیر ۴۸۶/۳)

یہی تفسیر سیدنا عبداللہ بن عباس' جابر' عکرمہ رضی اللہ عنہم' سعید بن جبیر' مجاہد مکحول' عمرو بن شعیب اور علی بن بذیمہ رحمہم اللہ سے مروی ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ابنِ کثیر)

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا:

((نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ فِي الْغِنَاءِ وَالْمَزَامِيْرِ.))

"یہ آیت کریمہ گانے اور مزامیر کے متعلق نازل ہوئی ہے"

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ گانا بجانا اور اس کے آلات خریدنا بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے گمراہی کا باعث ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ گانے بجانے اور ان کے آلات خریدتے ہیں اور سنتے ہیں' ان پر اگر اللہ تعالیٰ کا قرآن پڑھا جائے تو وہ اس سے اعراض کرتے اور منہ موڑتے ہیں اور ایسے

کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن انہوں نے سنا ہی نہیں۔ بعینہ یہی کیفیت اکثر آج کل گاڑیوں کے ڈرائیوروں میں پائی جاتی ہے۔ اگر انہوں نے تلاوت کی کیسٹ لگانے کے لیے کہا جائے تو طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں اور اگر گانے بجانے اور قوالی کی کیسٹ کے متعلق کہیں تو فوراً لگا لیتے ہیں۔ گویا کلام باری تعالیٰ سے چڑ اور شیطانی عمل سے محبت ہے۔ باجوں اور آلاتِ لہو و لعب کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَيَكُوْنَنَّ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَّسْتَحِلُّوْنَ الْحِرَّ وَالْحَرِيْرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ))

"ضرور میری اُمت میں ایسے لوگ ہوں گے جو عورتوں کی شرمگاہ' ریشمی کپڑے اور شراب اور باجے حلال ٹھہرائیں گے"۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری وغیرہ)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح زنا و شراب حرام ہیں اسی طرح باجے گاجے بھی حرام ہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل میں جائے بغیر بریلوی حضرات کے امام مولوی احمد رضا خان بریلوی کے ایک فتوے کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنے امام کے فتوے کو پڑھ کر ہی راہِ راست پر آ جائیں۔ احمد رضا خان کی کتاب احکام شریعت ص ۶۰ حصہ اوّل پر ایک سائل کا سوال یوں درج ہے:

کہ آج میں جس وقت آپ سے رخصت ہوا اور واسطے نماز مغرب کے مسجد میں گیا' بعد نماز مغرب میرے ایک دوست نے کہا کہ چلو ایک جگہ عرس ہے' میں چلا گیا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں۔ بہت سے لوگ جمع ہیں اور قوالی اس طریقے سے ہو رہی ہے کہ ایک ڈھول دو سارنگی بج رہی ہیں اور چند قوال پیران پیر دستگیر کی شان میں اشعار کہہ رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی نعت کے اشعار اور اولیاء اللہ کی شان مین اشعار گا رہے ہین اور ڈھول سارنگیاں بج رہی ہیں۔ یہ باجے شریعت میں قطعی حرام ہیں کیا اس فعل سے رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ خوش ہوتے ہوں گے؟ اور

یہ حاضرین جلسہ گناہگار ہوئے یا نہیں اور ایسی قوالی جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو کس طرح؟

احمد رضا خان اس سائل کا جواب یوں تحریر کرتے ہیں :

الجواب : ایسی قوالی حرام ہے۔ حاضرین سب گناہگار ہیں اور ان سب کا گناہ ایسا عرس کرنے والوں اور قوالوں پر ہے اور قوالوں کا بھی گناہ اس عرس کرنے والے پر' بغیر اس کے کہ عرس کر نے والے کے ماتھے قوالوں کا گناہ جانے سے قوالوں پر گناہ کی کچھ کمی آئے یا اس کے اور قوالوں کے ذمہ حاضرین کا وبال پڑنے سے حاضرین کے گناہ میں کچھ کمی تخفیف ہو نہیں بلکہ حاضری میں ہر ایک پر اپنا پورا گناہ اور قوالوں پر اپنا گناہ الگ اور سب حاضرین کے برابر جدا اور ایسا عرس کرنے والے پر اپنا گناہ الگ اور قوالوں کے برابر جدا اور سب حاضرین کے برابر علیحدہ۔ وجہ یہ کہ حاضرین کو عرس کرنے والے نے بلایا ان کے لیے اس گناہ کا سامان پھیلایا اور قوالوں نے انہیں سنایا۔ اگر وہ سامان نہ کرتا' یہ ڈھول سارنگی نہ سناتے تو حاضرین اس گناہ میں کیوں پڑتے۔ اس لیے ان سب کا گناہ ان دونوں پر ہوا۔ پھر قوالوں کے اس گناہ کا باعث وہ عرس کرنے والا ہوا۔ وہ نہ کرتا نہ بلاتا تو یہ کیونکر آتے بجاتے۔ لہٰذا قوالوں کا بھی گناہ اس بلانے والے پر ہوا۔

اس کے بعد آگے ص ۶۴' ۶۵ پر رقمطراز ہیں :

سید الاولیاء شریف میں ہے ایک آدمی نے سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان ایام میں بعض آستانہ دار درویشوں نے ایسے مجمع میں جہاں چنگ و رباب اور دیگر مزامیر تھے رقص کیا' فرمایا انہوں نے اچھا کام نہیں کیا۔ جو چیز شرع میں ناجائز ہے' ناپسندیدہ ہے' اس کے بعد ایک نے کہا جب یہ جماعت اس مقام سے باہر آئی لوگوں نے ان سے کہا' تم نے یہ کیا کیا۔ وہاں تو مزامیر تھے۔ تم نے سماع کس طرح سنا اور رقص کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس طرح سماع میں مستغرق تھے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ یہاں مزامیر ہیں یا نہیں۔ سلطان المشائخ نے فرمایا یہ

جواب کچھ نہیں۔ اس طرح تو تمام گناہوں کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔

مسلمانو! کیسا صاف ارشاد ہے کہ مزامیر ناجائز ہیں اور اس عذر کا کہ ہمیں استغراق کے باعث مزامیر کی خبر نہ ہوئی' کیا مسکت جواب عطا فرمایا کہ ایسا حیلہ ہر گناہ میں چل سکتا ہے۔ شراب پئے اور کہہ دے شدت استغراق کے باعث ہمیں خبر نہ ہوئی کہ شراب ہے یا پانی' زنا کرے اور کہہ دے کہ غلبہ حال کے سبب ہمیں تمیز نہ ہوئی کہ جرو ا ہے یا بیگانی۔

مولوی احمد رضا خان کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ قوالی سننا' سنانا' عرسوں اور میلوں پر اس کا انعقاد کروانا حرام و ناجائز ہے۔ کیونکہ اس میں گانے بجانے کے آلات ڈھول سارنگی' ستار وغیرہ بجائے جاتے ہیں جن کی شریعت اسلامیہ میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

ہاں اگر ایسے اشعار ہوں جو کتاب و سنت کے مطابق ہوں اور مذکورہ خرابیوں سے پاک ہوں تو انہیں پڑھنا جائز و درست ہے جیسا کہ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشعار کہا کرتے تھے۔ باقی رہا اہل قبور کے لئے نذر و منت کی پکائی ہوئی دیگیں یا مردوں پر چڑھائے ہوئے چڑھاوے تو یاد رہے کہ سنن ابو داؤد میں حدیث ہے:

((عَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاكِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ كَانَ نَذْرُ رَجُلٍ أَنْ يَّنْحَرَ إِبِلًا بِبُوَّانَةَ فَسَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ هَلْ كَانَ فِيْهَا وَثَنٌ مِّنْ أَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ؟ قَالُوا لَا قَالَ فَهَلْ كَانَ فِيْهَا عِيْدٌ مِّنْ أَعْيَادِهِمْ؟ قَالُوا لَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْفِ بِنَذْرِكَ فَإِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا فِيْمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ))

"ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں' ایک شخص نے (زمانہ جاہلیت میں) نذر مانی تھی کہ بوانہ مقام میں اونٹ ذبح کروں گا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا' آپ

نے فرمایا کیا وہاں جاہلیت میں کسی بت کی پرستش ہوتی تھی؟ لوگوں نے جواب دیا نہیں۔ آپ نے پھر فرمایا کیا وہاں کوئی تہوار یا میلہ لگتا تھا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا اپنی نذر پوری کر۔ بلاشبہ جو نذر اللہ جل و علا کی نافرمانی میں ہو' وہ پوری نہیں کی جائے گی اور نہ اس نذر کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے جو اس کی وسعت سے باہر ہے"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نذر و نیاز اللہ کے نام کی دینی چاہیے۔ دوسری بات کہ کسی ایسی جگہ پر اللہ کے نام کی نذر پورا کرنا جائز نہیں جہاں کسی صنم کی پوجا کی جاتی رہی ہو اگرچہ وہ اب باقی نہ رہا ہوں"۔

اسی طرح وہاں بھی اللہ کے نام کی نذر پوری نہیں کی جائے گی جہاں اہل کفرو شرک کا کوئی میلہ یا تہوار منایا جاتا ہو۔ لہٰذا ایسے مقامات جہاں عرس و میلے لگائے جاتے ہیں۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کے نام کی نذر و نیاز دینا یا کھانا بھی درست نہیں ہے۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب (مجلۃ الدعوۃ' اگست / ۱۹۹۶ء)

عورت کا خوبصورتی کے لیے چہرے کے بال اُکھیڑنا

س: کیا عورت خوبصورتی کے لیے اپنے چہرے کے بال اکھاڑ سکتی ہے؟ قرآن و حدیث کی رو سے واضح فرمائیں۔ (عبداللہ' راولپنڈی)

ج: کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے چہرے کے بال اکھاڑے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خلق کو بدلنا ہے اور شیطانی عمل ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے ایسا کام کرنے والی عورت پر لعنت فرمائی جیسا کہ صحیح بخاری میں حدیث ہے:

((عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ فَبَلَغَ ذٰلِكَ امْرَاَةً مِنْ بَنِيْ اَسَدٍ يُقَالُ لَهَا اُمُّ يَعْقُوْبَ فَجَاءَتْ فَقَالَتْ اِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِيْ اَنَّكَ لَعَنْتَ كَيْتَ وَكَيْتَ؟ فَقَالَ مَا لِيَ لَا اَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ هُوَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَقَالَتْ

لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ اللَّوْحَيْنِ مَا وَجَدْتُّ فِيهِ مَا تَقُوْلُ فَقَالَ لَئِنْ قَرَأْتِيهِ لَوَجَدْتِّيهِ۔ أَمَا قَرَأْتِ ﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ قَالَتْ بَلٰى قَالَ : فَإِنَّهُ قَدْ نَهٰى عَنْهُ قَالَتْ فَإِنِّيْ أَرٰى أَهْلَكَ يَفْعَلُوْنَهُ۔ قَالَ فَاذْهَبِيْ فَانْظُرِيْ فَذَهَبَتْ فَنَظَرَتْ فَلَمْ تَرَ مِنْ حَاجَتِهَا شَيْئًا فَقَالَ لَوْ كَانَتْ كَذٰلِكَ مَا جَامَعْتُهَا))

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے گودنے والی اور گدوانے والی اور چہرے کے بال اکھیڑنے والی' خوبصورتی کے لئے دانتوں پر سوہن کرنے والی' اللہ کی تخلیق میں تغیر کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ بنو اسد کی اُم یعقوب نامی عورت کو یہ بات پہنچی تو وہ آئی اور کہا : مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ نے اس طرح لعنت کی ہے؟ تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا' میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو اور وہ کتاب اللہ میں بھی موجود ہو۔ اُس نے کہا میں نے پورا قرآن پڑھا ہے مگر اس میں یہ چیز مجھے نہیں ملی۔ تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو تمہیں یہ بات مل جاتی۔ کیا تو نے یہ نہیں پڑھا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز تمہیں دیں' وہ لے لو اور جس سے منع کریں' اس سے باز آ جاؤ تو اُس نے کہا' کیوں نہیں؟ تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام سے روکا ہے تو اس عورت نے کہا تمہاری بیوی میں بھی یہ بات موجود ہے انہوں نے کہا جاؤ اور دیکھو۔ وہ گئی اور اسے ان کی بیوی میں ایسی کوئی بات نظر نہ آئی پھر واپس آئی تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر اس میں ایسا عمل موجود ہوتا تو میں اس کے ساتھ مجامعت نہ کرتا"۔

(شرح السنة للبغوی و بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ حشر ۸/ ۴۷۳ و کتاب اللباس مسلم کتاب اللباس)

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے چہرے کے بال اُکھیڑے یا دیگر فیشن وغیرہ کے لیے دانت رگڑ کر خوبصورت

کرے چہرے اور باقی جسم پر نیل وغیرہ بھر کر پھول بنائے۔ کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ نے ایسے فعل پر لعنت کی ہے اور جس فعل پر لعنت مرتب ہوتی ہو وہ حرام ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسا عمل اپنانا بالکل ناجائز و حرام ہے۔ (مجلۃ الدعوۃ' مارچ / ١٩٩٦ء)

کتاب

الْجَامِع

حدیثِ معاذ رضی اللہ عنہ کی تحقیق

س سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث جس میں ان کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا گیا اور ان کو کہا گیا کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آجائے تو کیا کرو گے تو انہوں نے کہا کہ پہلے کتاب اللہ میں دیکھوں گا اس کے بعد سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور اگر وہاں نہ ملے تو خود فیصلہ کروں گا۔ یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف اور کس کتاب میں ہے؟ وضاحت سے لکھیں۔ (ماسٹر ارشد' محمد مطلوب اعوان' اٹک)

ج سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے یہ روایت سنن ابی داؤد کتاب القضاء باب اجتھاد الرای فی القضاء (۳۵۹۲) ۱۸/۴ میں اور جامع ترمذی کتاب الاحکام باب ما جاء فی القاضی کیف یقضی (۱۳۲۸) ۶۱۶/۳ میں مروی ہے۔ ابوداؤد میں بایں سند مروی ہے کہ:

((حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ اَبِی عَوْنٍ عَنِ الْحَارِثِ بْنِ عُمَرَ بْنِ اَخِی الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ عَنْ اُنَاسٍ مِنْ اَهْلِ حِمْصَ مِنْ اَصْحَابِ مُعَاذٍ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَادَ اَنْ يَّبْعَثَ مُعَاذًا اِلَى الْيَمَنِ قَالَ كَيْفَ تَقْضِی اِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ؟ قَالَ اَقْضِی بِكِتَابِ اللّٰهِ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِی كِتَابِ اللّٰهِ؟ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِی سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا فِی كِتَابِ اللّٰهِ؟ قَالَ اَجْتَهِدُ بِرَاْيِی وَلَا اٰلُو فَضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَدْرَهٗ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا يَرْضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.))

"معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیا تو کہا اے معاذ جب تیرے پاس کوئی معاملہ آئے تو کیسے فیصلہ

کرے گا تو انہوں نے کہا میں کتاب اللہ کے ذریعے فیصلہ کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تو کتاب اللہ میں نہ پائے تو انہوں نے کہا سنت رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں نہ پائے تو؟ انہوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہیں کروں گا تو اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جس کے ذریعے وہ رسول اللہ ﷺ کو راضی کرتا ہے"

یہ روایت انتہائی ضعیف ہے اور اس کے ضعف کے اسباب درج ذیل ہیں:
(ا) اس کی سند میں ابو عون محمد عبداللہ الثقفی حارث بن عمرو سے روایت بیان کرنے میں متفرد ہے۔ (۲) دوسرا راوی حارث بن عمرو مجہول ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے تقریب ۲۰ پر لکھا ہے کہ مجهول من السادسة (۳) اس روایت میں تیسری کمزوری یہ ہے کہ اس کی سند میں سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے اصحابِ معاذ رضی اللہ عنہ غیر معروف ہیں پتہ نہیں وہ کون ہیں؟

لہٰذا مندرجہ بالا تین اسباب کی وجہ سے حدیث معاذ رضی اللہ عنہ ضعیف ہے۔

(مجلۃ الدعوۃ' ستمبر / سنہ ۱۹۹۲ء)

"نصب" کا معنی آستانے

س: کتاب "آسمانی جنت اور درباری جہنم" پڑھی۔ اللہ تعالیٰ نے شرک و بدعت سے توبہ کی توفیق عنایت فرمائی۔ آپ سے ایک سوال دریافت کرنا ہے کتاب میں سورۂ مائدہ کی آیت ۹ میں ﴿ انصاب ﴾ کا معنی "آستانے" کیا ہے اور جس قدر تراجم میں نے دیکھے ہیں ان میں اس کا معنی بت لکھا ہوا ہے۔ اس کی وضاحت مطلوب ہے۔ (ایک سائل)

ج: انصاب عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا واحد نصب اور لغت میں اس سے مراد وہ تمام مقامات ہیں جو لوگوں نے غیر اللہ کی پرستش کے لیے مخصوص

کیے ہوئے ہیں۔ عربی لغت کی معتبر کتاب القاموس المحیط ۱/۱۳۷ میں لکھا ہے :

كُلُّ مَا جُعِلَ عَلَمًا كَالنَّصِيْبَةِ وَكُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى

"وہ جس کو عَلَمْ جیسے کہ نصیبہ ہے اور ہر وہ چیز جس کی اللہ تعالی کے سوا عبادت کی جائے اس کو نصب کہتے ہیں"

نصب کا یہی معنی محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الرازی نے مختار الصحاح ص ۶۶۱ اور المعجم الوسیط میں ص ۹۲۵ پر مذکور ہے اور اردو تراجم میں مولانا مودودی صاحب نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد ۱' ص ۵۰۱ اور ص ۱/۴۴۱ پر کیے ہیں بلکہ ۱/۴۴۱ پر حاشیہ ۱۲ میں رقمطراز ہیں : اصل میں لفظ "نصب" استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی مورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا معنی لفظ آستانہ یا استھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔

اور یہ معنی لغت کے اعتبار سے درست ہے اور كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں داخل ہے کیونکہ موجودہ دور میں تمام آستانوں پر غیر اللہ سے فریاد رسی' سجدہ ریزی اور نذر و نیاز چڑھاوے وغیرہ چڑھائے جاتے ہیں جو کام اللہ کے لیے مختص ہیں وہ بزرگوں کے آستانوں سے وابستہ کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا نصب یا ﴿ انصاب ﴾ کا معنی آستانے کرنا درست ہے غلط نہیں۔

توبہ کے بعد چوری کا مال نامعلوم مالکوں تک پہنچانے کا مسئلہ

س ایک شخص بہت زیادہ چوری کرتا تھا۔ کئی لوگوں کا چارہ کاٹا اور کئی لوگوں کا پانی وغیرہ بھی توڑا' بہت سے دوکانداروں سے چیزیں لے کر ان کی قیمت بھی ادا نہ کی اس کے علاوہ کئی لوگوں کا مال ناحق غصب کیا۔ اب وہ توبہ کر چکا ہے کیا ایسے شخص پر کوئی کفارہ ہے؟ اگر اس کے پاس کچھ مال بھی ہے اور جن کی چوری ہوئی ہے' ان کا علم بھی نہیں' مالک تک پہنچنا ناممکن ہے تو اسے کہاں صرف کرے۔

(مُبشر احمد' مظفر آباد / محمد ندیم)

ج قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بندے کے لیے توبہ کا دروازہ مسلسل کھلا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ فرمایا :

﴿ قُلْ يَاعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾

(الزمر : ۵۳)

"(اے نبی ﷺ) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے' اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بے شک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا :

((مَنْ تَابَ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ.))

"جس نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے توبہ کرلی' اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے" (رواہ مسلم)

دوسری حدیث میں ہے :

((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ.))

"اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک اس کی روح حلقوم تک نہیں پہنچ جاتی" (الترمذی وقال حسن)

ان دلائل سے یہ واضح ہو گیا کہ توبہ کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہے ایسا شخص اگر صدق دل سے توبہ کر لے اور حق داروں کو ان کا حق پہنچانا اس کے لیے ممکن نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے گا کیونکہ یہ اس کی طاقت میں ہی نہیں لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا "اللہ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا" اس کے علاوہ اس کی دلیل بخاری شریف کی حدیث بھی ہے :

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے سو قتل کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے حقوق

العباد کے اتنے بڑے جرم کو صرف توبہ صادقہ کی وجہ سے معاف کر دیا ہے تو ایسا شخص جس کا جرم اس سے کم ہے' اللہ تعالیٰ اس کی بھی توبہ قبول کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہئے۔ ایسے شخص کو دُنیا میں زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر لینی چاہئیں۔ خصوصاً صدقہ زیادہ کرنا چاہیے تاکہ گزشتہ گناہوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو جائے۔ واللہ اعلم (مجلۃ الدعوۃ' اپریل / ۱۹۹۵ء)

مذہبی جلسوں میں مروجہ نعرہ بازی

س یہ جو آج کل اکثر مذہبی جلسوں میں نعرہ بازی ہوتی ہے' کیسا عمل ہے' جیسا کہ جیوے جیوے فلاں جیوے' فلاں زندہ باد وغیرہ؟ (ایک سائل' لاہور)

ج نبی اکرم ﷺ جب وعظ و نصیحت فرماتے تو اس میں اللہ تعالیٰ کے کلام کو بیان کرتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم توجہ سے سماعت فرماتے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کو توجہ سے سننے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴾

(الاعراف)

"جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

اس آیت کریمہ کی رو سے قرآن مجید کے بیان کے وقت خاموشی کا حکم ہے اور دوران وعظ نعرہ بازی کرنا' یہ شور و غل ہے جو ادب قرآن کے منافی ہے اور اللہ کے نبی ﷺ کی کسی بھی حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ آپ کے وعظ کے دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس طرح نعرے بازی کرتے ہوں۔ لہٰذا ہمیں ان امور سے اجتناب کرنا چاہئے۔ (مجلۃ الدعوۃ' مارچ / ۱۹۹۶ء)

ایک نماز کے بدلے اُنچاس کروڑ نماز کا ثواب

س بعض تبلیغی حضرات کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اس راستے میں ایک نماز کا ثواب اُنچاس کروڑ کے برابر ہے۔ کیا ازروئے شریعت اُنچاس کروڑ کا ثواب

ثابت ہے یا محض ایک بات ہے؟ وضاحت کریں (ایک سائل)

ج اُمور دینیہ کی تبلیغ و اشاعت یا تحصیل دین نماز و روزہ وغیرہ کے لیے ایسی کوئی صحیح و صریح حدیث نہیں ملتی جس میں یہ بات مذکور ہو کہ ایک نماز یا ایک تسبیح کا ثواب اُنچاس کروڑ کے برابر ہے۔ تبلیغی حضرات نے اس بات کی بنیاد ضعیف روایات پر رکھی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے' نبی ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَرْسَلَ بِنَفَقَةٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَقَامَ فِي بَيْتِهٖ فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُمِائَةِ دِرْهَمٍ وَمَنْ غَزَا بِنَفْسِهٖ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَنْفَقَهٗ فِي وَجْهِهٖ ذٰلِكَ فِيْهِ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُمِائَةِ اَلْفِ دِرْهَمٍ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ.))

"جس نے اللہ کی راہ میں خرچہ بھیج دیا اور خود گھر میں ٹھہرا رہا' اس کے لیے ہر درہم کے بدلے میں سات سو درہم ہیں اور جو بذات خود اللہ کی راہ میں نکل کر لڑا اور اپنے اوپر اس مال کو خرچ کیا' اس کے لیے ہر درہم کے معاوضے میں سات لاکھ درہم کا ثواب ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے' بڑھا دیتا ہے" (ابنِ ماجہ ۲۷۶۱' ترغیب و ترہیب ۲/۲۵۳)

اور دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الصَّلٰوةَ وَالصِّيَامَ وَالذِّكْرَ يُضَاعَفُ عَلَى النَّفَقَةِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ بِسَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ))

"یقیناً نماز' روزہ اور ذکر اللہ کی راہ میں روپیہ خرچ کرنے سے سات سو گنا ملتا ہے" (الترغیب ۲/۲۶۷)

سبز پگڑیوں والے دعوتِ اسلامی والے بھی ان ہی ضعیف روایتوں کی بنا پر دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی جماعت کے ساتھ نکلنے والے اور وقت لگانے والے کو ایک نماز کے بدلے انچاس کروڑ نماز کا ثواب ملے گا۔ یہ عقیدہ انہوں نے شاید تبلیغی جماعت سے ہی متاثر ہو کر اپنایا ہے۔

اس طرح سات لاکھ کو سات سو میں ضرب دینے سے انچاس کروڑ بن جاتے ہیں لیکن یہ دونوں روایات سنداً ضعیف اور ناقابل حجت ہیں۔ پہلی روایت میں خلیل بن عبداللہ راوی مجہول ہے۔ لسان المیزان ۲/۴۱۰ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ روایت منکر ہے۔ تہذیب التہذیب ۴/۱۶۷ امام منذری نے بھی ترغیب و ترہیب میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی عدالت و جرح کے بارے میں مجھے علم نہیں۔

دوسری روایت میں دو ضعیف راوی ہیں۔

۱) زبان بن فائد امام ساجی اور امام احمد نے اس کی روایات کو منکر کہا ہے۔ امام یحییٰ ابنِ معین نے اسے ضعیف اور ابنِ حبان نے منکر الحدیث اور ناقابل حجت قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب ۳/۳۰۸)

۲) دوسرا راوی سہل بن معاذ ہے امام یحییٰ بن معین نے اسے ضعیف کہا۔ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی روایت کو ناقابل اعتبار اور ضعیف قرار دیا۔

(تہذیب ۴/۲۵۸)

لہٰذا جب یہ دونوں روایات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں تو ان سے استدلال کرنا بے کار ہے۔ ثانیاً اگر یہ روایات بالفرض صحیح بھی ہوں' تو تبلیغی جماعت کے لیے یہ ثواب نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے مجاہدین کے لیے ہو گا۔ اس روایت کے لفظ ((مَنْ غَزَا بِنَفْسِهٖ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ''جو بذات خود اللہ کی راہ میں نکل کر لڑا) اس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ تبلیغی جماعت اور اس نوع کی دوسری جماعتیں تو قِتَالٌ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ کو تسلیم ہی نہیں کرتیں لہٰذا وہ اس ثواب سے محروم ہیں۔

(مجلۃ الدعوۃ' مارچ / ۱۹۹۶ء)
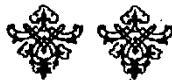
تخریج و تحقیق کے ساتھ

ایک نئے انداز میں

تفسیر ابن کثیر

۵ جلدوں پر مشتمل

دو رنگہ طباعت

از قلم: امام حافظ ابو الفداء عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ

مترجم: مولانا محمد جوناگڑھی رحمہ اللہ

- قرآن کریم کا انتہائی خوبصورت متن
- کتاب کی خوبصورتی کے لئے قرآن کریم کا متن ہر صفحے کے اوپر دیا گیا ہے۔
- مضمون کے مطابق عنوان بندی اور پیراگرافی کا اہتمام
- آیات اور احادیث کی تخریج کیساتھ احادیث پر صحت اور ضُعف کا حکم لگا دیا گیا ہے۔
- آیات، عنوانات اور حوالہ جات نمایاں کرنے کیلئے سرخ رنگ میں دیئے گئے ہیں۔
- ۴۰۰ سے زائد صفحات کے اضافے کے باوجود مکتبہ قدوسیہ کی روایت کے مطابق قیمت نہایت مناسب

مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور

Ph: 7351124 - 7230585

Email: qadusia@brain.net.pk